تفسیر موضوعی

جلد دہم

زیرِ نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

پیامِ قرآن

قرآن مجید میں اسلامی حکومت

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

حجۃ الاسلام مولانا شیخ افتخار حسین جعفری

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب ـــــــــــــــــــــــــــــ تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن

جلد ـــــــــــــــــــــــــــــ دہم

مؤلف ـــــــــــــــــــــــــــــ آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ـــــــــــــــــــــــــــــ حجۃ الاسلام مولانا شیخ افتخار حسین جعفری

نظر ثانی ـــــــــــــــــــــــــــــ حجۃ الاسلام ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

سیٹنگ و گرافکس ـــــــــــــــــــــــــــــ قلب علی سیال

سال اشاعت ـــــــــــــــــــــــــــــ 2013ء

ناشر ـــــــــــــــــــــــــــــ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ (پیامِ قرآن جلد 8،9،10) ـــــــــــ 1000 روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulquorantrust.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دورِ حاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہو تو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جو عموماً صدرِ اوّل سے لے کر آج تک لکھی جا رہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتابِ الٰہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔۱۔تفسیرِ مفرداتی ۲۔تفسیرِ ترتیبی ۳۔تفسیرِ موضوعی ۴۔تفسیرِ ارتباطی ۵۔تفسیرِ کلی۔

تفسیر کے پہلے دو طریقے عام طور پر متعارف ہیں۔بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیاتِ قرآنی کو ایک مقام پر لا کر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کر دی گئی ہے، لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیرِ موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظر عام پر آ چکا ہے۔تفسیر موضوعی کا زیرِ نظر سلسلہ (پیام قرآن) جو کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعیٔ جمیل کا نتیجہ ہے، اس کی سات جلدیں پہلے سے قارئین کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔جلد ہشتم تا دہم قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''پیامِ قرآن جلد دہم'' کا اردو ترجمہ ادارہ ہذا کے تعاون سے حجۃ الاسلام مولانا شیخ افتخار حسین جعفری نے کیا ہے۔ادارہ مولانا موصوف کا اس سعیٔ جمیل پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہے۔بلاشبہ مولانا موصوف اگر ادارہ ہذا کے ساتھ طے شدہ ضوابط کے تحت تکمیلِ معاہدہ فرماتے تو زیرِ نظر کتاب 8 ماہ قبل قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوتی، لیکن غفلت کی ستم ظریفی!۔۔۔ کتاب ہذا کی تکمیل میں 6 ماہ کی بجائے 15 ماہ کا طویل عرصہ لگا دیا گیا۔

اس وقت تفسیر موضوعی (پیام قرآن) کی جلد نمبر 10 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

فہرست مضامین

پیش لفظ

موضوعی تفسیر کیا ہے؟ اور کن مشکلات کو حل کرتی ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب موجودہ کتاب جیسی کتابوں کو صحیح مضمون میں سمجھنے میں گہرا اثر رکھتا ہے۔ جب تک ان دو سوالوں کا جواب واضح نہیں ہوتا، اس وقت ہم اس قسم کی کتابوں کے مقصد کو نہیں سمجھ سکتے۔

پہلے سوال کے جواب میں ہم یاد دہانی کراتے ہیں کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے جو ۲۳ سال کے لمبے عرصے میں مختلف معاشرتی حالات اور تقاضوں اور گونا گوں واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے نازل ہوئی ہے اور اسلامی معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس (کی تعلیمات میں) میں بھی پیشرفت ہوتی رہی ہے۔

جن سورتوں کی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، وہ زیادہ تر توحید و معاد پر ایمان و اعتقاد کو محکم کرنے خصوصاً شرک اور بت پرستی کے خلاف شدید جدو جہد کی عکاسی کرتی ہیں جبکہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی آیات قدرتی طور پر اسلامی حکومت کے تشکیل پانے کے بعد نازل ہوئی ہیں، لہذا معاشرتی، عبادی، سیاسی احکام اور بیت المال کی تشکیل اور اسلام کے قضائی نظام کی طرف ناظر ہیں اور پھر منافقین وغیرہ کے ساتھ جنگ و صلح پر مبنی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں کہ جن میں اس وقت اسلام مبتلا تھا۔

واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ایک رسالۂ عملیہ (توضیح المسائل) یا قدیم نصابی اور درسی کتاب کی شکل میں پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ آیات مختلف مناسبتوں، تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق نازل ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد، جنگی احکامات، عہدناموں، اسیروں، جنگی تاوانوں وغیرہ سے متعلق احکام ہر غزوہ کی مناسبت سے پراکندہ صورت میں نازل ہوئے ہیں یہ بالکل ایک ماہر طبیب کے نسخے کی طرح ہیں کہ جو ہر روز بیمار کے حال کے مطابق نسخہ لکھتا ہے اور اسے مکمل صحت عطا کرتا ہے۔

اب اگر ہم قرآنی آیات کی نازل شدہ سورتوں میں ہر سورت میں آیات کے مطابق، ترتیب کے ساتھ تفسیر کریں تو یہ ''ترتیبی تفسیر'' ہوگی اور اگر ایک ''موضوع'' سے متعلق آیات پورے قرآن سے جمع کر کے ایک ساتھ رکھیں اور پھر ان کی فصل بندی کر کے تفسیر کریں تو یہ ''موضوعی تفسیر'' ہوگی۔

مثلاً جب بھی جہاد سے متعلق تمام آیات کہ جو دس سال کے دوران، مدنی سوروں میں نازل ہوئی ہیں یا اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے متعلق آیات جو ۲۳ رسال کے دوران پورے قرآن میں نازل ہوئی ہیں، ایک ساتھ رکھی جائیں اور پھر ان کی ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی بنا پر تفسیر کی جائے تو یہ موضوعی تفسیر کہلائے گی۔

دونوں قسم کی تفسیر کی اپنی اپنی خصوصیات اور اثرات میں کہ جو ہمیں ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں کرتیں اور ''ہر چیز اپنی جگہ پر اچھی ہوتی ہے'' کے مصداق دونوں قسم کی تفسیریں قرآن کے محققین کے لئے ضروری ہیں (البتہ پہلے ترتیبی

تفسیر ہے اور پھر موضوعی تفسیر)۔

ترتیبی تفسیر کی خصوصیات

اس طرح کی تفسیر میں آیات کے نازل ہونے کے زمان ومکان، پہلے اور بعد میں آنے والی آیات اور داخلی اور بیرونی قرائن کے لحاظ ہر آیت کا مقام واضح ہوجاتا ہے، اس کے بغیر آیت کا صحیح معنی سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں ترتیبی تفسیر ہر آیت کواس کے اپنے مقام پر دیکھتی ہے اور اسلامی معاشرے کی روح کے ساتھ اس کے تعلق اور اس کی پیشرفت وتکامل کو مدنظر رکھتی ہے اور اس تعلق سے بہت سے مسائل واضح ہوجاتے ہیں۔

جبکہ موضوعی تفسیر میں آیات عینی اور جزئی واقعات کی شکل سے نکل کر ایک مجموعی وکلی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے مقام سے کسی حد تک دور ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس موضوعی تفسیر کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

موضوعی تفسیر کی خصوصیات

ا۔ ایک ہی موضوع کی مختلف آیات میں پیش ہونے والے گونا گوں پہلوؤں کوایک ساتھ قرار دیتے ہوئے تمام موضوعات کو جامع انداز میں چند پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے جس سے قدرتی طور پر جدید حقائق سامنے آتے ہیں۔

۲۔ قرآن کی بعض آیات میں پہلی نظر میں (انسان کو) ابہامات نظر آتے ہیں لیکن ''القرآنُ یفسر بعضہ بعضاً'' (قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں) کے اصول کے مطابق یہ ابہامات (موضوعی تفسیر) کی وجہ سے دور ہوجاتے ہیں۔

۳۔ موضوعی تفسیر بطور کلی ہر مسئلے اور ہر موضوع کے بارے میں اسلامی نظریہ کائنات کو واضح کردیتی ہے۔

۴۔ قرآن کے بہت سے چھپے ہوئے اسرار کو فقط موضوعی تفسیر کی روش پر ہی واضح کیا جاسکتا ہے اور انسانی استعداد کی حد تک آیات کی گہرائیوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔

بنابرایں گہری سوچ اور آگاہی رکھنے والا کوئی بھی مسلمان اس دونوں قسم کی تفاسیر سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اگر چہ زمانۂ قدیم حتیٰ ائمہ ہدیٰؑ کے زمانے سے موضوعی تفسیر کی طرف توجہ دی جاتی رہی ہے اور علمائے اسلام نے اس سلسلے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جس کی واضح مثال ''آیات الاحکام'' کے نام سے لکھی جانے والی کتابیں ہیں، لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ موضوعی تفسیر میں جس طرح ترقی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی اور ابھی تک یہ اپنے ابتدائی مراحل طے کررہی ہے۔ لہٰذا علمائے کرام کی زحمات کے نتیجے میں اسے اپنے حقیقی مقام تک پہنچنا چاہیے۔

اس کتاب ''پیام قرآن'' میں کاملاً ایک جدید روش کے مطابق قرآن کی موضوعی تفسیر کے موضوع پر جدید قدم اٹھائے گئے ہیں اور الحمدللہ اس کا بہت زیادہ استقبال ہوا ہے اور ہر روز معاشرے کے مختلف طبقات کی طرف سے اسے پذیرائی مل رہی ہے پھر بھی یہ کام

ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے اور اسے علمائے اسلام اور مفسرین عالی مقام کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور تعاون کی ضرورت ہے تا کہ یہ اپنے انتہائی مقصد تک پہنچ سکے۔ ہم ہمیشہ اہل نظر اور ارباب معرفت سے اس کام کو مکمل کرنے والے نظریات و آراء کی توقع رکھتے ہیں۔

ہم اس کام میں خداوند بزرگ و برتر سے زیادہ سے زیادہ توفیق و ہدایت طلب کرتے ہیں!

حجج الاسلام عالی جناب محمد رضا آشتیانی، محمد جعفر امامی، عبدالرسول حسنی، محمد اسدی، حسین طوسی، سید شمس الدین روحانی اور محمد محمدی کے تعاون سے!

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم

☆☆☆☆

حکومت اور امامت کا باہمی تعلق

پیام قرآن کی سابقہ جلد یعنی جلد نہم میں قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے امامت اور ولایت کے بارے میں گفتگو تھی اور چونکہ مسئلہ امامت اور مسئلہ حکومت ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک نظر سے روح امامت وولایت' نفوس وابدان پر حکومت' صراط مستقیم کی طرف ان کی راہنمائی اور کمال وسعادت کے راستے پر انھیں گامزن کرنا ہی ہے۔ اسی وجہ سے بحث امامت کے بعد حکومت اسلامی کی بحث اور اس کا درست تجزیہ وتحلیل ضروری تھا، چونکہ کہ اس کے بغیر امامت وولایت کی بحث مکمل نہیں ہوتی۔

کیا ہم حضرت مہدی = کی ایک اہم خصوصیت اُن کی طرف سے عدل پر مبنی ایک عالمی حکومت کا قائم کرنا قرار نہیں دیتے؟ یعنی وہی چیز جس کے رسول اکرمؐ اور دیگر ائمہ معصومین ÷ خواہاں تھے، لیکن زمان ومکان کے مخصوص حالات نے انھیں اس تک رسائی کی اجازت نہ دی، اگرچہ اس مقصد کے لئے ضروری مقدمات واسباب فراہم کردیئے گئے اور اس کی بنیادیں رکھ دیں گئیں، جی ہاں! سبھی عدل پر مبنی حکومت الٰہی کے طلبگار تھے۔

ایسی حالت میں حکومت کی بحث کو بحث امامت سے کیسے جدا کیا جا سکتا ہے؟ اس سے قطع نظر رسول اکرمؐ نے ابتدائی کامیابیوں کے بعد جو پہلا کام کیا وہ حکومت اسلامی کی تشکیل ہی تھا، اور اسے نہ صرف اسلام کے اہم ارکان میں سے ایک بلکہ تمام قوانین کے نفاذ کا ضامن سمجھا جاتا تھا۔ رسول اکرمؐ کے برحق جانشین ہوں یا مسند خلافت پر متمکن ہونے والے ناحق جانشیں ہوں، سب اپنے آپ کو حکومت اسلامی کی تشکیل یا اسے جاری رکھنے کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔

کوفہ کے لوگوں نے حضرت امام حسین ؑ کو حکومت اسلامی کی تشکیل اور غاصبوں کے خلاف جنگ کے لئے کوفہ آنے کی دعوت دی تھی، اگر امام عالی مقامؑ کو ان کی بے وفائی، عہد شکنی اور سستی کا سامنا نہ کرنا پڑتا تو عادلانہ حکومت اسلامی کا پرچم آپؑ کے دست مبارک سے لہرایا جاتا۔ ائمہ معصومینؑ کی روایات اور نہج البلاغہ کی عبارات میں بکثرت ایسی باتیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دشمنوں نے ان کا حق غصب کرلیا، یہ حق ''عدل پر مبنی اسلامی حکومت'' کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں تھا۔ ان کے علاوہ اور دیگر بے شمار دلائل وشواہد سے پتا چلتا ہے کہ مسئلہ ''امامت''، ''خلافت وحکومت'' سے کوئی جدا مسئلہ نہیں۔ ایک معروف روایت کے مطابق ''ہارون الرشید'' جو اپنے خیال میں چاہتا تھا کہ ''فدک'' امام موسیٰ کاظم ؑ کو واپس کردے، اس روایت میں ایک دلچسپ نکتہ موجود ہے جو ہمارے دعویٰ کو واضح تر کردیتا ہے۔

''فدک''، جیسا کہ معلوم ہے خیبر کے نزدیک ایک سرسبز وشاداب دیہات تھا، جسے رسول اکرمؐ نے اپنی زندگی میں اپنی بیٹی فاطمہ زہراء × کو بخش دیا تھا۔ اور آپؐ کی رحلت کے فوراً بعد ہی اسے غصب کرلیا گیا اور فدک کا غصب ہمیشہ محبان اہل بیتؑ کی نظر میں قابل اعتراض رہا، لہٰذا عمومی افکار کے دباؤ کے زیر اثر ہارون الرشید فدک کو دوبارہ اولاد فاطمہؑ کی طرف پلٹانے کے بارے میں سوچنے لگا، جس وقت اس نے امام موسیٰ کاظم ؑ کی خدمت میں عرض کیا: ''حُدَّ فَدَکاً حَتّٰی اَرُدَّھَا اِلَیْكَ'' یعنی: ''فدک کی حدود معین کریں تاکہ میں اسے آپؑ کو واپس کردوں۔'' امامؑ نے جواب دینے سے انکار کیا، ہارون مسلسل اصرار کرتا رہا، امامؑ نے فرمایا: میں اسے اس

کی صحیح حدود کے ساتھ نہیں لوں گا! ہارون نے کہا: اس کی واقعی حدود کون سی ہیں؟ امامؑ نے فرمایا: اگر میں اس کی حدود واقعی کو بیان کردوں تو تم بطور مسلم موافقت نہیں کروگے! ہارون نے کہا: آپؑ کو اپنے جد رسول اکرمؐ کی قسم اور واسطہ دیتا ہوں کہ اس کی حدود بیان کریں، (میں اسے آپؑ کے حوالے کردوں گا)۔

امامؑ نے فرمایا: اس کی پہلی حد ''عدن'' کی سرزمین ہے! جب ہارون نے یہ بات سنی تو اس کا چہرہ بگڑ گیا اور کہنے لگا: عجیب ہے عجیب!

امامؑ نے فرمایا: اور اس کی دوسری حد ''سمرقند'' ہے!

ہارون کے چہرے پر ناراضگی کے آثار اور نمایاں ہوگئے۔

امامؑ نے فرمایا: اس کی تیسری حد ''افریقہ'' ہے!

اس مقام پر ہارون کا چہرہ شدید ناراضگی کے باعث تاریک پڑ گیا اور اس نے کہا: عجیب!

امامؑ نے فرمایا: اور اس کی چوتھی حد دریائے خزر اور آرمینیا کے سواحل ہیں!

ہارون نے کہا: پس ہمارے لئے کوئی جگہ باقی نہیں بچتی، اٹھیے اور میری جگہ یعنی تخت پر بیٹھ جایئے اور لوگوں پر حکومت کیجئے! (یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ جو کچھ آپؑ نے کہا ہے یہ تو مملکت اسلامی کی سرحدیں ہیں)۔

امامؑ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر میں اس (فدک) کی واقعی حدود بیان کردوں تو ہرگز اسے واپس نہیں کروگے (جی فدک کا ایک مطلب تمام اسلامی حکومت ہے)۔ اس وقت سے ہارون نے امامؑ کو شہید کرنے کا فیصلہ کرلیا۔[۱]

یہ با معنی حدیث مسئلہ فدک اور مسئلہ خلافت میں گہرے تعلق پر دلالت کرتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ جو چیز غصب ہوئی ہے وہ رسول اکرمؐ کا مقام خلافت تھا کہ فدک کا دیہات اس کا ایک جزء شمار ہوتا تھا اور اگر ہارون فدک کو واپس کرنے کا خواہشمند تھا تو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ خلافت سے دستبردار ہوجائے اور اس چیز نے اسے اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ امام موسیٰ کاظمؑ جب بھی طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو اسے تخت سے اتار پھینکیں گے، لہٰذا اس نے حضرتؑ کے قتل کا فیصلہ کرلیا۔[۲]

خلاصہ یہ کہ مسائل امامت اور بحث حکومت اور قیادت مسلمین آپس میں شیر وشکر کی طرح مخلوط ہیں، جس میں شک وشبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔ چونکہ ان کی باہمی تعلق کے اثرات ہر جگہ نظر آتے ہیں، یہ بات آیات وروایات اور رسول اکرمؐ اور دینی پیشواؤں کی زندگی کی تاریخ اور احکام اسلام کے مزاج میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ فقہ اسلامی کے مباحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ''عبادات''، ''معاملات'' اور ''سیاسیات''۔

''سیاسیات'' جو فقہ کے اہم ابواب مثلاً جہاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، قضاوت وشہادت، حدود، دیات اور قصاص پر مشتمل

---

[۱] بحار الانوار۔ چاپ قدیم، ج۸، ص۱۰۶ (نقل از کتاب اخبار الخلفاء)

[۲] زہرا برترین بانوی جہان، ص۱۳۰

ہے، یہ ایک ایسا حصہ ہے جو حکومت کے ساتھ مربوط مسائل کے بارے میں بحث کرتا ہے، اس لئے کہ جہاد اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بعض مراحل اور اسی طرح قضاوت، شہادت، اجرائے حدود اور قصاص ایسی چیزیں ہیں جو حکومت کے بغیر نافذ العمل نہیں ہوسکتیں۔

انفال، خمس، زکات اور خراج سے متعلق زمین سے بیت المال کی بنیاد فراہم ہوتی ہیں، اس سے متعلق مسائل کے لئے بھی حکومت ضروری ہے۔ اس لحاظ سے فقہ اسلامی، سیاسی اور حکومتی مسائل کے ساتھ اس قدر مخلوط و مزوج ہے کہ ان (مسائل) کا مکمل نفاذ حکومت تشکیل دیئے بغیر ممکن نہیں۔

یہ اس بات کے واضح شواہد اور دلائل ہیں کہ اسلام، سیاست اور حکومت سے جدا نہیں اور حکومت و سیاست یعنی معاشرے کے نظام کی تدبیر اسلامی تعلیمات کے تار و پود (تانے بانے) میں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ اگر انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے تو اسلام اپنا مفہوم کھو دے گا۔ درحقیقت یہ اسلام کو اسلام سے جدا کرنے کی کوشش ہوگی جس کا محال اور ناممکن ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے۔ اس مجموعی گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم مباحث امامت و ولایت، (جس کی بحث گذشتہ جلد میں ہو چکی ہے) سے ''مسلمین کی قیادت اور حکومت'' کے مسائل تک کیوں کر پہنچے ہیں۔

لوگوں کے لئے حکومت کی ضرورت

اشارہ

امامت وحکومت کے باہمی تعلق کو ملاحظہ کرنے کے بعد ہم ایک اور اہم مسئلے یعنی انسانی معاشرے کے لئے حکومت کے ضروری ہونے کی بات کرتے ہیں۔ جہاں تک تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے تمام انسانی معاشروں میں حکومت کی کوئی نہ کوئی قسم موجود رہی ہے: قبیلہ جاتی حکومت، بادشاہوں اور سلاطین کی حکومت اور وہ حکومتیں جو آج کل رائج ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان علم ودانش کے کسی بھی مرحلے میں ہو وہ حکومت کے وجود کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اجتماعی زندگی، نظم وضبط اور قانون کی حاکمیت کے بغیر ایک دن بھی ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب بعض حکومتیں متزلزل ہوجاتی ہیں اور نئی حکومت تشکیل نہیں پاتی تو معاشرہ افراتفری کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس لحاظ سے کوئی بھی عقلمند انسان، انسانی معاشرے کے لئے حکومت کی ضرورت کے بارے میں ذرا سا شک بھی نہیں کرتا، اسی وجہ سے آیات وروایات میں اس مطلب کے بارے میں واضح بیانات اور اشارات موجود ہیں جنھیں اختصار کے ساتھ درج ذیل سطور میں بیان کیا جاتا ہے:

ا۔ بنی اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے کہ جب افراتفری اور مضبوط ولائق حکومت نہ ہونے کی وجہ سے وہ کمزوری اور پژمردگی سے دچار ہوئے اور دشمن ان پر غالب آگئے تو وہ اپنے زمانے کے نبی کے پاس آئے اور ان سے کہا: ہم پر ایک حکمران مقرر کردیں تاکہ اس کی زیر قیادت ہم دشمن کے ساتھ جنگ کریں۔ ان کے نبیؑ نے کہا: ''شاید تمھیں اگر جنگ کا حکم دیا جائے تو تم لوگ روگردانی کرو اور راہ خدا میں جنگ نہ کرو۔'' یہ سن کر انھوں نے کہا: ''یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم راہ خدا میں جہاد نہ کریں جبکہ حال یہ ہے کہ ہمیں ہمارے فرزندوں سے دور اور گھروں سے نکال دیا گیا ہے؟'' (دشمن نے ہمارے شہروں پر قبضہ اور ہماری اولاد کو قیدی بنالیا ہے)۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ [1]

اگرچہ اس آیت شریفہ میں ایک قوم کے لئے فرمانروا کی ضرورت کے ایک رخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ دشمن کے خلاف جنگ، شہروں سے اغیار کا صفایا اور دشمن سے آزادی حاصل کرنا ہے، لیکن یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے بھی یہ

---

[1] سورہ بقرہ۔ ۲۴۶۔

مطلب صادق ہے۔

قرآن اس عبارت کے ذریعے واضح کرتا ہے کہ ایک مضبوط حاکمیت کے ساتھ حکومت تشکیل دیئے بغیر آزادی، اجتماعی آرام وسکون کا حصول ممکن نہیں۔ ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ بنی اسرائیل کا مطالبہ یہاں ایک حکمران کی بجائے سپہ سالار معین کرنے کا تھا، لیکن توجہ طلب امر یہ ہے کہ ملک کے ساتھ تعبیر کرنے کا مطلب ہے تمام احوال کا سرپرست اور ذمہ دار حکمران اگرچہ اس کا بظاہر لائحہ عمل بیرونی دشمن کے خلاف جنگ کرنا ہی تھا۔ درحقیقت اس زمانے کے نبی حضرت ''اشموئیل'' کا کردار ایک رہبر وراہنما کی طرح تھا جبکہ طالوت ان کے انتخاب شدہ حکمران اور سپہ سالار تھے۔

۲۔ قرآن مجید اسی ماجرا کے ذیل میں بعد والی چند آیات میں بنی اسرائیل کے مقابلے میں ''جالوت'' کی شکست کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَآءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

''(بنی اسرائیل نے طالوت کی زیر قیادت) خدا تعالیٰ کے اذن وفرمان سے دشمن کے لشکر کو شکست دی اور (طالوت کے لشکر میں موجود کمسن اور بہادر) داؤدؑ نے (دشمن حکمران) جالوت کو قتل کر دیا اور خدا تعالیٰ نے اسے (داؤدؑ کو) حکومت اور حکمت عطا کی اور جو وہ چاہتے تھے انھیں اس چیز کے علم سے مستفید فرمایا اور اگر خدا تعالیٰ بعض لوگوں (کے شر) کو بعض دوسروں کے ذریعے برطرف نہ کرے تو فساد زمین پر پھیل جائے لیکن خدا تعالیٰ عالمین پر فضل واحسان کرنے والا ہے۔''[1]

آخری جملہ واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اگر حکومت صاحب قدرت اور طاقتور نہ ہو اور سرکشوں کا سر نہ کچل سکے تو زمین فتنہ وفساد سے بھر جائے، پس عادلانہ حکومت، خدا کا عظیم عطیہ ہے جو دینی اور معاشرتی فسادات کی راہ روکتی ہے۔

۳۔ اسی سے ملتا جلتا مطلب سورۂ حج کی آیت ۴۰ میں بھی آیا ہے، جس میں دشمن کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کی اجازت کے بعد فرمایا گیا ہے:

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ

ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دے دی گئی ہے، جنھیں بلاوجہ اور ناحق طور پر ان کے گھروں سے نکال دیا گیا

---

[1] سورہ بقرہ۔ ۲۵۱

ہے،سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب خدا ہے اور اگر خدا بعض لوگوں (کے شر) کو بعض دوسرے لوگوں کے ذریعے برطرف نہ کرے تو کلیسا، خانقاہیں، یہود ونصاریٰ کی عبادت گاہیں اور مساجد کہ جن میں کثرت کے ساتھ ذکر خدا ہوتا ہے، ویران ہوجائیں!''

یہاں بھی حکومت کا کردار جہاد کی خاطر ذکر کیا گیا ہے لیکن مسلّم ہے کہ ایک منظم سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی نظام کے بغیر جہاد امکان پذیر نہیں اور وہ اس لئے کہ مجاہدین عموماً دو قسموں پر مشتمل ہوتے ہیں؛ عسکری طاقت اور عوامی طاقت، وہ اجتماعی اور عوامی طاقت جو محاذ جنگ میں موجود عسکری طاقت کی پشت پناہی کرتی ہے اور درحقیقت سارے معاشرے کو سنبھالے ہوتی ہے۔

۴۔اس کے بعد وہ آیت یعنی سورۂ حج کی آیت ۴۱ میں سچے اہل ایمان کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

''وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین پر انھیں قدرت واقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری انجام دیں گے۔''

یہ آیت بھی اشارتاً اس مطلب کی ترجمانی کرتی ہے کہ نماز قائم کرنا، ادائیگی زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ایک وسیع اور عمومی طریقے سے اسی وقت میسر ہے جب ایک مضبوط حکومت قائم ہو، لہٰذا سچے اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اگر حکومت واقتدار حاصل کریں تو خدا کے ان عظیم فرائض کو برپا اور نافذ کریں گے یہیں سے اسلامی نقطۂ نظر سے اصلاح معاشرہ کے لئے حکومت کا کردار روشن اور واضح ہوجاتا ہے۔

۵۔سورۂ یوسف کی آیات (۴۳ سے ۵۶) میں ایک واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے مضمون میں حکومت کی ضرورت کو بخوبی بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ مصر کے بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور یوسف - اس وقت قید خانے میں تھے اور خواب کی صحیح تعبیر بتانے کے سلسلے میں ایک حد تک مشہور ہوچکے تھے، آپؑ نے اس کے خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ ملک مصر آئندہ سات سالوں میں سخت قحط کا سامنا کرے گا، اس کے بعد قحط سالی کی اس مدت میں لائحہ عمل سے آگاہ کیا کہ کس طرح درست راشن بندی اور کفایت شعاری کے ذریعے اس بحران کا سامنا کیا جاسکتا ہے، سلطان مصر نے انھیں زندان سے رہا کرکے مصر کے خزانے کا سرپرست مقرر کردیا اور اس طرح یوسف - کی تدبیر اور بہترین انتظام کی بدولت مصر کے تمام لوگوں نے موت سے نجات پائی۔ یہ داستان حکومت اور حکومت کا نظام چلانے والے مدبر اور آگاہ راہنما کے وجود کی ضرورت کو بخوبی واضح کرتی ہے (خاص طور پر ایک بحرانی حالت میں) اگر معاشرہ ایسی حکومت سے محروم ہوجائے تو ایسے نقصانات اس کے دامن گیر ہوتے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔

۶۔قرآن مجید کی کئی ایک آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ حکومت الٰہی ایک نہایت عظیم نعمت خدا ہے اور یہ اس وجہ سے

ہے کہ انسانی معاشرے میں نظم وضبط کا قائم ہونا،ظلم وستم کی روک تھام اورانسانی کمالات کی شرائط کی فراہمی وغیرہ حکومت ہی کے زیرسایہ ممکن ہیں۔سورۂ انبیاء کی آیت ۷۹ میں حضرت داؤدؑ اوران کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "وَ كُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَ عِلْمًا" یعنی: "اوران میں سے ہرایک کو ہم نے حکومت اورعلم عطا کیا۔" سورۂ مائدہ کی آیت ۲۰ میں بنی اسرائیل کوعطا کی گئی نعمتوں کوشمار کرنے کے ضمن میں فرمایا:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۰

"(یاد کیجئے)اس وقت کو جب موسیٰ - نے اپنی قوم سے کہا:اے میری قوم!اپنی نسبت خدا کی نعمتوں کو یاد کرو،جب اس نے تم میں انبیاء مقرر کئے(تاکہ تمہیں قید وبند سے چھڑائیں)اوراس نے تمہیں تمہارا حاکم اورصاحب اختیار بنایا اورتمہیں وہ کچھ عطا کیا جواس نے عالمین میں سے کسی کوعطا نہیں کیا۔"

البتہ تمام بنی اسرائیل حاکم وسلطان نہ تھے،لیکن جب ان ہی میں سے حاکم چنے گئے تو ایک قوم اورملت کے عنوان سے انھیں اس طرح مخاطب کیا گیا کہ خداتعالیٰ نے تمہیں حاکم اوربادشاہ قرار دیا۔سورۂ ص کی آیت ۳۵ میں حضرت سلیمانؑ کی زبان سے فرمایا:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۳۵

"(حضرت سلیمانؑ نے) کہا:میرے پروردگار!مجھے بخش دے اورمجھے ایک ایسی حکومت عطا کر کہ میرے بعد کسی کوایسی حکومت نہ ملے،بے شک توبہت بخشنے والا ہے۔"

بعد میں مذکورہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ ان کی دعا خدا کے حضور میں قبول ہوئی اورایک عظیم حکومت اوربکثرت نعمتیں انھیں عطا ہوئیں جو بے مثال تھیں اورسورۂ نساء کی آیت ۵۴ میں فرمایا گیا ہے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝۵۴

"کیا وہ لوگوں (یعنی رسول اکرمؐ اوران کے خاندان) سے خدا کے عطا کردہ فضل کی وجہ سے حسد کرتے ہیں،اس کے باوجود کہ ہم نے آل ابراہیمؑ کوکتاب وحکمت عطا کی اورایک عظیم حکومت کوان کے اختیار میں دے دیا۔"

یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ خداتعالیٰ نے حکومت عطا کرنے کوعزت اوراسے واپس لے کراس سے محروم کرنے کوذلت کے مترادف قرار دیا۔سورۂ آل عمران کی آیت ۲۶ میں فرماتا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ

تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ بِیَدِكَ الۡخَیۡرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۶﴾

''کہہ دو بار الٰہا! حکومتوں کا مالک تو ہی ہے تو جسے چاہے حکومت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت واپس لے لیتا ہے! تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت سے ہمکنار کرے، تمام خوبیاں تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر قرآن کے نقطۂ نظر سے معاشرۂ انسانی کے لئے حکومت کی اہمیت روشن ہو جاتی ہے اور درحقیقت یہ آیات انسانی معاشروں میں حکومت کی بہت وسیع دنیا کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہے۔

احادیث وروایات اور حکومت کی ضرورت

احادیث وروایات میں بھی ضرورتِ حکومت کا مسئلہ ایک وسیع صورت میں منعکس ہوا ہے اور ان میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ لوگ حکومت کے بغیر زندگی نہیں گذار سکتے، یہاں تک کہ کسی حکومت کے نہ ہونے اور افراتفری کی نسبت ظالم اور ستمگر حکومت ہی بہتر ہے!

ا۔ نہج البلاغہ میں امیر المؤمنین علیؑ نے خوارج جو یہ کہتے تھے:

"لا حُكۡمَ اِلاّ لِلّٰهِ"

''حکومت حاکمیت اور قضاوت صرف اللہ ہی کے لئے ہے''

کے جواب میں فرمایا:

"كَلِمَةُ حَقٍّ یُرادُبِهَا الۡباطِلُ"

یعنی: ''یہ بات حق ہے، جس سے باطل مراد لیا گیا ہے۔''

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

"نَعَمۡ اِنَّهُ لا حُكۡمَ اِلاّ لِلّٰهِ وَلٰكِنَّ هٰؤُلاءِ یَقُولُونَ لا اِمۡرَةَ اِلاّ لِلّٰهِ"

یعنی: ''ہاں، درست ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر کسی کا کوئی حکم نہیں؛ لیکن ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ حکومت اور فرمانروائی خدا کے لئے مخصوص ہے۔''

بعد ازاں فرمایا:

"وَ اِنَّهُ لابُدَّ لِلنّاسِ مِنۡ اَمیرٍ بَرٍّ اَوۡ فاجِرٍ یَعۡمَلُ فی اِمۡرَتِهِ الۡمُؤۡمِنُ، وَیَسۡتَمۡتِعُ فیهَا الۡكافِرُ، وَ یُبَلِّغُ اللّٰهُ فیها الاَجَلَ، وَیُجۡمَعُ بِهِ الۡفَیۡءُ، وَیُقاتَلُ بِهِ الۡعَدُوُّ، وَتَأۡمَنُ بِهِ السُّبُلُ،

وَيُؤْخَذُ بِهِ لِلضَّعِيفِ مِنَ الْقَوِيِّ حَتَّى يَسْتَرِيحَ بَرٌّ وَيُسْتَرَاحَ مِنْ فَاجِرٍ"

یعنی: ''لوگ بہرحال کسی حاکم اور فرمانروا کے محتاج ہیں چاہے وہ نیکوکار ہو یا بدکار! تاکہ اہل ایمان اس کی حکومت کے زیر سایہ اپنے امور کی انجام دہی میں مشغول رہیں اور کافر بھی اس (حکومت) سے مستفید ہوں اور لوگ اس کی حکومت کے دوران آرام وسکون کے ساتھ زندگی گذار سکیں، اس کے ذریعے بیت المال کے اموال اکٹھے کئے جائیں اور اس کی مدد کے ساتھ دشمن کے خلاف جنگ کی جا سکے، راستے پرامن ہوں اور کمزوروں کے حقوق طاقتوروں سے واپس لئے جائیں، نیکوکار لوگ آسودہ حال اور بدکاروں کے شر سے محفوظ ہوں۔ [1]

یہ جو آپؑ نے فرمایا ہے کہ حاکم ضروری ہے چاہے نیکوکار ہو یا بدکار، اس کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں یکساں اور برابر ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ پہلے عادل اور نیکوکار کا سراغ لگایا جائے گا اور اگر کوشش کے باوجود ایسا شخص نہ ملے تو ظالم حکمران کی حکمرانی افراتفری اور شورش کی کیفیت سے بہتر ہے اور یہ بات بہرحال پوری دنیا اور کائنات پر خدا کی حاکمیت کے منافی اور مخالف نہیں، اس لئے کہ نبوت اور قضاوت کی طرح حاکمیت کا سرچشمہ بھی وہی ذات پاک ہے۔ اس عبارت میں ضمنی طور پر حکومت کے مقاصد کے مختلف پہلوؤں اور ضرورت حکومت کے دلائل کو نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، جس کی وضاحت آئندہ ابحاث میں کی جائے گی۔

۲۔ امام علی الرضا - سے ''فضل بن شاذان'' کی منقولہ معروف روایات میں ''اولوالامر'' کے تصور اور معاشرے پر حکومت کے دلائل کے بیان میں تین اہم نکات کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ہے: ''اگر کوئی اعتراض کرے کہ کیوں ''اولوالامر'' مقرر کئے گئے ہیں اور کیوں لوگ حاکم الہٰی کی اطاعت کرنے پر مامور ہیں؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ساری دلیلوں کی وجہ سے جن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ جب لوگوں کی حدود معین ہو جائیں اور ان کو حکم دیا جائے کہ ان حدود سے انھوں نے تجاوز نہیں کرنا کیونکہ یہ ان کے فساد اور بگاڑ کا باعث ہے اس صورتحال میں ایک امین حکمران ہی حدود سے تجاوز اور ممنوعہ امور میں داخل ہونے سے انھیں روکنے کے اسباب فراہم کرسکتا ہے۔

چونکہ اگر اس عمل کی روک تھام نہ ہو تو کوئی شخص اپنے فوائد ولذات کو دوسروں کے فساد (میں مبتلا ہونے) کی خاطر ترک نہیں کرے گا لہٰذا، لوگوں پر ایک سرپرست مقرر کیا گیا ہے جو انھیں فساد سے منع کرتے ہوئے خدا کے احکام اور اس کی حدود کو لوگوں پر نافذ کرے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ دنیا کا کوئی فرقہ اور کوئی قوم ایسی نہیں جو کسی سربراہ اور سرپرست کے بغیر رہی ہو، ایسا سرپرست اور سربراہ جو ان کے دینی اور دنیوی امور کو منظم کرے، پس خدا کی حکمت کی رو سے جائز نہیں کہ وہ مخلوق کے لئے جن امور کو ضروری اور لازمی سمجھتا ہو

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۰

انھیں ترک کردے اوران کے لئے ایک ایسا سرپرست معین نہ کرے جس کی مدد سے وہ دشمن کا مقابلہ اوراس کے ذریعے بیت المال کے اموال کوتقسیم کرسکیں، جوان کی خاطر جمعہ وجماعت کوقائم کرے اورظالم کومظلوم پرستم ڈھانے سے روکے رکھے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اگرلوگوں کوایک باکرداراورامین راہنماوسرپرست نہ ملےتواس کے نتیجے میں دین خدابرباد ہوجاتا ہےاور سنت اوراحکام الٰہی تبدیل کردیئے جاتے ہیں اوراہل بدعت کوان میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے جبکہ مخالفین انھیں کم کرنے کی کوشش کرتے اورمختلف مسائل وامورکومسلمانوں کے لئےمشتبہ بنادیتے ہیں۔"[1]

۳۔تفسیر نعمانی میں امیرالمؤمنین علیؑ قرآن مجید کی چندآیتوں مثلاً

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

یعنی:"اے ایمان والو!جب خدااوررسول تمھیں اس چیزکی طرف بلائیں جوتمھاری زندگی کا سبب ہےتوان کی دعوت پرلبیک کہو۔"[2]

اور یہ آیت

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ[3]

کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وَ فِي هذا اَوْضَحُ دَليلٍ عَلَى اَنَّهُ لابُدَّ لِلاُمَّةِ مِنْ إمامٍ يَقُومُهُ بِاَمْرِهِمْ فَيَأْمُرُهُمْ وَيَنْهاهُمْ، وَيُقيمُ فيهِمُ الْحُدُودَ وَيُجاهِدُ الْعَدُوَّ، وَيُقَسِّمُ الْغَنائِمَ وَيُفْرِضُ الْفَرائضَ وَ يُعَرِّفُهُمْ اَبْوابَ مافيهِ صَلاحُهُمْ وَيُحَذِّرُهُمْ مافيهِ مَضارُّهُمْ، اِذْكانَ الاَمْرُ وَالنَّهْيُ اَحَدَ اَسْبابِ بِقاءِ الْخَلْقِ، وَاِلاّ سَقَطَتِ الرَّغْبَةُ وَالرَّهْبَةُ، وَلَمْ يُرْتَدَعْ، وَلَفَسَدَ التَّدْبيرُ وَكانَ ذلِكَ سَبَباً لِهَلاكِ الْعِبادِ"۔[4]

"ان آیات میں اس بات پربہت واضح اورروشن دلیل موجود ہے کہ امت کے لئے کسی ہادی اورامام کی ضرورت ہے جواس سے متعلق اموروومسائل کوانجام دے، جولوگوں کوامرونہی کرے اوران میں حدودالٰہی کو

---

[1] بحارالانوار، ج۶،ص۶۰(البتہ روایت طولانی ہےاورہم نے فقط اس کاایک حصہ نقل کیا ہے)

[2] سورۂ انفال ر ۲۴

[3] سورۂ بقرہ ر ۱۷۹

[4] بحارالانوار، ج۹۰،ص۴۱

قائم کرے، دشمن کے سامنے جنگ اور مال غنیمت کی منصفانہ تقسیم کو بجالائے، واجبات کو زندہ رکھے اور لوگوں کی اصلاح کے طریقوں سے انھیں آشنا کرے اور جو چیزیں ان کے ضرر وزیان کا باعث ہیں ان سے انھیں بچنے کی تاکید کرے کیونکہ امر و نہی مخلوق کی بقاء وحیات کا سبب ہے ورنہ حوصلہ افزائی وترغیب اور خوف ختم ہوجاتا ہے اور کوئی بھی گناہ کے ارتکاب سے باز نہیں آتا، نظام معاشرہ بگڑ جاتا اور فساد کا شکار ہوجاتا ہے اور یہ بندگان خدا کی ہلاکت اور تباہی و بربادی کا باعث بنتا ہے۔''

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"لایَسْتَغْنی اَهْلُ کُلِّ بَلَدٍ عَنْ ثَلاثَةٍ یُفْزَعُ اِلَیْهِ فی اَمْرِ دُنْیاهُمْ وَ آخِرَتِهِمْ، فَاِنْ عُدِمُوا ذٰلِکَ کَانُوا هَمَجاً فَقیهٌ عالِمٌ وَرِعٌ، وَآمیرٌ خَیِّرٌ مَطاعٌ، وَطَبیبٌ بَصیرٌ ثِقَةٌ:"

''ہر شہر کے رہنے والے تین چیزوں سے بے نیاز نہیں تاکہ دینی ودنیوی امور میں ان کی پناہ حاصل کریں اور اگر ان (تین چیزوں) سے محروم ہوجائیں تو تباہ ہوجائیں گے؛ (وہ تین چیزیں) فقیہ باعلم وتقویٰ، اچھا اور قابل اطاعت حکمران اور بابصیرت اور قابل اعتماد طبیب ہیں۔''[1]

بار بار کہا جاچکا ہے کہ یہ مسئلہ اسلام اور روایات میں اس قدر اہم ہے کہ فتنہ وفساد اور افراتفری کی کیفیت پر ظالم شخص کی حکومت کو ترجیح دی گئی ہے، چنانچہ امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:

"والٍ ظُلُومٌ غَشُومٌ خَیْرٌ مِنْ فِتْنَةٍ تَدُومُ"

یعنی: ظالم اور ستمگر حکمران فتنہ وفساد اور بحرانی کیفیت کی نسبت بہتر ہے۔''[2]

یہ اس وجہ سے ہے کہ اگر عادلانہ حکومت تک دسترسی نہ ہو تو کم از کم ظالم حکومت کو ہی ہونا چاہیے جو لوگوں کے لئے نہ سہی اپنی برقراری کے لئے امن وامان کے قیام اور دشمنوں سے اپنی سرحدوں کی حفاظت کی کوشش کرتی ہے جبکہ اگر حکومت کی طرف سے عائد پابندیاں اٹھا لینے کی صورت میں ہر چیز برباد ہوسکتی ہے اور فاسد اور مفسد افراد لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کردیتے ہیں، بے گناہوں کا خون بہایا جاتا ہے اور دشمن آسانی کے ساتھ مملکت پر اثر انداز ہوکر اس پر قبضہ کرسکتے ہیں۔

عقل کی روشنی میں حکومت کی ضرورت

مذکورہ گفتگو قرآن اور احادیث کے نقطۂ نظر سے حکومت کی ضرورت کے بارے میں تھی جو انسانی معاشرے کے لئے حکومت

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۲۳۵

[2] غرر الحکم، ج ۲، ص ۷۸۴، حدیث ۵۰، باب واؤ

کے لازمی اور ضروری ہونے کو بیان کرتے ہیں، اگر ہم اس کے ساتھ ساتھ عقل و منطق کے دلائل کی طرف بھی رجوع کریں تو صورتحال مزید واضح ہوجاتی ہے۔ یہ دلائل خدا پرست افراد کے نقطۂ نظر سے بھی پیش کئے جاتے ہیں اور الحادی و مادی سوچ کے عامل افراد کی طرف سے بھی کیونکہ دونوں کا ضرورت حکومت سے متعلق نقطۂ نظر مشترک ہے۔ اگر چہ ان کے دلائل بعض جہات کے اعتبار سے قدرے مختلف ہو سکتے ہیں۔ عمومی نقطۂ نگاہ سے اس موضوع کے بارے میں پیش کئے گئے دلائل کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

اوّلاً: انسان کی زندگی ایک معاشرتی زندگی ہے۔ اس طرح کہ اگر انسانی زندگی اس خصوصیت یعنی؛ اجتماعیت سے خالی ہو تو یہ جاہلیت اور حیوانیت کے پست ترین درجے کو چھوتی نظر آتی ہے، چونکہ انسانی زندگی میں تمام منافع اور مفید نتائج، ثقافتیں، پیش رفت، کمالات کا حصول، علوم وفنون، ہر قسم کی صنعتیں اور مصنوعات، مختلف جہات میں باہمی تعاون اور اجتماعی زندگی کی ہی برکت سے ہیں۔ جب تک چھوٹی چھوٹی افرادی قوتیں اور سوچیں باہم جمع نہ ہوں کسی قسم کی عظیم تبدیلیاں اور انقلابات معرض وجود میں نہیں آ سکتے۔

واضح الفاظ میں: انسان اگر معاشرے اور اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ ہوجائے تو انسانوں کی بجائے اس کا شمار حیوانوں میں ہو گا، اور یہ اس کا باطنی میلان، قلبی خواہش اور معاشرتی زندگی ہی ہے جس نے اُسے اِس قدر پیشرفت اور برتری کی قدرت بخشی ہے۔

یہ ایک طرف سے اور دوسری طرف سے واضح ہے کہ انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی ان اہم فوائد وبرکات کے باوجود باہمی کشمکش اور تنازعات سے خالی نہیں یہ تنازعات نہ فقط دوسروں پر غلبہ پانے اور خودغرضی کی وجہ سے جنم لیتے ہیں بلکہ ان کا سبب یہ بھی ہے کہ معاشرے کے افراد اکثر اوقات اپنے حقوق اور حدود کی تشخیص میں غلطی واشتباہ کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔ یہیں سے ایسے قوانین کی ضرورت پڑتی ہے جو ہر فرد کے حقوق کو معین کریں اور دوسروں پر تجاوز وتعدی اور تنازعوں کی راہ روکیں۔

تیسری طرف سے یہ بات مسلم ہے کہ یہ قوانین خود بخود تجاوز اور تنازعہ کی روک تھام نہیں کر سکتے بلکہ یہ اسی صورت میں مؤثر اور مفید ہوتے ہیں جب انھیں صحیح معنوں میں نافذ العمل قرار دیا جائے، دوسرے الفاظ میں فقط حکومت ہی ہے جو معاشرے میں نظم وضبط برقرار رکھ سکتی اور فساد، خونریزی اور حقوق کے غصب کا راستہ روک سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشروں میں زمانۂ قدیم سے حکومت رہی ہے۔

ثانیاً: بالفرض اگر لوگ حکومت کے بغیر بھی صحیح وسالم زندگی گذار سکتے ہوں (جو ناممکن ہے) لیکن علوم وفنون، صنعتوں اور مختلف اجتماعی امور میں کمال اور ترقی فقط ایک محتاط لائحہ عمل کی تشکیل اور ایک مدبر کی تدبیر کے ذریعے ہی ممکن ہے اور اسی کا دوسرا نام حکومت قائم کرنا اور اس کی تشکیل ہے۔

اسی وجہ سے دنیا کے تمام عقلاء انسانی معاشروں میں تشکیل حکومت کی ضرورت پر زور دیتے ہیں سوائے کمیونزم کے طرفدار افراد کی باتوں کے جو بعض اوقات یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ اگر ایک مکمل کمیونٹی انسان کو میسر آ جائے اور طبقاتی نظام کا خاتمہ ہوجائے تو پھر حکومت کی ضرورت نہیں رہے گی چونکہ ان کے عقیدے کے مطابق حکومتیں ہمیشہ سرمایہ دار طبقہ کے منافع اور فوائد کی محافظ رہی ہیں۔ اس لئے جب طبقاتی نظام کی بساط الٹ جائے تو حکومت کے ضروری ہونے کی کوئی دلیل باقی نہیں رہے گی! لیکن واضح ہے کہ یہ محض وہم وخیال ہے جس کی

عقل و منطق کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں، چونکہ طبقاتی نظام کا خاتمہ اور موجودہ حالات میں لوگوں کا ایک ہی سطح پر آجانا ایک خواب وخیال سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

بالفرض اگر ایسے معاشرے تک ہماری رسائی بھی ہوجائے اور طبقاتی جنگ اور اس کی محافظ حکومت کا خاتمہ ہوجائے پھر بھی علوم وصنایع کی ترقی، لوگوں کی سلامتی کی حفاظت، نظم وضبط اور آزادی کی برقراری اور ان کی غذائی ورہائشی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک مدبرانہ لائحۂ عمل کی ضرورت ہے۔ کیا نوجوان نسل کی تعلیم وتربیت کے لئے وزارت تعلیم کی ضرورت نہیں جو اس مقصد کے لئے ایک جامع پروگرام سے روشناس کرائے؟ کیا وزارت صنعت کے بغیر صنعتی مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے؟ کیا وزارت دفاع کے بغیر ایک منظم اور طاقتور فوج کی تشکیل ممکن ہے جس کے ذمے ملک وقوم کے دفاع کا معاملہ ہے؟ بالفرض اگر دنیا میں کوئی جنگ واقع نہیں ہوتی پھر بھی کیا ممکن ہے کہ انتظامیہ کے بغیر مطلوبہ نظم وضبط کو معاشرے کے حوالے کیا جائے۔

بہرحال یہ نکتہ کسی دلیل کا محتاج نہیں کہ انسانی معاشرہ ایک دن بھی حکومت کے بغیر سالم نہیں رہ سکتا اور حکومت کے وجود سے انکار کرنے والے بھی اس امر تک نہیں پہنچ سکے اور پریشانی اور شرم کے مارے راستے ہی سے واپس آگئے!

ٹھیک ہے کہ خودغرض، ظالم اور ستمگر حکومتیں کئی بُرائیوں کا باعث بنتی ہیں اور پوری تاریخ میں انسان کی بہت ساری بدبختیوں کا سرچشمہ رہی ہیں، لیکن اگر ہم چند لحظہ اس بات کا تصور کریں کہ یہی حکومت اگر ٹوٹ جائے اور اس کی جگہ کسی عبور حکومت کے برسراقتدار آنے سے پہلے جو فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے اور جس شکست وریخت کا سامنا سارے معاشرے کو کرنا پڑتا ہے تو ہم دیکھیں گے کہ اس بے حکومتی کی نسبت وہ ظالم حکومت بدرجہا بہتر تھی۔ رہی بات خداپرستوں کے نقطۂ نظر کی جو ارسال رسل اور آسمانی کتب کے نازل ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں تو ان کے نزدیک حکومت کے ضروری ہونے کا مسئلہ زیادہ واضح ہے:

کیونکہ ایک طرف سے دینی کتب میں بعثت انبیاء کے جو اہداف ومقاصد بیان کئے گئے ہیں اور عقلی دلائل بھی ان کی تائید کرتے ہیں ان کا حصول تشکیل حکومت کے بغیر ناممکن ہے؛ مثلاً صحیح تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفوس حکومت تشکیل دیئے بغیر بہت مشکل یا ناممکن ہیں۔

غور کریں کہ اگر تمام سکول وکالج اور یونیورسٹیاں جو ہمارے زمانہ میں ہیں ان سب کو کسی غیر مذہبی یا سیکولر حکومت کے سپرد کردیا جائے اور ذرائع ابلاغ یعنی ریڈیو، ٹیلیویژن وغیرہ بھی اسی انداز سے اپنی کارکردگی ظاہر کریں اور ہم یہ چاہیں کہ صرف لوگوں کو وعظ ونصیحت کریں اور مساجد اور منبروں سے استفادہ کر کے انھیں انبیاءؑ کے مقاصد اور تعلیم وتربیت سے آگاہ کریں تو یقینی طور پر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے اور صرف ایمان وتقویٰ کی ہلکی سی چنگاری تھوڑے سے افراد کے دلوں میں برقرار کی جاسکے گی، لیکن اگر کوئی حکومت ایمان وتوحید اور خدا اور مقدسات اسلامی کی بنیاد پر قائم کی جائے اور ابلاغ ونشریات کے تمام ذرائع اس کے اختیار میں ہوں تو اس صورت میں ہمیں اس مسئلے کی بالکل برعکس تصویر نظر آئے گی۔

عدالت اجتماعی اور لوگوں کا قیام عدل، جو ایک اور مقصد ہے اس کی صورتحال بھی یہی ہے۔ ایک ظالم اور بے دین حکومت جو مستکبرین کی آلۂ کار کیسے ہو، عدل وقسط کو قائم کرسکتی ہے؟ مختصر یہ کہ انبیاء خدا کے مقاصد میں سے کوئی ایک مقصد بھی تشکیل حکومت کے بغیر

پورا نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ جب تک رسول اکرمؐ نے حکومت تشکیل نہ دے لی اپنے اعلیٰ مقاصد تک نہ پہنچ پائے، باقی انبیاء میں سے بھی جو حکومت الٰہی کی تشکیل میں کامیاب ہوئے، وہ ایک واضح کامیابی سے ہمکنار ہوئے لیکن وہ انبیاء کرامؑ جنھیں یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی فاسد اور مفسد لوگوں کے طرح طرح کے مظالم کا شکار بنتے رہے۔

اسی دلیل کے پیش نظر آخری زمانے میں توحید وعدل کی وسعت اور اشاعت بھی امام مہدیؑ کی عالمی حکومت کے ذریعے انجام پائے گی، یہ سب ایک طرف سے۔اور دوسری طرف سے احکام اسلام صرف عبادات ہی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ بہت سارے احکام کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی مسائل کے ساتھ ہے، جیسے حدود، دیات، خمس وزکات اور انفال وغیرہ کے احکام۔

کیا حکومت کی تشکیل کے بغیر یہ ممکن ہے کہ محتاجوں کے حقوق بعنوان زکات دولتمند افراد سے لئے جاسکیں؟ یا اسلامی قضاوت کو ہر جگہ اور ہر سطح پر نافذ کیا جاسکے؟ ہمارے پاس حدود کو جاری کرنے اور فاسد افراد کا راستہ روکنے کی کیا ضمانت ہے؟ اگر مملکت اسلامی پر دشمن حملہ کردے تو تشکیل حکومت اور مختلف اسلحوں اور تجربہ کار لشکر کے بغیر کس طرح اسلامی حکومت کا دفاع ممکن ہے؟!

مختصر یہ کہ جب تک الٰہی اور عدالت پر مبنی عوامی (جمہوری) حکومت قائم نہیں ہوتی احکام اسلامی کی ایک بڑی مقدار نافذ نہیں ہو سکتی ہے، کیونکہ احکام کی تین اقسام ہیں یعنی ''سیاست'' حکومتی لائحہ عمل ہے اور سیاست حکومت کے متن میں داخل ہے اور ''معاملات'' صالح حکومت کی پشت پناہی کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتے یہاں تک کہ جیسے حج ونماز جمعہ وجماعت جیسی عبادات بھی حکومت الٰہی کے زیر سایہ ہی شان وشوکت کے ساتھ بجالائی جاسکتی ہیں۔

اسلامی حکومت کے مقاصد

حکومت کے ضروری ہونے کے بارے میں جو کچھ اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے اس سے حکومت اسلامی کے مقاصد بھی کسی حد تک واضح ہو گئے ہیں مزید وضاحت کے لئے درج ذیل آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں: سورۂ حج کی آیت ۴۱ میں فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

یعنی: ''وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنھیں اگر ہم زمین پر صاحب قدرت قرار دیں تو وہ نماز قائم اور زکات ادا کرتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔''

مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ کا مطلب روئے زمین پر قدرت عطا کرنا ہے، لیکن یہ تعبیر قرآن مجید کی بہت ساری آیات میں خصوصی طور پر حکومت کی قدرت کے معنی میں استعمال ہوئی ہے؛ چنانچہ سورۂ یوسف میں دو آیتوں میں فرمایا گیا ہے:

"وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ" [1]

اور ذوالقرنین کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَ آتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا"

''ہم نے اسے زمین پر قدرت اور حکومت عطا کی اور ہر چیز کے اسباب اس کے اختیار میں قرار دیئے۔'' [2]

اس لحاظ سے آیۂ شریفہ کا مفہوم کچھ یوں ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے دوست جب حکومت حاصل کرتے ہیں تو وہ قرب خدا تک رسائی کی راہ ہموار کرتے ہیں جس کی بہترین جلوہ گاہ نماز ہے اور دوسری طرف سے اجتماعی عدالت قائم کرنے کی راہ گشائی کرتے ہیں جس کا واضح نمونہ زکات ہے اور تیسری طرف سے ہر قسم کے اجتماعی فساد کے خلاف جہاد کر کے معاشرے میں نیکی اور خوبی کے عوامل و اسباب کو رواج دیتے ہیں کہ جس کا اہم ذریعہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اگر ہم فرض کریں کہ مَكَّنَّا سے ہر قسم کی قدرت عطا کرنا ہے تو اس کے باوجود آیۂ شریفہ کی دلالت ہمارے مقصود پر واضح ہے کیونکہ حکومت قدرت کا واضح ترین نمونہ ہے۔

علامہ طباطبائیؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں: زمین پر تمکین سے مراد انھیں قدرت عطا کرنا ہے تاکہ وہ زندگی سے متعلق

---

[1] سورۂ یوسف/۲۱ اور ۵۶

[2] سورۂ کہف/۸۴

تمام امور جن کا وہ ارادہ کریں بغیر کسی روک ٹوک کے انجام دے سکیں۔[1]

کیا ایسی قدرت حکومت حاصل کئے بغیر ممکن ہے؟ تفسیر قرطبی میں یہ مطلب زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کیونکہ اس میں جملہ "اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ" کی تفسیر میں امراء وصاحبان حکومت مراد لئے گئے ہیں۔[2]

اصولی طور پر مذکورہ بالا آیت میں جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذکر ہوا ہے جیسا کہ فقہی مباحث میں بھی اس کا ذکر ہے، وہ مختلف مراحل پر مشتمل ہے، جس کا ایک مرحلہ حکومت کا صاحب اختیار ہونا ہے۔ سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں صالحین کی حکومت کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔا ۭ

اس آیت میں خدا تعالیٰ صالح مؤمنین کے ساتھ خلافت اور حکومت کا وعدہ کرنے کے بعد چند اور جملے بیان کرتا ہے جو حقیقت میں اس حکومت کے مقاصد پر مشتمل ہیں: پہلا مقصد دین الٰہی کو معاشرے میں قدرت اور حاکمیت عطا کرنا ہے اور دوسرا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حکومت عدم امن وامان کو اجتماعی امن وامان میں تبدیل کردے گی اور عبادت میں ہر قسم کے شرک کو ختم کرنے کا باعث ہوگی۔ اس طرح اس بیان کے مطابق حکومت کے تین مقاصد ہیں:

۱۔ پورے معاشرے پر دین اور قوانین الٰہی کی حاکمیت۔

۲۔ ہر جگہ امن وامان کی برقراری۔

۳۔ خدا کی خالصانہ عبادت اور شرک وبت پرستی کے آثار کا خاتمہ۔

درحقیقت انتہائی مقصد انسانی کمالات حاصل کرنا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سیر وسلوک سفر ہے اور امن وامان کی برقراری اور قوانین الٰہی کی حاکمیت اس مقصد تک رسائی کے مقدمات اور شرائط ہیں۔ سورۂ ص کی آیت ۲۶ میں داؤدؑ سے خطاب کرکے فرمایا گیا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ

یعنی: "اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا ہے پس لوگوں پر حق کے ساتھ حکومت اور قضاوت کرو۔"

اس آیت کریمہ میں واضح طور پر خلافت وحکومت کا نتیجہ اثبات حقوق کو قرار دیا گیا ہے، دوسرے الفاظ میں ہر قسم کے تجاوز وتعدی کی روک

[1] تفسیر المیزان، ج ۱۴، ص ۳۸۶

[2] تفسیر قرطبی، ج ۷، ص ۴۴۶۵

تھام اور ضعیف ومحروم افراد کے حقوق کو طاقتور افراد سے واپس لینا مراد ہے۔

واضح ہے کہ یہ حضرت داؤدؑ یا بنی اسرائیل کے دوسرے انبیاء کی حکومت کا ہی مقصد نہیں تھا بلکہ یہ ہر زمانے اور ہر جگہ قائم ہونے والی حکومت الٰہی کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔

درست ہے کہ لفظ ''حکم'' بہت ساری آیات میں قضاوت اور فیصلہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن اس بات کے پیش نظر کہ اس آیت شریفہ کے آغاز میں گفتگو روئے زمین پر خلافت کے بارے میں ہے، لہٰذا واضح ہو جاتا ہے کہ ہر قسم کی عادلانہ حکومت و حاکمیت آیت کے جامع مفہوم میں داخل ہے۔ اس سے ملتا جلتا مطلب سورۂ نساء کی آیت ۵۸ میں بھی آیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ

یعنی: ''خدا تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے صاحبان تک پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان قضاوت اور حکومت کرو تو اسے عدل وانصاف پر مبنی ہونا چاہیے۔''

اس آیت کی تفسیر میں بیان شدہ متعدد روایات میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ اس امانت سے مراد مقام ولایت ہے جسے ہر امامؑ اپنے بعد والے امامؑ کے سپرد کرتے ہیں اگرچہ یہ حکم باقی امانات کے بارے میں بھی جاری ہے۔ [1]

خاص طور پر یہ کہ ان روایات میں سے بعض میں آیا ہے کہ آیت کا خطاب حکام (سربراہان حکومت) سے ہے [2]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں عدالت پر مبنی حکومت سے فقط قضاوت اور فیصلہ مراد نہیں بلکہ اس کے دائرے میں ہر قسم کی عادلانہ حکومت داخل ہے۔

اصولی طور پر وہ تمام آیات وروایات جو انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد تعلیم وتربیت، تزکیۂ نفوس، لوگوں کے درمیان عدالت قائم کرنا اور غلامی کی زنجیروں سے نجات قرار دیتی ہیں، وہ حقیقت میں تشکیل حکومت کے مقاصد کو بھی بیان کرتی ہیں اس لئے کہ الٰہی حکومتیں بعثت انبیاء کے مقاصد پورا کرنے کے مقدمات اور آلات ہیں، اس طرح ایک الٰہی حکومت کے مقاصد کو مندرجہ ذیل امور میں خلاصہ کر کے پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تعلیم وتربیت اور علمی واخلاقی لحاظ سے معاشرتی نشوونما۔

۲۔ انسانی آزادی کی ضمانت کی فراہمی، اور ہر قسم کی قیدوبند سے رہائی اور انسانوں کے انسانوں ہی کے ذریعے استحصال کی نفی چاہے یہ استحصال فکری ہو یا سیاسی، عسکری اور اقتصادی۔

---

[1] نور الثقلین، ج۱ ص ۴۹۵۔ تفسیر عیاشی، ج۱ ص ۲۴۹۔ بحار الانوار، ج ۲۳ ص ۲۷۴ کے بعد

[2] تفسیر برہان، ج۱ ص ۳۸۰ (انہ خاطب بھا الحکام)

۳۔معاشرے کے تمام طبقوں میں عدل وانصاف قائم کرنا اور اجتماعی عدالت کی ضمانت دینا۔

۴۔دوسرے مقاصد تک رسائی کے لئے مقدمہ کے طور پر اجتماعی امن وامان کی فراہمی۔

۵۔خدا کی بندگی وسیر الی اللہ اور کمالات انسانی سے مستفید ہونے کے مقدمات کی فراہمی تاکہ اس طرح قرب الٰہی کی منزل تک رسائی حاصل ہو سکے جو غَایَۃُ الْغایاتِ وَمُنْتَہی الرَّغَباتِ ہے(یعنی وہ مقام جو تمام مقاصد کی منزل مقصود اور تمام رغبات کا انتہائی اور مطلوب نقطہ ہے)

اس بحث کو ہم امیر المؤمنین علی -کے مالک اشتر کے نام فرمان کے ابتدائی کلمات کے بیان کے ساتھ ختم کرتے ہیں جس میں حکومت اسلامی کے اغراض ومقاصد کا ایک واضح نقشہ کھینچا گیا ہے؛ آپؑ نے فرمایا:

"ھذا ما اَمَرَ بِہِ عَبْدُ اللّٰہِ عَلیٌ اَمیرِ الْمُؤمِنینَ، مالِکَ بْنَ الْحارِثِ الأشْتَرَ فی عَھْدِہِ اِلَیْہِ حینَ وَلاہُ مِصْرَ، جَبایَۃَ خَراجِھا، وَجِھادِ عَدُوِّھا وَاسْتِصْلاحِ اَھْلِھا وَعِمارَۃَ بِلادِھا"

یعنی: ''یہ وہ حکم ہے جو بندۂ خدا علی امیر المؤمنین نے مالک بن حارث اشتر کو اس کے نام اپنے فرمان میں دیا ہے، جب آپؑ نے انھیں مصر کا حاکم بنایا تاکہ وہ اس سرزمین کے مالیات جمع کریں اور اس ملک کے دشمنوں کے خلاف لڑیں اور اہل مصر کی اصلاح کو ہمت وحوصلہ کے ساتھ انجام دیں اور اس سرزمین کے شہروں کو آباد کریں۔''[1]

اس ترتیب سے شہروں کی آبادکاری، لوگوں کے حال کی اصلاح ودرستگی، دشمنوں کے خلاف جہاد اور بیت المال کی تقویت جو مذکورہ مقاصد کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، اس حکومت کے جملہ مقاصد شمار کئے گئے ہیں لیکن جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے یہ ایسے اغراض ومقاصد ہیں جو پہلے مرحلے میں قرار پاتے ہیں۔اصلی اور انتہائی مقصد تعلیم وتربیت، تہذیب نفوس اور سیر الی اللہ ہی ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳

حکومت کی اقسام

پوری تاریخ میں حکومت مختلف شکلوں میں جلوہ کر رہی ہے اور شاید دنیا کے ممالک کی تعداد کے مطابق حکومتوں کی بھی تعداد رہی ہے، لیکن حکومت بنیادی طور پر تین اقسام پر مشتمل ہے:

۱۔خودسر اور استبدادی حکومتیں

جو ایک فرد یا گروہ خاص کی حاکمیت پر استوار ہوتی ہیں اور فرد یا گروہ کے محور پر گردش کرتی ہیں جس کے نتیجے میں معاشرہ غلامی اور سیاہ بختی کا شکار ہوجاتا ہے۔طبعی بات ہے ایسی حکومت انھیں لوگوں کے منافع کا دفاع کرتی ہے، پوری تاریخ میں سب سے زیادہ جرائم کے مرتکب ایسے ہی استبدادی حکمران اور سلاطین ہوئے ہیں جو خود کو محفوظ کرنے کے لئے کسی حد کو نہیں پہچانتے تھے یہاں تک کہ مزاحمت یا امکان مزاحمت کی صورت میں اپنے بھائیوں اور فرزندوں تک کو خاک وخون میں غلطاں کرنے سے ذرا نہیں ہچکچاتے۔

حکومت کی اس قسم میں لوگوں کے ارادے کا کوئی کردار نہیں ہوتا اور ان کی مصلحتوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا اور ہر چیز طاقت کے محور پر گردش کرتی ہے اور کبھی جزئی استبداد جو چھوٹی سی اقلیتی پارٹی پر مشتمل ہوتا ہے طاقت کے ذریعے لوگوں پر مسلط ہوجاتا ہے اور اپنے افکار کو ان پر زبردستی ٹھونستا ہے، یہ وہی چیز ہے جس کے کارل مارکس کے پیروکار طرفدار تھے اور جسے ''محنت کش طبقے کی ڈکٹیٹرشپ'' سے یاد کرتے تھے (محنت کش افراد میں سے ایک چھوٹا سا گروہ جس کا وفادار اور کارآمد ہونا ثابت ہوجاتا تھا اس کا نام کمیونسٹ پارٹی میں شامل کرلیا جاتا تھا اور اس چھوٹے سے گروہ کی عوام کی بھاری اکثریت پر حکومت ہوتی تھی، یہ ایک ایسی پارٹی تھی جو نہ ہمہ گیر تھی اور نہ ہی اس میں آزادانہ انتخابات ہوتے تھے اور نہ ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ اس پارٹی کا رکن بن سکے، نہ ہی جمہوریت کا اس میں کوئی شائبہ ہوتا تھا)۔

۲۔جمہوری نظام یا جمہوری حکومت

جو آج کل دنیا میں حکومت کی بہترین اور کامل ترین صورت کے عنوان سے معروف ہے۔اس نظام حکومت میں اصل واساس یہ ہے کہ ہر طبقے کے افراد کامل آزادی کے ساتھ اپنے ووٹ کے ذریعے اپنے نمائندے منتخب کرکے اپنی قوم کی تقدیر کو چند معین سالوں کے لئے ان کے حوالے کردیں، وہ نمائندگان بھی تبادلۂ خیالات اور باہمی مشورے سے، جو بظاہر آزادی کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ایسے قوانین وضع کرتے ہیں جو ان کے خیال میں لوگوں کے فائدے کے لئے ہوتے ہیں اور ان قوانین کے نفاذ کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے کہ اس کمیٹی کا سربراہ کبھی ان نمائندوں اور گاہے براہ راست لوگوں کے ذریعے وزیراعظم یا صدر کے طور پر منتخب ہوتا ہے، اس قسم کی حکومت کو جمہوری یا عوام کی عوام پر حکومت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس حکومت کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک قسم یہ ہے کہ ظاہری اور واقعی طور پر عوامی ہوتی ہے اور آج اور گذشتہ دنیا میں اس کا وجود

بے حد کم رہا ہے یا شاید موجود ہی نہیں رہی۔ دوسری قسم یہ ہے کہ یہ جمہوری حکومت بظاہر عوامی رنگ و بو رکھتی ہے، لیکن حقیقت میں ایسے نہیں، اس کی روح ''استبدادی'' اور ظاہر ''جمہوری'' ہوتا ہے! اس ظاہری اور باطنی تفاوت اور فرق کی بھی دو قسمیں ہیں۔

بعض اوقات ایک فرد یا کئی خودغرض افراد واضح اور اعلانیہ طور پر انتخابات کے عمل میں دخل اندازی کرتے اور لوگوں سے زبردستی ووٹ ڈلواتے ہیں یا جعلی ووٹوں سے صندوقوں کو بھر لیتے ہیں تا کہ ان کے منظورِ نظر افراد جیت سکیں اور کبھی یہ دخل اندازی مخفیانہ انداز میں انجام پاتی ہے، جبکہ ایسا ہوتا نہیں کیونکہ ایک چھوٹا سا بے حد دولتمند طبقہ نہایت ظرافت کے ساتھ لوگوں کی نفسیات کا مطالعہ کر کے ان کے درمیان اپنے منظورِ نظر افراد کے بارے میں اس قدر پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ انتخاب میں شرکت کرنے والے افراد عالم فاضل، ہمدرد، مدبر و منظم اور آسمانی فرشتوں کی مانند پاک صاف اور معصوم ہیں جبکہ یہ اسی دولتمند طبقے کے ایجنٹ اور انہی کی حکومت کا حق ادا کرتے ہیں۔

اس قسم کے معاشرے کی مثال کے طور پر یورپ کے اکثر ممالک اور امریکہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جہاں حکومت درحقیقت استبدادی اور ظالمانہ ہے جو لوگوں کے سامنے جمہوری حکومت کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

۳۔ حکومت الٰہی

یہ ایک ایسی حکومت ہے جو نہ کسی ایک فرد اور نہ کئی افراد کے ارادے کے مطابق چلتی ہے اور نہ لوگوں کی خواہش کے گرد گھومتی ہے بلکہ یہ اللہ کے ارادے کی پر قائم ہوتی ہے اور یقینی بات ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی مصلحت کو پورا کرنے کے علاوہ کوئی اور ارادہ نہیں رکھتا، اس قسم کی حکومت انبیاء کرام اور ان کے برحق جانشینوں اور ان کی راہ پر گامزن رہنے والوں کی حاکمیت میں ہی دیکھی جا سکتی ہے اور دنیا میں ایسی حکومتوں کا وجود بے حد کم ہے۔ قرآن مجید میں تینوں اقسام کی حکومت کے نمونوں کو پیش کیا گیا ہے:

ا۔ قرآن مجید فرعون کی جابرانہ اور خودسرانہ حکومت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''اس نے زمین پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس سرزمین کے رہنے والوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا، ایک گروہ کے افراد کو کمزور اور ناتوانی کی طرف کھینچ لے گیا، ان کے بیٹوں کے سر تن سے جدا کر دیئے اور ان کی بیٹیوں کو (کنیزی اور خدمت کے لئے) زندہ رکھا وہ یقیناً فساد برپا کرنے والا تھا۔

''اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلا فِي الاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَها شِيَعاً يَسْتَضْعِفُ طائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْناءَهُمْ وَ يَسْتَحْيِي نِساءَهُمْ اِنَّهُ كانَ مِنَ الْمُفْسِدينَ''

فرعون سارے مصر کی سرزمین کو اپنی ملکیت خیال کرتا تھا اور اس کے عظیم دریاؤں اور نہروں کا فقط اپنے آپ کو ہی مالک تصور کرتا تھا اور یوں کہتا تھا: ''اے میری قوم کیا مصر کا ملک اور حکومت کا میں ہی مالک نہیں ہوں؟ اور یہ بہنے والی نہریں میرے ہی حکم سے جاری نہیں؟ کیا تم لوگ نہیں دیکھتے؟

يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٥١﴾ [1]

وہ لوگوں پر حکومت کرنے ہی کو کافی نہیں خیال کرتا تھا بلکہ اس کی توقع یہ تھی کہ سب لوگ اس کی پوجا کریں اور اس کے علاوہ کسی کی پوجا نہ کریں، اسی وجہ سے اس نے موسیٰؑ سے کہا: اگر تم میرے علاوہ کسی کو معبود قرار دوں گے تمہیں سپرد زندان کردوں گا؛

لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰـهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿٢٩﴾ [2]

وہ اس بات کا بھی معتقد تھا کہ اگر کوئی تحقیق کے ذریعے مدعی نبوت کی طرف سے پیش کئے گئے معجزات دیکھ کر اس کی سچائی پر ایمان لے آئے تو بھی اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس پر ایمان لائے؛ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے ان جادوگروں کی سخت مذمت کی جو واضح معجزات کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ [3]

اس سے ملتا جلتا مطلب ایک اور خودسر بادشاہ نمرود کے ہاں بھی نظر آتا ہے کہ جس نے واضح انداز میں حضرت ابراہیمؑ سے کہا: جن معجزات کی تم بات کرتے ہو انھیں میں بھی انجام دے سکتا ہوں، میں زندہ بھی کرتا ہوں اور مارتا بھی ہوں؛ ''أَنَا أُحْيِي وَأُمِيت'' لیکن جب اسے ابراہیمؑ کے دندان شکن استدلال کا سامنا کرنا پڑا کہ خدا تعالیٰ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اگر تم قدرت رکھتے ہو تو ایک دن اسے مغرب سے طلوع کر دکھاؤ تو یہی وہ مقام تھا جس پر وہ ذلیل اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔ (سورۂ بقرہ ۲۵۸)

اصولی طور پر تمام لوگ یہاں تک کہ جابر و خودسر سلاطین بھی اپنے آپ کو روئے زمین پر انسانی معاشرے میں فساد کا باعث سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب حضرت سلیمان- کا خط ملکۂ سبا کو ملا اس نے اس بات کی تحقیق کے لئے کہ آیا سلیمانؑ ایک خودسر بادشاہ ہیں یا خدا کے نبی، آپؑ کے لئے ہدیہ اور تحائف بھیجے اور اس کے ضمن میں کہا: بادشاہوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد برپا کرتے اور آبرومند اور معزز لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، ان کا کام اور روش ہمیشہ سے یہی رہی ہے:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٤﴾ [4]

بادشاہ لوگ اپنے مخالفین کو بدترین اذیتوں کا نشانہ بناتے اور زندہ حالت میں آگ میں جلا دیتے تھے، جیسا کہ ''اصحاب الاخدود'' کے بارے میں سورۂ بروج میں ذکر ہوا ہے؛ (تاریخ میں مذکور ہے کہ ان کے بادشاہ ''ذونواس'' نے انھیں ایک خندق کھودنے اور اس

---

[1] سورہ زخرف۔ ۵۱
[2] سورہ شعرا۔ ۲۹
[3] سوورہ اعراف۔ ۱۲۳
[4] سورۂ نمل ۳۴

میں بہت سا ایندھن ڈال کر آگ جلانے کا حکم دیا اور دین مسیح کے پابند افراد کو زندہ اس میں ڈال دیا گیا اور حکم دیا کہ بوڑھے اور بچوں پر بھی رحم نہ کیا جائے) ان کا گناہ کیا تھا؟ فقط یہ کہ وہ خدائے واحد، لائق حمد وثنا پر ایمان لائے تھے۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ [1]

تاریخ میں اس قسم کے خودسر اور ظالم حکومتوں کے بارے میں کئی واقعات موجود ہیں اور قرآن مجید میں ان کی طرف متعدد آیات میں اشارے کئے گئے ہیں کہ وہ لوگ (حکمران) اپنی قوم وملت (رعایا) کے ساتھ غلاموں کا سا بلکہ اس سے بدتر سلوک روا رکھتے تھے اور اصولاً انبیاء کرام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد ایسے خودغرض وخودسر حکمرانوں کے ساتھ مقابلہ کرنا اور لوگوں کو ان کے چنگل سے رہا کرنا تھا۔

۲۔شوریٰ پر مبنی حکومت یا لوگوں پر حکومت کے بارے میں بھی بعض اشارے قرآن میں نظر آتے ہیں اگر چہ کامل طور پر آج کل کی صورتحال کے مشابہ صورت میں نہیں، سورۂ نمل کی آیت ۳۲ میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی داستان کے بارے میں مذکور ہے: جب حضرت سلیمانؑ کا خط ملکہ سبا کو موصول ہوا اس نے اپنے مشیروں کو جمع کیا اور انھیں خط کی تفصیل سے آگاہ کیا اور کہنے لگی: اے بندگان! اس اہم مسئلے میں اپنی رائے بیان کرو کیونکہ میں کوئی اہم کام تمہاری موجودگی کے بغیر انجام نہیں دیتی!

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝۳۲

یقیناً اس زمانے میں نہ انتخابات تھے نہ لوگوں کے ووٹ، لیکن اسی قدر کہ وہ اپنے کاموں میں مشاورت کی پابند تھی، شوریٰ پر مبنی حکومت کو ظاہر کرتی تھی اگر چہ اس حکومت کی شورائی حیثیت کچھ خاص واضح نہیں تھی۔

مزید یہ کہ معاشرتی اور حکومتی امور میں شوریٰ اور مشورہ کے بارے میں اسلام نے بہت زیادہ تاکید کی ہے، چنانچہ قرآن سچے اہل ایمان کے بارے میں کہتا ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ

یعنی: ''ان کے امور باہمی مشورے کی صورت میں ہوتے ہیں۔'' [2]

اور یہاں تک کہ رسول اکرمؐ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے امور میں مؤمنین کے ساتھ مشورہ کریں۔

''وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ'' (آل عمران/۱۵۹) رسول اکرمؐ کی حکومت اگر چہ حکومت الٰہی تھی، لیکن اس کے باوجود آپؐ کو لوگوں کے ساتھ مشورے کا حکم تھا تاکہ حکومت کی عوامی حیثیت بھی محفوظ رہے۔

۳۔البتہ الٰہی حکومتوں کے بارے میں قرآن مجید میں بہت زیادہ ابحاث نظر آتی ہیں حضرت داؤدؑ کی عظیم حکومت کے بارے

---

[1] سورۂ بروج/۸

[2] سورۂ شوریٰ/۳۸

میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ [1]

''خدا تعالیٰ نے انھیں حکومت اور حکمت و دانش عطا کی اور جو چاہتا تھا انھیں سکھایا۔''

اور سلیمانؑ کے بارے میں خود ان کی زبانی فرماتا ہے:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

'' (سلیمانؑ) نے کہا: خدایا! مجھے بخش دے اور مجھے ایک ایسی حکومت عطا کر جس کا میرے بعد کوئی مستحق نہ ہو تو بہت عطا کرنے والا ہے۔'' [2]

اس کے بعد والی آیات سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ یہ دعا قبول ہوئی اور خدا نے انھیں ایسی حکومت عطا کی جس کی گذشتہ اور آئندہ میں مثال نہیں ملتی۔ ہوا ان کے تابع تھی اور جن، دیو اور جنگلی جانور بھی ان کے لئے مسخر تھے یہاں تک کہ وہ فضا میں اڑنے والے پرندوں کو بھی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔

آل ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

''ہم نے خاندان ابراہیمؑ کو کتاب آسمانی حکمت اور ایک عظیم حکومت عطا کی (آل ابراہیمؑ میں یوسفؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ وغیرہ سب داخل ہیں)۔'' [3]

قرآن مجید ''طالوت'' (جو بنی اسرائیل کے مشہور بادشاہوں میں تھے) کے بارے میں اس زمانے کے نبی کی زبان سے بیان فرماتا ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ

''ان کے پیغمبرؑ نے ان سے کہا خدا تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا فرمانروا مقرر کیا ہے۔'' [4]

یعنی یہ عطیہ خدا کی طرف سے ہے۔ بنی اسرائیل جو حکومت کے استحقاق کے معیار سے ناآشنا تھے، اس انتخاب پر پریشان ہوئے اور خود کو طالوت سے زیادہ اس منصب کا اہل قرار دیا، کیونکہ طالوت ایک دیہاتی تھے نہ ان کے ہاں مال و دولت کی ریل پیل تھی اور نہ وہ کسی معروف

---

[1] سورۂ بقرہ/۲۵۱

[2] سورۂ ص/۳۵

[3] سورہ نساء ۵۴

[4] سورۂ بقرہ/۲۴۷

خاندان کے چشم و چراغ تھے،لیکن ان کے پیغمبر نے انھیں ان کی اس خطا سے باہر نکالا اور کہا کہ حاکمیت الٰہی کا معیار روحانی اور جسمانی قدرت ہے اور یہ دونوں طالوت میں موجود ہیں اور حکومت الٰہی کا معیار مال و دولت اور بے قدر قیمت ظاہری خصوصیت نہیں جو دنیا پرستوں کے اندر موجود ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۵۴ میں بھی رسول اکرمؐ اور ان کی آل پاک کی الٰہی حکومت کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰھُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

''کیا وہ لوگ (رسول اکرمؐ اور ان کے خاندانؑ) کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کیا ہے کی وجہ سے حسد کرتے ہیں حالانکہ ہم نے آل ابراہیمؑ کو کتاب وحکمت اور ایک عظیم حکومت عطا کی۔''

یہ تھے قرآن مجید میں حکومت کی اقسام کے چند نمونے اور اب ہم حکومت کی ان تین اقسام کی مزید تحقیق کرتے ہیں۔

انواع حکومت کی تحقیق اور ان پر تنقید

ڈکٹیٹر شپ اور آمرانہ حکومت کے مقاصد کسی پر مخفی نہیں اور پوری تاریخ میں انسانی معاشرے کو ایسی حکومت کی طرف سے سب سے زیادہ نقصان پہنچے ہیں؛ بے گناہوں کو قتل کرنا اور انھیں طرح طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنانا، محروم طبقوں کا استحصال، مختلف قسم کی غلط ترجیح اور بے عدالتی، ملکی سرمائے کو اپنی شیطانی خواہشات کے لئے خرچ کرنا وغیرہ آمرانہ حکومت کے سیاہ کارنامے ہیں؛ قرآن مجید ایک آیت میں حق مطلب ادا کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ

''خودسر بادشاہ جب کسی علاقے میں داخل ہوتے ہیں اسے فساد وتباہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت دار لوگوں کو ذلیل کرنا ہی ان کا وطیرہ ہوتا ہے!''

انفرادی اور معاشرتی استبداد (آمریت) کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ نتائج کے اعتبار سے گروہی یا معاشرتی آمریت بدتر ہوتی ہے اور اس کی واضح ترین مثال روس کی کمیونسٹ پارٹی تھی اور اس نے جو المناک سیاہ کارنامے انجام دیئے ان کی مثال نہیں ملتی۔ جمہوریت کے لباس میں ملبوس آمرانہ حکومتوں کے نقصانات بھی علانیہ آمریت سے کچھ کم نہیں ہوتے، بلکہ کئی لحاظ سے بدتر اور زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

کیونکہ لوگوں کو آمریت کے باعث نقصان وضرر کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب انھیں موقع ملے تاکہ وہ آمریت کی بساط الٹ دیں، لیکن جمہوریت کے لباس میں پوشیدہ آمریت، جیسے اکثر یورپی حکومتیں جو وسیع پروپیگنڈے اور سرمایہ دار

طبقے کی طرف سے خرچ کئے گئے بے پناہ سرمائے کے بل بوتے پر برسر اقتدار آتی ہیں، کوئی ایسی چیز نہیں کہ لوگ ان کے خاتمے کے منتظر ہوں اور ان کے خلاف شورش برپا کریں۔

رہی بات اس جمہوریت کی جو اکثریت کی نمائندہ ہوتی ہے (اگر کسی ایسی حکومت کا دنیا میں وجود ہو) تو اس قسم کی حکومت بھی مقصد تک نہیں پہنچاتی بلکہ کئی لحاظ سے ظلم وستم اور بے عدالتی کی حکومت ہے۔ چونکہ: اولاً اکثر ممالک میں جن میں ظاہری یا واقعی طور پر ایسی حکومت موجود ہے وہاں بہت سارے لوگ عملی طور پر انتخابات میں شریک نہیں ہوتے مثلاً ساٹھ، ستر فیصد یا اس سے کم لوگ انتخابات میں شریک ہوتے ہیں اور اس کے باوجود کچھ لوگ اکثریت حاصل کر لیتے ہیں جن کی معاشرے میں اکثریت نہیں ہوتی مثلاً اکتیس فیصد، انتیس فیصد کے مقابلے میں (جبکہ ساٹھ فیصد افراد نے انتخابات کے عمل میں شرکت کی ہوتی ہے، اور چالیس فیصد نے شرکت نہیں کی ہوتی) ایسی صورتحال میں جس کی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں لوگوں کی ایک قلیل تعداد زمام حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اکثریت پر مسلط ہو جاتی ہے۔ واضح ہے کہ یہ قلیل لوگ اپنے اجتماعی منافع کے مطابق سارے قوانین بنائے ہیں اور اپنے من پسند نظام کو لاگو کرتے ہیں اور یہ ایک واضح ظلم ہے۔

ثانیاً فرض کیا کہ تمام وہ لوگ جو الیکشن میں شرکت کا حق رکھتے ہیں، سب کے سب اس میں شریک ہوتے ہیں (البتہ یہ ایک فرض ہی ہے جو واقع نہیں ہوا) پھر بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ ذرا سی اکثریت کے ساتھ برسر اقتدار آ جائے (مثلاً اکاون فیصد، انچاس فیصد یا اس سے کمتر یا پیشتر کے مقابلے میں) یہ بھی درحقیقت اقلیت پر اکثریت کی آمریت اور استبداد کی ایک قسم ہے اور ایک ملک جس کی آبادی مثلاً سو ملین ہے ان میں سے انچاس ملین افراد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اکاون ملین کے تحت فرمان اور زیر تسلط ہوں اور معاشرے کی ہر چیز سے وہ اکثریت مستفید ہو، چاہے اقلیت کے لئے یہ عمل نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی وجہ سے بہت سارے مفکرین کا خیال ہے کہ اکثریت کی حکومت ایک ظالمانہ حکومت ہے، لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ اگر اسے محور قرار نہ دیں تو آخر کیا کریں؟

ثالثاً اس سے قطع نظر اگر فرض کریں کہ جمہوری حکومت میں سے ان دو اعتراضات میں کوئی ایک اعتراض بھی موجود نہیں اور ایک ایسی حکومت ہے جو لوگوں کی اکثریت کے مطابق عمل کرتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات عوام غلط تعلیم وتربیت کے نتیجے میں طرح طرح کے انحرافات میں مبتلا ہو جاتی ہے، اس قسم کے حالات میں صالح اور دانشور حضرات کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھ کر ان انحرافات کا مقابلہ کریں جبکہ صورتحال یہ ہے کہ جمہوری نظام میں اس قسم کے حالات میں نہ فقط ان کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جاتا بلکہ یہ انحرافات قانونی صورت اختیار کر لیتے ہیں جیسا کہ انگلستان اور امریکہ میں ہم جنسی کی قانونی طور پر اجازت ہے اور اسقاط حمل اور کئی دیگر برائیاں بہت سارے یورپی ممالک میں قانونی طور پر مجاز ہیں، اس لئے کہ اس قسم کے نظام میں عوامی نمائندوں کا کام عوام کی خواہشات کو نافذ کرنا ہوتا ہے نہ کہ ان کی مصلحتوں کی نگرانی اور حفاظت!

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں حکومت کی تیسری قسم یعنی صالحین کی حکومت کو تلاش کرنا چاہیے ایسی حکومت جس کی تجویز انبیاء کرام نے پیش کی ہے، اس حکومت میں اگر انتخابات بھی عمل میں آتے ہیں تو وہ بھی امام عادل کی زیر نگرانی اور صالحین کے

انتخاب کی اساس پر ہوتے ہیں۔

اس نوع حکومت میں جمہوریت پر سایہ فگن مذکورہ تین آفات کا نام ونشان موجود نہیں، اس میں نہ سرمایہ دار فاتح ہوتا ہے نہ آدھے لوگوں کی آمریت کی مصیبت درپیش ہوتی ہے اور نہ ماحول کی انحرافی خواہشات کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ واحد حکومت جسے دل وجان سے قبول کیا جاسکتا ہے۔ یہ الٰہی وخدائی حکومت ہے، رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ اور ان لوگوں کی حکومت' جو خاص شرائط کے حامل ہونے کی وجہ سے ان شخصیات کی طرف سے حق حکومت رکھتے ہیں' یقینی طور پر دنیا اس وقت تک عدالت، صلاح، خوشبختی اور سعادت کا چہرہ نہ دیکھ پائے گی جب تک اسے حکومت الٰہی کا سایہ میسر نہیں ہوتا۔

کیا حکومت انتصابی ہے یا انتخابی؟

اس سوال کا جواب مختلف نقطۂ ہائے نظر کی وجہ سے مختلف ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ جو کسی مذہب کے پیرو نہیں یا اگر مذہب کو مانتے بھی ہیں تو اسے ذاتی مسائل (عبادات وغیرہ) میں محدود کرتے ہوئے اسے (اکثر عیسائیوں کی طرح) معاشرتی مسائل سے مکمل طور پر بیگانہ قرار دیتے ہیں، اس سوال کا جواب ان کے نقطۂ نظر سے واضح ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق: حکومت کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ جمہوری اور عوامی حکومت ہو، لیکن چونکہ اس معاملے میں اتفاق رائے غالباً ناممکن ہوتا ہے پس لوگوں کی اکثریت کے ذریعے انتخاب شدہ حکام کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نظریے کے طرفدار زبردستی اور عسکری بغاوت اور زور وغلبے کے باعث برسراقتدار آنے والی حکومتوں کو بھی دل وجان سے قبول کرتے ہیں اور وہی روابط جو یہ ایک عوامی حکومت کے ساتھ رکھتے ہیں اس حکومت کے ساتھ بھی استوار کرتے ہیں اور ان کے لئے یہ اہم نہیں ہوتا کہ حکومت نے کیسے اقتدار پر قبضہ کیا ہے؟ ان کی نظر میں اگر اہم ہے تو فقط یہی کہ کون برسراقتدار ہے اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھ سکتا ہے یا نہیں؟

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی معرض وجود میں آنے والی حکومت کے آغاز میں تھوڑا سا صبر کرتے ہیں کہ دیکھیں کیا بغاوت کامیاب ہوتی ہے یا نہیں اگر کامیاب ہوگئی اور اسے قدرے استحکام نصیب ہوگیا تو مادی دنیا کی تمام حکومتیں یکے بعد دیگرے اس حکومت کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیتی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ عجیب کتاب ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' کے مؤلف کے بقول اہل سنت کے چاروں مذاہب کا یہی عقیدہ ہے کہ امامت وحکومت قہر وغلبے کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہے اور جو شخص طاقت اور زبردستی کے ذریعے اقتدار حاصل کرے وہ واجب الاطاعۃ حاکم ہے! اسے لوگوں کی بیعت کی ضرورت نہیں اور نہ ہی سابقہ خلیفہ کی طرف سے بطور جانشین نامزد ہونے کی اسے ضرورت ہے۔ [1]

اہل سنت کے معروف فقیہ امام احمد بن حنبل کے بیان میں یہ مطلب اور بھی واضح الفاظ میں ذکر ہوا ہے، ان کے نزدیک امامت

---

[1] الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۶، ص ۶۸۲

کے لیے،عدالت کی شرط نہیں ہے اور نہ ہی علم وفضل اس کی شرط ہے اور وہ ایک حدیث میں نقل کرتے ہیں :

جس کے مضمون کے مطابق ہر وہ شخص جو تلوار کے بل بوتے پر برسر اقتدار آئے وہ خلیفہ اور امیر المؤمنین ہے اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس کی امامت کا انکار کرے، چاہے وہ حاکم نیک ہو یا فاسق وفاجر! [1] ،اسی طرح کا مطلب ''منہاج السنۃ'' میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ [2]

ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ایسے عقیدے کا اظہار بے دین افراد کی طرف سے تو امکان پذیر ہے،لیکن وہ لوگ جو اسلام اور ایمان کا دم بھرتے ہیں اور حکومت کے لئے مخصوص اقدار جیسے ایمان وعدالت کی ضرورت کا اقرار کرتے ہیں وہ ایسا فتویٰ کیوں کر صادر کرتے ہیں۔لیکن اگر ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وہ خلفائے اولین اور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کے کاموں کی توجیہ اور تاویل کرتے ہوئے اور انھیں برحق ثابت کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے تو ہمیں تعجب نہیں ہوگا کہ وہ ظالم اور فاسق فاجر حکمرانوں کی کیوں تائید کرتے تھے جو تلوار کے زور پر برسر اقتدار آئے تھے۔

بہر حال اگر ہم اس مسئلے کو قرآن کی نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ حکومت پہلے درجے میں خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے،اس کے بعد ہر اس کے لئے جسے وہ حکومت عطا کرے۔قرآن مجید کی ایک آیات میں فرماتا ہے:"إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلَّهِ" یعنی:''حاکمیت اور فرمان فقط خدا کا حق ہے۔'' [3] یہی مضمون قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتا ہے۔

''حکم'' کا اس مقام پر ایک وسیع مطلب ہے جس میں حکومت اور قضاوت دونوں ہی شامل ہیں درحقیقت توحید خالقیت اور توحید حاکمیت ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں،یعنی جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ پورا عالم خدا کی مخلوق ہے تو ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ تمام مخلوق اس کی مکمل ملکیت ہے۔طبیعی بات ہے کہ اس قسم کے عالم موجودات پر ہر کسی سے پہلے اسی کی حاکمیت مطلق ثابت ہوگی، اس لحاظ سے ہر حاکمیت کے سلسلے کو اس تک جا کر ختم ہونا چاہیے اور ہر حکومت اس کے فرمان کے مطابق تشکیل پانی چاہیے اور جو کوئی اس کے اذن وفرمان کے بغیر مسند حکومت پر متمکن ہوگا تجاوزگر اور غاصب کہلائے گا! یہ نقطۂ نظر خدا کی توحید افعالی کے سرچشمے سے پھوٹتا ہے جس کی ایک شاخ توحید مالکیت وحاکمیت ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے خدا پرست لوگ مکمل طور پر آگاہ ہیں بالکل جیسے الحادی مکاتب کسی پر پوشیدہ نہیں۔(غور فرمائیں)

یہی وجہ ہے کہ ہم انبیائے خدا کو خدا کی طرف سے حقیقی حاکم سمجھتے ہیں۔اسی طرح رسول اکرمؐ نے سب سے پہلی ممکن فرصت میں،یعنی؛ آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد تشکیل حکومت کی زمین ہموار پا کر فوراً ہی حکومت تشکیل دے ڈالی۔آپؐ کے بعد بھی وہی لوگ حق حکومت رکھتے ہیں جو براہ راست یا آپؐ کے واسطے سے خدا کی طرف سے اس منصب کے لئے معین کئے گئے ہیں۔

---

[1] الاحکام السانیہ،ص ۲۰

[2] منہاج السنہ کتاب البغاۃ،ص ۵۱۸

[3] سورہ انعام۔۵۷ اور سورہ یوسف۔۴۰ و ۶۷۔

وہ متعدد روایات جو ائمہ اور رسولؐ کے جانشینوں کی تعداد واضح طور پر بارہ بیان کرتی ہیں اور جن کا تذکرہ شیعہ اور اہل سنت کی مشہور کتابوں میں ہوا ہے اور جنھیں ہم نے پیام قرآن کی گذشتہ جلد میں بیان کیا ہے۔

اس حق کو اہل بیت کے بارہ ائمہؑ کے لئے ثابت کرتی ہیں (چونکہ ان روایات کی کوئی بھی ایسی قابل قبول تفسیر نہیں ہے سوائے اس کے جسے بیان کیا گیا ہے)

اسی فکر کی بنیاد پر حضرت امام مہدیؑ کے زمانۂ غیبت میں بھی وہ لوگ حکومت کا حق رکھتے ہیں جنھیں آپؑ کی طرف سے اس ذمہ داری کے لئے خصوصی یا عمومی طور پر منصوب کیا گیا ہو۔ مذکورہ بالا سطور سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حکومت کو ایک توحید پرست مسلمان کی نظر میں عالم بالا سے معین ہونا چاہیے، یہاں تک کہ لوگوں کے جس حق کے ہم قائل ہیں اس حق کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے معین ہونا چاہیے۔ ایک خدا پرست مؤمن ارادۂ مخلوق کو؛ جب تک وہ ارادۂ خالق پر جا کر ختم نہ ہو؛ حکومت کی اساس کے طور پر ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ (غور فرمائیں)

حقیقت سے ناآگاہ بعض افراد نے لکھا ہے: ''اس واضح حقیقت کو سبھی محسوس کرتے ہیں کہ لوگوں کی اکثریت جس کسی کو حکمرانی کے لئے منتخب کرتی اور اس کی پشت پناہی کرتی ہے وہی حاکم بن جاتا ہے، کیونکہ معاشرے کی اصلی طاقت عوام ہوتے ہیں ...... یہ عوام ہی ہے جو کسی کو ولایت وامامت عطا کرتی ہے اور اس کی حکومت اور حاکمیت کو وجود بخشتی ہے۔'' توحیدی فکر و خیال کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ ہم کہتے ہیں کہ توحیدی فکر اس بیان کے برعکس مطلب کو بیان کرتی ہے اُس کے مطابق: کسی کو ولایت دینا اور اس کی حاکمیت کو وجود عطا کرنا فقط خدا کا کام ہے اور اگر اس سلسلے میں عوام کو کوئی حق حاصل بھی ہے تو اس کے اذن وزمان کی وجہ سے ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ توحیدی نظریہ، حکومت کو عالم بالا سے دیکھتی ہے جبکہ الحادی افکار نیچے سے اوپر نگاہ کرتے ہیں!

حکومت اسلامی کی ماہیت

گذشتہ بحث کے پیش نظر حکومت اسلامی کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں تحقیق زیادہ مشکل اور پیچیدہ نہیں کیونکہ توحید حاکمیت جو توحید افعالی کا ایک شعبہ ہے' کو قبول کرنے کے ساتھ ثابت ہو جاتا ہے کہ حکومت کا حق ذاتی طور پر خدا کو حاصل ہے اس کے بعد ہر اس کے لئے ثابت ہے جسے وہ اس منصب کا اہل قرار دے۔ اس لحاظ سے اسلامی حکومت نہ آمرانہ حکومت ہے نہ جمہوری بلکہ حکومت کی ایک اعلیٰ اور برتر قسم، یعنی خدائی اور الٰہی حکومت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کی آراء اور ان کے مشورے کا حکومت کی تشکیل میں کوئی کردار نہ ہو اور ان کی طرف سرے سے توجہ ہی نہ کی جائے۔

اس لئے کہ خدا جو 'مالِكُ الْمُلوك'' اور ''أحْكَمُ الحاكِمِينَ'' ہے جب مشورے اور لوگوں کی آراء پر توجہ دینے کا حکم دے رہا ہے تو ان امور کو بھی مشروعیت اور جواز حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی دو آیتوں میں واضح طور پر شوریٰ کا حکم دیا گیا ہے۔

سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۸ میں' کہ اسی آیت کی وجہ سے اس سورے کا نام ''شوریٰ'' رکھا گیا ہے' قرآن مجید اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والے مومنین کی سات واضح صفات کو بیان کرتے ہوئے جن میں سے ایک اہم امور میں باہمی مشورہ ہے، فرماتا ہے: ''وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ'' ''ان کے اُمور باہمی مشورے سے تشکیل پاتے ہیں۔'' اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں اس سے بھی بڑھ کر مومنین کے بارے میں رسول اکرمؐ کو تین اہم تاکیدات کی گئی ہیں جن میں سے ایک حکم اہم امور میں ان کے ساتھ مشاورت ہے؛ ارشاد حق تعالیٰ ہے: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ'' ''اہم امور میں ان کے ساتھ مشورہ کرو''۔

پس فرمان خدا کے مطابق لوگوں کی آراء کا احترام کرنا شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری جانب سے رسول اکرمؐ اور ان کے معصوم جانشین اور علماء جو ولی فقیہ کے عنوان سے اپنی شرعی حیثیت کو حاصل کرتے ہیں اس بات پر مامور ہیں کہ وہ بندگان خدا کی مصلحتوں کو ہر جگہ اپنی توجہ کا مرکز قرار دیں اور یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ لوگوں کی مصلحت تقاضا کرتی ہے کہ وہ بھی کسی نہ کسی طرح حکومت کے امور میں شریک اور حصہ دار ہوں اور ان کی آراء پر توجہ دی جائے، اس لحاظ سے لوگوں کی آراء پر توجہ دینا ایک الٰہی رخ اختیار کر لیتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں حکومت الٰہی اسی وقت متناسب اور ہم آہنگ ہوتی ہے جب وہ عالم بالا سے نافذ العمل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو اور اس صلاحیت کو لوگوں کی امور حکومت میں شرکت کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا، درحقیقت احکام الٰہی کا جاری اور نافذ کرنا واجب ہے اور لوگوں کی امور حکومت میں شرکت اس واجب کا مقدمہ شمار ہوتا ہے اور مقدمۂ واجب، واجب ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حکومت اسلامی کا جوہر حکومت الٰہی ہے، لیکن یہ حکومت آخر کار عوامی حکومت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے، انبیاء کرامؑ، ائمہ اطہارؑ اور ان کے جانشینوں کی اور نامزدگی الٰہی حکومت کے جوہر کو جبکہ ان حضرات کا لوگوں کے ساتھ مشورہ اور ان کی آراء کا احترام (کہ یہ بھی خدا کے حکم سے ہے)

حکومت الٰہی کے عوامی جوہر کو تشکیل دیتا ہے۔

وہ لوگ جن کا خیال یہ ہے کہ اسلامی حکومت مکمل طور پر لوگوں کی آراء (ووٹ) پر اعتماد کرتی ہے اور وہ اس کے الٰہی عنصر کو فراموش کر دیتے ہیں وہ بھی غلط سوچ رکھتے ہیں، اور وہ لوگ جو فقط الٰہی پہلو کو مدنظر رکھتے ہیں اور عوامی رائے اور مشورے کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ بھی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ آنے والی ابحاث یعنی بیعت اور شوریٰ کی ابحاث میں اس بارے میں مزید تفصیلی گفتگو ہوگی۔ بہرحال اس حقیقت سے کس طرح انکار کیا جاسکتا ہے کہ اس حکومت میں عوام کی شرکت حکمرانوں کو طاقت اور قوت بخشتی ہے اور ان کی شرکت کے بغیر ان سے کوئی کام بر نہیں آتا، چنانچہ امیر المؤمنینؑ خطبہ شقشقیہ میں فرماتے ہیں:

اَما وَ الَّذی فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَءَ النَّسَمَةَ لَوْلا حُضُورُ الْحاضِرِ وَ قیامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النّاصِرِ وَ ما اَخَذَاللهُ عَلَی الْعُلَماءِ اَلّا یُقارُّوا عَلی کِظَّةِ ظالِمٍ وَلا سَغَبِ مَظْلُومٍ لَاَلْقَیْتُ حَبْلَها عَلی غارِبِها:

''آگاہ رہو اس خدا کی قسم جس نے دانے کو پھاڑا اور انسانوں کو پیدا کیا، اگر بہت سارے لوگ میرے گرد جمع نہ ہوئے ہوتے اور وہ میری مدد کے لئے اٹھ کھڑے نہ ہوتے اور اس طرح مجھ پر حجت تمام نہ ہو چکی ہوتی، اگر خدا کا وہ عہد جو اس نے علماء اور اہل دانش سے لیا ہے کہ ظالوں کی پرخوری اور مظلوموں کے فاقوں کی نسبت خاموش نہ رہیں تو میں ناقۂ خلافت کی مہار کو چھوڑ دیتا اور اس سے منہ پھیر لیتا۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۳)

یہ تعبیر اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ عوامی حمایت خدا کی طرف سے منصوب ولی کے لئے بھی اتمام حجت کا باعث بن جاتی ہے۔ بلاشبہ آنجنابؑ کی ولایت خدا کی طرف سے رسول اکرمؐ کے ذریعے ثابت شدہ تھی اور یہ ولایت اس وقت بھی موجود تھی۔ اس کے برعکس بعض ناآگاہ افراد کا کہنا یہ ہے کہ آپؑ کی ولایت اس وقت ثابت نہیں تھی لیکن عملی اور نافذ العمل ہونے کے اعتبار سے لوگوں کی حمایت کی محتاج تھی اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ فقہاء اسلام کے بارے میں بھی جیسا کہ کہا جائے گا؛ تمام فقہاء کے لئے ولایت ثابت ہے، لیکن اس ولایت کو عملی جامہ پہنانا فقط اس صورت میں میسر ہے جب اس ولایت کو لوگوں کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ولی فقیہ جو لوگوں کی آراء حاصل کر سکے دوسرے فقہاء کی نسبت ترجیح کا حامل قرار پائے گا کیونکہ وہ دوسروں کی نسبت بہتر طور پر اپنی ولایت کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے، جبکہ دوسرے حضرات ایسا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں (اس کی مزید تفصیل انشاءاللہ اپنے مقام پر آئے گی)۔

اس لحاظ سے اگر اس قسم کے مقامات پر انتخابات کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں کہ یہ منصب انھیں لوگوں کی طرف سے ملتا ہے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ توحیدی نقطۂ نظر سے حق ولایت فقط خدا تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے اور یہ منصب ان لوگوں کے لئے ہے جنھیں خدا نے بغیر واسطے کے یا اپنے اولیاء (ائمہ) کے ذریعے معین فرمایا ہے اور لوگوں کی آراء کو اصیل اور حقیقی قرار دینے اور حکومت کے جوہر الٰہی کی نفی کرانے کا سرچشمہ مشرکانہ اور غیر توحیدی نظریات ہیں۔ مراد یہ ہے کہ لوگ فقہاء میں سے کسی ایسے ایک فرد کی

حمایت کرتے ہیں جو دوسروں کی نسبت زیادہ لائق باصلاحیت اور جامع تر ہوتا ہے۔ اگر انتخاب کرنا لوگوں کا کام ہوتا تو لازم نہیں تھا کہ فقہاء ہی میں سے کسی کو انتخاب کریں بلکہ وہ جسے چاہتے انتخاب کر سکتے تھے چاہے وہ فقیہ ہوتا یا غیر فقیہ۔

مختصر یہ کہ لوگ کسی کو مسند حکومت پر نہیں بٹھاتے کیونکہ یہ خدا کا مخصوص حق ہے، لوگ فقط یہ کام کرتے ہیں کہ ان افراد میں سے جن کو خدا نے حق ولایت دیا ہے، کسی ایک کو انتخاب کر کے اس کی حمایت اور پشت پناہی کرتے ہیں اور اگر اسے انتخاب سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو اس کا مفہوم وہ نہیں جو مادہ پرست دنیا کے انتخاب کا ہوتا ہے اور قرائن وشواہد اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ دو مختلف قسم کے انتخابات ہیں۔ (غور فرمائیں)

اس بناء پر جیسا کہ امیر المؤمنین علیؑ لوگوں کی بیعت سے قبل ولی خدا تھے جیسا کہ آیت ولایت واضح طور پر دلالت کرتی ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ '(مائدہ/۵۵)

کہ یہ ولایت خدا نے علیؑ کو عطا کی اور جملہ "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ" میں رسول اکرمؐ نے خدا تعالیٰ کی طرف سے آپؑ کو اس منصب پر فائز کیا، لیکن لوگوں کا دوسروں کی بیعت کر لینا اس بات کا سبب بنا کہ آپؑ ایک عرصے تک اپنی ولایت کو عملاً نافذ نہ کر سکے اور فقط اس وقت ولایت کے عملی ہونے کا سامان فراہم ہوا جب لوگوں نے آپؑ کی بیعت کر لی، جی ہاں! لوگوں نے اس ولایت کے نفاذ کی راہ ہموار کی نہ یہ کہ انھوں نے آپؑ کو مقام ولایت پر پہنچایا۔

فقہاء سے متعلق بھی صورتحال یہی ہے وہ ان دلائل کے مطابق، جن کا ذکر آئندہ ہوگا، اگر اجتہاد اور عدالت کے علاوہ اچھے منتظم، مدبر اور زمانے کے احوال سے آگاہی کی شرائط کے حامل ہوں تو ان کے لئے خدا کی طرف سے ولایت ثابت ہے، لیکن اس ولایت کی عملی صورت اسی وقت ممکن ہے جس کے لئے مقدمات کی ضرورت ہے جن میں سے ایک اہم مقدمہ عوامی حمایت ہے۔ رسول اکرمؐ بھی جب مکہ میں تھے حکومت الٰہی نہ تشکیل دے سکے، بلکہ جب مدینہ میں داخل ہوئے اور انھیں کافی مقدار میں عمومی حمایت میسر آئی اور رکاوٹیں دور ہوئیں تو پھر آپؐ نے حکومت کی بنیاد رکھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رسول اکرمؐ مکہ میں ولایت سے محروم تھے اور مدینہ میں لوگوں کی طرف سے آپؐ کو ولایت حاصل ہوئی۔ (غور فرمائیں)

ولایت خبری اور انشائی؟

بعض لوگوں کی رائے میں جن علماء نے مسئلہ ولایت فقیہ پر گفتگو کی ہے وہ دو مختلف نظریوں کے حامل ہیں۔ بعض نے ولایت کو بمعنی خبری قبول کیا ہے جبکہ بعض اس کے مفہوم انشائی کے قائل ہیں اور یہ دونوں مفہوم اپنی حقیقت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چونکہ پہلا مفہوم یہ کہتا ہے: عادل فقہاء خدا تعالیٰ کی طرف سے ولایت پر منصوب ہیں جبکہ دوسرا یہ کہتا ہے کہ لوگ ضروری شرائط کے حامل فقیہ کو ولی فقیہ کے طور پر انتخاب کریں۔ لیکن ہماری رائے میں یہ تقسیم بے بنیاد ہے، کیونکہ جس قسم کی بھی ولایت ہو وہ انشائی ہی ہے، خواہ خدا تعالیٰ

اسے انشاء کرے (وجود بخشے) یا رسول اکرمؐ یا ائمہ طاہرینؑ، مثلاً امامؑ یہ فرمائیں: اِنّی قَدْ جَعَلْتُهُ حاکِماً: میں اس فقیہ کو جو ایمان وتقویٰ کی شرائط کا حامل ہے، ولایت اور حکومت پر منصوب کرتا ہوں یا بالفرض لوگ اسے منتخب کریں اور حکومت وولایت کو اس کے لئے انشاء کریں۔

دونوں قسمیں انشائی ہیں، فرق صرف اس بات میں ہے کہ ایک جگہ انشاء حکومت خدا کی جانب سے ہے اور دوسری جگہ لوگوں کی طرف سے، اور ''خبری ہونا'' اس جگہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کلام کا متکلم اخبار (خبر دینے) اور انشاء (وجود بخشنے) کے درمیان فرق کو صحیح طور پر نہیں سمجھ پایا، یا اگر ان دو اصطلاحوں سے آگاہ بھی ہے تو اس نے حقیقت سے چشم پوشی کی ہے۔

صحیح تعبیر اور مفہوم یہ ہے کہ ولایت ہر صورت میں انشائی ہے اور ولایت ان مقامات ومناصب میں سے ہے جو انشاء کے بغیر وجود حاصل نہیں کر سکتے، فرق صرف اس میں ہے کہ اس مقام کو انشاء اور عطا کرنا ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف ہو یا لوگوں کی طرف سے، توحید پرست مکاتب فکر اس (ولایت کو) خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں (اور جس جگہ بھی لوگوں کی طرف سے ہو ضروری ہے کہ پھر بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو) جبکہ الحادی مکاتب اسے بہر حال لوگوں کی طرف سے خیال کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے جھگڑا ''اخبار'' و ''انشاء'' کا نہیں، نزاع اس بات میں ہے کہ کون (ولایت کو) انشاء کرے، خالق یا مخلوق؟ بالفاظ دیگر حکومت اسلامی کی شرعی حیثیت کی بنیاد آیا حکومت کے سارے سلسلۂ مراتب میں خدا کا اذن اور اس کی اجازت ہے یا لوگوں کی اجازت اور ان کا اذن؟ مسلم ہے کہ الٰہی نقطۂ نظر کے ساتھ جو سازگار ہے وہ پہلی صورت ہے نہ کہ دوسری۔

حکومت اور وکالت

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ عوامی حکومت ایک قسم کی وکالت ہے نہ کہ کسی منصب کا عطا کرنا، اس لئے کہ مالک الملوک خدا ہے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کس کو یہ منصب بطور ہدیہ عطا کرے۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح ذاتی اور نجی امور میں ہر ایک کو حق حاصل ہے کہ وہ کس شخص کو اپنا وکیل مقرر کرے اور یہ عمل قطعاً جائز ہے، اسی طرح اجتماعی اور معاشرتی امور میں بھی ممکن ہے کہ لوگ کس کو اپنا وکیل مقرر کریں جو ان کی طرف سے اجتماعی امور کا انتظام کرے اور جب تک یہ وکالت باقی ہے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے نتائج کو قبول کریں۔

لیکن یہ بات کئی وجوہات کی بناء پر صحیح نہیں کیونکہ **اولاً:** معاشرے کا وکیل کیا حق رکھتا ہے کہ وہ اقلیت کے امور میں بھی مداخلت کرے فرض کریں کہ اکاون ملین افراد نے کسی کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے اور انچاس ملین افراد نے کسی دوسرے کو، پس کون سی دلیل کی بنیاد پر اکاون ملین افراد کا وکیل انچاس ملین افراد کے امور میں مداخلت کر سکتا ہے۔

ثانیاً: دنیا کے بہت سے انتخابات میں کسی وجہ سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کرتی اور وہ کسی کو اپنے وکیل کے طور پر منتخب نہیں کرتے کیا لازم ہے کہ وہ دوسروں کے اختیار کردہ وکیل کی پیروی کریں؟!

ثالثاً: کسی عقد اور معاملے کی وکالت جائز ہے اور موکل جب بھی چاہے وکیل کو وکالت سے معزول کرسکتا ہے، جبکہ دنیا کے سیاسی نظام میں لوگ اپنے نمائندوں یا صدارت کے لئے منتخب افراد کو ہرگز معزول نہیں کرسکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کے مسئلے کو اس قسم کے عنوانات کے تحت جگہ نہیں دی جاسکتی، جمہوریت کی ایک حقیقت و ماہیت ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے اور درحقیقت ایک قسم کا اجتماعی معاہدہ ہے جس کا سرچشمہ ضرورت ہے، کیونکہ معاشرہ بہرحال ایک حکومت کا خواہاں اور طلبگار رہتا ہے اور دوسری جانب سے لوگوں کا اتفاق نظر اس مسئلے میں ممکن نہیں، پس بے چارگی اور مجبوری کی حالت میں اکثریت کی رائے کے پیچھے چلنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اقلیت اکثریت کے سامنے سر تسلیم خم کرے، چونکہ کہ ان کے پاس معاشرے کے انتظام اور تدبیر کی اس کے علاوہ کوئی راہ موجود نہیں اگرچہ یہ عمل مکمل طور پر عدل وانصاف پر مبنی نہیں۔

رہی بات ان لوگوں کی جو حکومت کو خدا کی طرف سے عطیہ قرار دیتے ہیں تو وہ ایک دوسری راہ کی تجویز پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ دیکھیں کہ خدا تعالیٰ نے حکومت کس کے اختیار میں دی ہے؟ اگرچہ لوگوں کے نقطۂ نظر مختلف ہوں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انتخابی امیدوار اسلامی تعلیم، لیاقت اور شائستگی کے اعتبار سے متعدد ہوں۔

ایسے میں لوگوں کی رائے قابل قبول فرد کے تعیین اور انتخاب میں سرنوشت ساز ہوسکتی ہے اور اس امیدوار کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہوجاتی ہے جسے اپنی حکومت کے نافذ العمل ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ عوامی حمایت حاصل ہو۔ بیعت سے مربوط مسائل اس مسئلے کو واضح تر کردیتے ہیں، انشاء اللہ حکومت میں بیعت کے کردار اور بیعت کی شرائط اور اس کی ماہیت وحکومت کے بارے میں آئندہ ابحاث میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی۔

قرآنی نقطہ نظر سے دین اور حکومت کا تعلق

یورپی ممالک میں سیاست سے دین کی جدائی کا نعرہ بہت رائج ہے، بلکہ شاید ان کے مسلمات میں سے ہے یہی وجہ ہے کہ حکومت اسلامی جس میں دین اور سیاست آپس میں مخلوط ہوتے ہیں، کی تشکیل سے وہ وحشت اور دکھ محسوس کرتے ہیں اور اس کی دو وجوہات ہیں:

۱۔ وہ دین وآئین جو مغربی معاشروں میں موجود ہے، دین عیسائیت ہے اور معلوم ہے کہ یہ دین وقت کے ساتھ ساتھ بے پناہ تحریفات کے نتیجے میں مکمل طور پر انفرادی اور خالق ومخلوق کے رابطے کی صورت اختیار کر گیا ہے، جس کی تعلیمات صرف چند ایک اخلاقی نصیحتوں پر مشتمل ہیں اور اس دین کی مذکورہ تعلیمات کا معاشرتی اور سیاسی مسائل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ان معاشروں میں دیندار اور بے دین افراد میں فرق یہ ہے کہ دیندار چند اخلاقی مسائل کا پابند ہوتا ہے اور ہفتے میں ایک بار چرچ جاتا اور کچھ وقت دعا اور مناجات میں گذارتا ہے، لیکن لادین افراد ان اخلاقی مسائل کے پابند نہیں ہوتے (اگرچہ وہ ان اخلاقی مسائل کی انسانی نہ کہ دینی قدر وقیمت کے عنوان سے احترام کے قائل ہیں) اور ہرگز چرچ کا رخ نہیں کرتے۔

۲۔ عیسائیوں کو اہل کلیسا (چرچ) کی حکومت کی طرف سے وہ دردناک واقعات جو قرون وسطیٰ میں ''تفتیش عقائد'' کے دوران پیش آئے اس بات کا سبب بنے کہ وہ دین کو ہمیشہ کے لئے سیاست سے جدا کر دیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ: ارباب کلیسا نے قرون وسطیٰ (درمیانی صدیوں) میں یورپ کے لوگوں کے تمام اجتماعی اور سیاسی امور کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور پوپ صاحبان اسی براعظم کے تمام لوگوں پر پوری ٹھاٹھ کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔ آخر کار یہ حکومت خودغرضی خود،سری اور یکسر آمریت میں تبدیل ہوگئی۔

یہاں تک کہ اس نے ہر علمی تحریک کی شدید مخالفت کی اور ہر علمی پیشرفت کو مذہب کے خلاف قرار دے کر دبا دیا اور ''عقائد کی تفتیش'' کے نام سے عدالتیں تشکیل دے کر بے شمار لوگوں کو ان عدالتوں میں پیش کیا اور ان کے خلاف کاروائی انجام دی، بعض لوگوں کا سرتن سے جدا کر دیا، بعض کو زندہ حالت میں نذر آتش یا زندان کے سپرد کیا جن میں سے اکثر علماء طبیعیات تھے، تمام بادشاہ ان ارباب کلیسا سے احکام لیتے اور ان کی مکمل اطاعت کرتے تھے! اس کے علاوہ انھوں (اہل کلیسا) نے بے پناہ مال ودولت جمع کر رکھی تھی اور اپنے لئے بڑی عیش وعشرت کے سامان فراہم کر رکھے تھے۔

ان سارے امور نے لوگوں کو ان کے خلاف شورش پر مجبور کیا، خاص طور پر سائنسی علوم کے علماء نے ان کے خلاف سخت موقف اختیار کیا اور دین وسیاست کی جدائی اور سائنس ودین میں تضاد کا نعرہ ہر طرف سے گونجنے لگا، اس کے بعد اس گروہ کی کامیابی کے ساتھ ہی کلیسا اور اس کے حکمرانوں کو معاشرے اور حکومت سے نکال باہر کیا گیا اور فقط ایک ہی ملک جس میں کلیسا کی بادشاہت قائم رہی ''واٹیکان''

ہے جو اس قدر چھوٹا ہے کہ اس کا رقبہ ایک مربع کلومیٹر سے بھی کم ہے یعنی ایک چھوٹے سے گاؤں کے برابر۔[1]

یہ سب وہ تبدیلیاں تھیں جو ان خاص حالات میں یورپ میں رونما ہوئیں۔ بعدازاں جب اسلامی ممالک سے طلباء پڑھنے کے لئے یا تاجر لوگ تجارتی اغراض سے یورپ گئے تو واپسی پر اس طرز فکر کو مشرق کی اسلامی دنیا میں سوغات کے طور پر لائے یعنی وہ اسلام اور تحریف شدہ عیسائیت کے درمیان عظیم تفاوت اور فرق کو سمجھے بغیر اور اسلامی ممالک پر حاکم ثقافت اور کلیسا کی ثقافت کے بارے میں سوچے بغیر دین اور سیاست میں جدائی کا نعرہ بلند کرنے لگے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ بعض اسلامی ممالک نے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اس سازش کے سامنے اپنے سرخم کر دیئے ہیں اور اسے ایک بنیادی قانون کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ توجہ رہے کہ مغربی حکومتوں نے جو ہمیشہ اسلام کی طاقت سے ہراساں رہی ہیں اور ہیں، اس مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے اور مغرب زدہ ممالک مثلاً ترکی نے اسے اپنے لیے امتیازی عنوان قرار دیا ہے اور ایک سیکولر (غیر مذہبی) حکومت تشکیل دے رکھی ہے۔ یہ سب کچھ اس حال میں رونما ہوا جب بہت سارے اسلامی ممالک اور امت اسلامی کے بیدار، مسلمان افراد اس سازش کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، وہ سازش جو اس بنیاد پر استوار کی گئی کہ مسلمانوں کو اسلام سے جدا کر کے اسے آج کل کی عیسائیت کی طرح قرار دے۔ جس میں خالق اور مخلوق کا ظاہری تعلق ہو اور جس کا اجتماعی اور معاشرتی مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ایران میں آنے والا اسلامی انقلاب کامیاب ہوا اور ایک اسلامی انقلابی حکومت کی تشکیل ہوئی تو تمام اہل یورپ حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ زمام حکومت مذہب کے ہاتھوں میں ہو؟ کیا ممکن ہے کہ دین ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کر سکے؟ بعدازاں جب انھوں نے دیکھا کہ اس حکومت کی جڑیں مضبوط اور یہ مزید اور پائیدار ہو چکی ہو تو اسے سرحدی دیواروں میں محدود کرنے کی کوشش کرنے لگے تاکہ یہ دوسرے اسلامی ممالک کے لئے نمونہ اور مثال نہ بن سکے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے بے تحاشا تخریبی کاروائیاں شروع کر دیں جن کی تفصیل اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں سے میں دیکھی جا سکتی ہے۔

خوش بختی سے اہل مغرب کی یہ سازشیں ناکام ثابت ہوئیں اور اب حکومت اسلامی کی تاسیس و تشکیل کی فکر اسلامی دنیا کے اکثر ممالک یعنی براعظم ایشیا اور افریقہ میں ایک زندہ و نجات بخش فکر کے طور پر سے رونما ہونے لگی ہے اگر چہ اہل مغرب کا رویہ ان افکار کو روکنے کے لئے نہایت شدت کا حامل رہا ہے اور وہ اس سلسلے میں انواع و اقسام کے الزامات اور جھوٹے پروپیگنڈے سے قطعاً گریز نہیں کرتے۔

البتہ یہ کہ اسلام اصولی، فروعی اور تاریخی اعتبار سے کس طرح مسئلہ حکومت کے ساتھ مخلوط ہے، کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں اور جو شخص قرآن مجید اور سنت رسولؐ و ائمہ معصومینؑ کا مطالعہ کرے اور اسی طرح تاریخ اسلام پر بھی غور کرے تو واضح طور پر اسے اس بات کا علم ہو

---

[1] لغت نامہ دھخدا اور فرہنگ معین میں واٹیکان کا رقبہ ۴۴ ہیکٹر بیان کیا گیا ہے (جو نصف کلومیٹر مربع سے بھی کم ہے) اور ذرائع کے مطابق اس کی آبادی ۵۲۵ اور بعض کے مطابق ۷۰۰ یا ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے دراصل یہ ملک کلیسا اور اس کا انتظام چلانے والے اداروں کی عمارات پر مشتمل ہیں، واٹیکان کا اپنا ریلوے سٹیشن، ڈاکخانہ اور ریڈیو سٹیشن ہے۔ یہ مستقل اور علیحدہ حکومت ہے جس کا اپنا قانون ہے اور پوپ کے دربار میں تقریباً ۵۰ ملکوں کی نمائندگی موجود ہے۔ قابل توجہ یہ کہ یہ ملک اٹلی کے دارالحکومت روم کے عین واسط میں واقع ہے (لغت نامہ دھخدا، فرہنگ معین اور المنجد فی الاعلام)۔

جائے گا کہ حکومت اور سیاست کو اسلام سے جدا کرنا ایک ناممکن عمل ہے۔ جس کا مطلب اسلام کو اسلام سے جدا کرنا ہے!

اس بات کی شاہد ہر چیز سے پہلے خود تاریخ اسلام ہے جیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد رسول اکرمؐ نے جو پہلا کام انجام دیا وہ اسلامی حکومت کا قیام تھا، آپؐ بخوبی جانتے تھے کہ انبیاء کرامؑ کی نبوت اور بعثت کے مقاصد یعنی تعلیم وتربیت، عدل وانصاف کا قیام اور انسان کی عظمت وسعادت وغیرہ کو حکومت تشکیل دیئے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا، یہی سبب ہے کہ آپؐ نے سب سے پہلی ممکنہ فرصت میں خدا کے فرمان کے مطابق حکومت کی بنیاد رکھی۔ آپؐ نے ایک لشکر تشکیل دیا جس میں مہاجرین وانصار شریک تھے اور (عورتوں، بچوں اور اپاہجوں کو چھوڑ کر) ہر عمر کے ہر شخص کے لئے اس میں شریک ہونا لازمی تھا، اس چھوٹے سے لشکر کے لئے اسلحہ، سواری اور راشن کی فراہمی خود لوگوں کی ذمہ داری تھی اور کچھ حصہ حکومت اسلامی کے ذمے تھا، اور جس قدر خود سر دشمنوں کے خلاف جنگ کا دامن وسیع ہوتا اسی قدر اسلامی لشکر کی تنظیم وتشکیل وسیع تر ہوتی چلی جاتی۔

(اسی اثناء میں) زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم نازل ہوا اور پہلی بار جنگی اخراجات اور محروموں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے بیت المال وجود میں آیا۔ قضاوت اور جرائم کی سزاؤں کے بارے میں (احکام) یکے بعد دیگرے نازل ہوئے اور حکومت اسلامی جدید مراحل میں داخل ہوگئی۔ اگر اسلام میں حکومت نہیں ہے تو فوج، بیت المال، قضاوت اور مجرموں کی سزا کے نظام کا کیا معنی مراد لیا جا سکتا ہے۔ یہی وضع اور صورتحال ابتدائی خلفاء، اموی اور عباسی خلفاء کے ادوار میں بھی جاری رہی اور ان لوگوں نے رسول اکرمؐ کا خلیفہ ہونے کے دعویٰ کے ساتھ لوگوں پر حکومت کی، اگر چہ ان کی حکومت ظالمانہ اور قوانین اسلامی کے دائرے سے خارج تھی، لیکن جو کچھ بھی تھا بہر حال اس بات کی علامت تھا کہ حکومت کی تشکیل اسلام کا ابتدائی اور بنیادی مسئلہ ہے۔

ائمہ طاہرینؑ پر کی جانے والی سختیاں، امام حسینؑ کا ظلم کے خلاف قیام، امام علی بن موسیٰ الرضاؑ کی ولایت عمومی، امام موسیٰ کاظمؑ کی اسیری، امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کی سامرا میں جلاوطنی اور حکومت کے خلاف قیام کے خوف سے ان کی نظر بندی اور نگرانی یہ سب امور بخوبی ظاہر کرتے ہیں کہ ائمہ معصومینؑ عدل الٰہی پر مبنی حکومت کی تشکیل کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور انھوں نے اس کی خاطر ہر مناسب فرصت سے استفادہ کیا اور ان کے دشمن بھی اس واقعیت سے پوری طرح واقف تھے۔ اگر اسلام موجودہ عیسائیت کی طرح چند اخلاقی احکام ہی میں محدود ہوتا تو تاریخ اسلام میں موجود ان واقعات کا کوئی مفہوم نہ ہوتا کیونکہ کوئی بھی ایک سادہ سے معلم اخلاق، گوشہ نشین زاہد یا اس راہنما کی جو فقط با جماعت نماز پڑھانے پر اکتفا کرے اتنی شدید مخالفت نہیں کرتا۔

معارضہ اور مخالفت اسی وقت شروع ہوتی ہے جب حکومت کا معاملہ درپیش ہو، ادھر سے بہت سارے احکام جو قرآن مجید میں ذکر ہوئے ہیں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ حکومت کا ہونا ضروری ہے جس کی حدود میں رہ کر ان پر عمل کیا جائے، دوسرے لفظوں میں یہ احکام، سیاسی احکام ہیں اور اسلامی معاشرے کی سیاسی روش کو معین کرتے ہیں۔ مسئلہ جہاد مجاہدین کے فرائض اور جنگی مال غنیمت اور شہیدوں اور اسیروں کے بارے میں قرآن کی بہت ساری آیات ہیں، کیا اس قسم کے مسائل کا دائرہ حکومت سے باہر ہونا، قابل توجیہ ہے؟ قرآن کی بہت ساری آیات قاضی کے فرائض، قضاوت کے احکام، حدود کے جاری کرنے اور قصاص وغیرہ کی طرف ناظر ہیں جبکہ بہت ساری آیات

کی نگاہ بیت المال کی طرف ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، زبانی امر ونہی کی صورت میں تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے،لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وہ مراحل جن میں سختی اور بعض اوقات مسلحانہ کاروائی کی ضرورت پڑتی ہے،حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہوتے۔

معاشرتی عدالت،عدل وانصاف اور ساری دنیا میں تبلیغ کی آزادی محض اخلاقی نصیحتوں کے ذریعے انجام نہیں دی جاسکتی، یہ فقط حکومت ہی کا کام ہے کہ وہ میدان میں آئے اور مظلوموں کو ظالموں کے چنگل سے نجات دلائے اور استحصال شدہ افراد کے حقوق استحصال گروں سے واپس لے اور توحید کی صدا کو ذرائع ابلاغ کے توسط سے پوری دنیائے انسانیت کے کانوں تک پہنچائے۔

اسی مضمون پر مبنی بیانات،سنت رسول اکرمؐ اور روایات ائمہ طاہرینؑ میں وسیع انداز میں ذکر ہوئے ہیں جو فقہ اسلامی اور کتب فقہی کے ایک بڑھے حصے کو تشکیل دیتے ہیں اور اگر ہم چاہیں کہ (حکومت کے متعلق) ان مسائل کو روایات اور فقہی کتابوں سے جدا کردیں تو اسلامی کتابوں میں کوئی قابل ذکر چیز باقی نہیں رہتی۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارۃً کہا جا چکا ہے کہ فقہی کتابوں یعنی فقہ کو تین حصوں ''عبادات''،''معاملات''اور''سیاسیات''،میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

''عبادات''مخلوق اور خالق کے درمیان رابطے پر مشتمل ہیں۔

''معاملات''لوگوں کی آپس میں رابطے پر مشتمل ہیں۔

جبکہ''سیاسیات''لوگوں کے حکومت کے ساتھ رابطے کا نام ہے۔

لیکن اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ فقط سیاست ہی حکومت تشکیل دیئے بغیر ممکن نہیں بلکہ معاملات بھی حکومت کے بغیر نہیں چل سکتے چونکہ اگر ان کی انجام دہی پر حکومت کی نگرانی نہ ہو تو بہت زیادہ حرج ومرج پیدا ہوسکتا ہے محروم اور استحصال شدگان کے حقوق پائمال ہوجاتے ہیں اور معاشرہ امیر وغریب دو طبقوں میں بٹ جاتا ہے اور انواع واقسام کی مصنوعی قلت لوگوں کی پریشان حالی کا باعث بنتی ہیں۔ یہاں تک کہ عبادات بھی ایک طاقتور اور عادل حکومت کے بغیر بے سروسامانی کا شکار ہوسکتی ہیں ان میں سے ایک اہم عبادات حج ہے جس کا سیاسی پہلو نہایت قوی ہے۔

نماز جمعہ ایک اور اہم عبادت ہے جس میں لوگوں کے تمام طبقوں کی وسیع شرکت کے ساتھ ساتھ اس کے خطبوں میں درپیش اہم سیاسی، اجتماعی (معاشرتی) اور ثقافتی مسائل کو بیان کیا جاتا ہے۔رات دن میں برپا کی جانے والی نماز جماعت بھی اس مضمون سے خالی نہیں اگرچہ اس کا سیاسی پہلو اتنا واضح نہیں۔

سورۂ حج کی آیت ۴۱ ان مسائل کی طرف ایک لطیف اشارہ کرتے ہوئے بیان فرماتی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط

یعنی:''وہ (مردان خدا) ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین پر طاقت اور حکومت عطا کریں تو نماز قائم

کرتے ہیں، زکات ادا کرتے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری پوری کرتے ہیں۔"

مذکورہ بیان کے پیش نظر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اسلامی تعلیمات کو سیاسی مسائل سے جدا کرنا ممکن نہیں اور مغرب میں لگایا جانے والے اس نعرے کی سیاست مذہب سے جدا ہے، مشرق (اسلامی ممالک) میں بالکل کوئی وقعت نہیں اس بحث کو ہم امیر المؤمنین علیؑ کی ایک جامع اور جاذب نظر حدیث کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں: جب "ابوالدرداء" اور "ابوہریرہ" حضرت علیؑ کے نام معاویہ کا خط لے کر آئے جس میں آپؑ سے درخواست کی گئی تھی کہ قاتلان عثمان کو ان لوگوں کے سپرد کیا جائے تاکہ وہ (معاویہ) ان قاتلوں کی سزا دے سکے۔ امامؑ نے فرمایا: معاویہ نے جو کچھ کہا ہے تم نے وہ مجھے پہنچا دیا ہے، اب ذرا غور کے ساتھ میری باتیں سنو اور انھیں معاویہ تک پہنچا دو اور اس سے کہو:

اِنَّ عُثْمانَ بْنِ عَفَّانَ لایَعْدُوا اَنْ یَکُونَ اَحَدَ رَجُلَیْنِ: اِمّا اِمامُ هُدًی حَرامُ الدَّمِ وَ واجِبُ النُّصْرَةِ لاتَحِلُّ مَعْصِیَتُهُ وَلا یَسَعُ الاُمَّةَ خِذْلانُهُ، اَوْ اِمامُ ضَلالَةٍ حَلالُ الدَّمِ، لاتَحِلُّ وَلایَتُهُ وَلا نُصْرَتُه، فَلا یَخْلُوا مِنْ اِحْدَی الخَصْلَتَیْنِ وَالْواجِبُ فی حُکْمِ اللهِ وَحُکْمِ الاِسْلامِ عَلَی الْمُسْلِمینَ بَعْدَ ما یَمُوتُ اِمامُهُمْ اَوْیُقْتَلُ، ضالّاً کانَ اَوْ مُهْتَدِیاً، مَظْلُوماً کانَ اَوْ ظالِماً، حَلالَ الدَّمِ اَوْ حرامَ الدَّمِ، اَنْ لایَعْمَلُوا عَمَلاً وَلا یَحدثُوا وَلا یُقَدِّمُوا یَداً وَلا رِجلاً وَلا یَبْدَؤُ بِشَیئٍ قَبْلَ اَنْ یَخْتارُوا لاَنْفُسِهِمْ اِماماً عَفیفاً عالِماً وَرِعاً بِالْقَضاءِ وَالْسُنَّةِ، یَجْمَعُ اَمْرَهُمْ وَیَحْکُمُ بَیْنَهُمْ وَیَاْخُذُ لِلمَظلومِ مِنَ الظّالم حَقَّه وَ یَحْفَظُ اَطْرافَهُمْ وَ یُجْبی فَیْئَهُمْ وَیُقیمَ حَجَّتَهُمْ وَ یُجْبی صَدَقاتِهِمْ، ثُمَّ یَحْتَکِمُونَ اِلَیْهِ فی اِمامِهِمْ الْمَقْتُولِ ظُلْماً لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ فَاِنْ کانَ اِمامُهُمْ قُتِلَ مَظْلُوماً حُکِمَ لِاَوْلِیائِهِ بِدَمِهِ، فَاِنْ کانَ قُتِلَ ظالِماً نَظَرَ کَیْفَ الْحُکْمُ فی ذٰلِكَ:

"عثمان بن عفان دو حال سے خارج نہیں یا پیشوائے ہدایت تھا کہ اس صورت میں اس کا خون بہانا حرام اور اس کی مدد کرنا واجب اور اس کے فرمان سے روگردانی گناہ تھا اور امت کو اس کی مدد سے گریز نہیں کرنا چاہئے تھا اور یا وہ پیشوائے ضلالت وگمراہی تھا کہ اس صورت میں اس کا خون بہانا جائز اور اس کی حکومت کو قبول کرنا اور اس کی مدد کرنا حرام تھا، بالآخر وہ ان دو حالتوں سے خارج نہیں، لیکن حکم خدا اور حکم اسلام کی رو سے کسی امام وپیشوا کے دنیا سے رخصت یا قتل ہو جانے کی صورت میں چاہے وہ گمراہ ہو یا اہل ہدایت، مظلوم

ہو یا ظالم، اس کا خون مباح ہو یا حرام مسلمان پر واجب ہے کہ وہ کسی قسم کی کاروائی نہ کریں اور کوئی نیا پروگرام تشکیل نہ دیں اور کسی عمل کا آغاز نہ کریں جب تک کہ وہ اپنے لئے کسی پاکدامن عالم، پارسا، قضاوت کے مسائل اور سنت نبوی سے آگاہ امام اور پیشوا کا انتخاب نہیں کر لیتے، جو ان کے امور کا منتظم اور ان کے درمیان حکومت اور قضاوت کرنے والا ہو، جو ظالم سے مظلوم کے حق کو واپس لینے کی سکت رکھتا ہو اور جو سرحدوں کی حفاظت کرے اور بیت المال کی جمع آوری کا بندوبست کرے اور حج کو منظم طور پر برپا کرے، زکات جمع کرے، بعدازاں (جب لوگوں کے امور کے اسباب فراہم ہو جائیں) تو جس پیشوا کے بارے میں وہ معتقد ہیں کہ مظلومانہ طور پر قتل کیا گیا ہے اس کے فیصلے کے لئے اس جدید پیشوا کے پاس جائیں اگر وہ مقتول پیشوا مظلوم ہو تو اس کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا کہ صاحبان اس کے حق کو لیں (قصاص وغیرہ کے ذریعے) اور اگر وہ مقتول ظالم ثابت ہوا تو دیکھے گا کہ اس صورت میں حکم کیا ہے۔'' (اس بناء پر اے معاویہ! تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم قتل عثمان کے مسئلے کو چھیڑنے سے قبل حکومت اسلامی کو تسلیم کرو اور اس کی بیعت کرو جس کی بیعت تمام لوگوں نے کی ہے اور اس بہانے کو آڑ بنا کر لبیک کرنے میں ذرا سی تاخیر بھی نہ کرو)۔[1]

دو گروہ اسلامی حکومت کی تشکیل سے خوفزدہ ہیں

مذکورہ سطور میں جو کچھ بیان ہوا ہے کہ مسلم دلائل کے مطابق ''حکومت کے بغیر اسلام'' ایک مسخ شدہ اور معنی ومفہوم سے خالی اسلام ہے اور درحقیقت اسلام سے اسلام کو منفی اور تفریق کرنے سے عبارت ہے، پھر بھی بعض لوگ اسلامی حکومت کی تشکیل کی مخالفت پر کمربستہ نظر آتے ہیں، حقیقت میں اس مخالفت کا سرچشمہ دو چیزیں ہیں ایک کی حیثیت نفسیاتی اور دوسری کی حیثیت روائی ہے۔

رہی بات نفسیاتی حیثیت کی تو وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے دل ودماغ میں حکومتوں کے بارے میں تلخ یادیں موجود ہیں اور ان کی رائے کے مطابق موجودہ حالات میں کوئی بھی اسلامی حکومت قائم کرنے اور عدل اسلامی کو وجود میں لانے کے قابل نہیں کیونکہ ہمیشہ سخت رویے کے حامل افراد کی طرف سے ملک کے اندر سے حکومت پر دباؤ ڈالا جاتا ہے جو اسلامی قوانین کی چار دیواری کو توڑنے اور عدالت اجتماعی کو پامال کرنے اور کتاب وسنت کے قواعد وضوابط پر اپنے کھوکھلے نعروں کو مقدم کرنے اور ترجیح دینے کے درپے ہوتے ہیں۔

دوسری طرف سے بیرونی دنیا سے بھی دباؤ ڈالا جاتا ہے اور اغیار کی خفیہ سیاست، سازشیں اور ایجنسیاں حرکت میں آجاتی ہیں جو حکومت اسلامی کے اپنی راہ پر گامزن ہونے میں مشکلات پیدا کرتی ہیں اور قطعی طور پر اسے کسی نہ کسی مقام پر سیدھی راہ سے منحرف کردیتی

[1] کتاب سلیم بن قیس، ص ۱۸۲۔

ہیں۔اسی وجہ سے ان لوگوں کی نظر میں ایک واقعی اور حقیقی اسلامی حکومت چل ہی نہیں سکتی اور نا قابل عمل ہے۔وہ لوگ داستان ''مشروطہ'' کو اپنے دعویٰ کی دلیل قرار دیتے ہیں جس میں علماء دین اپنی تمام تر قوت کے ساتھ شریک ہوئے تا کہ وہ حکومت اسلامی کا چہرہ یا (اس چیز کو جو چند جہتوں سے اسلامی حکومت کے مشابہ ہے) دنیا کو دکھا سکیں، لیکن تمام کوششوں کے باوجود آخرکار اندرونی اور بیرونی منحرف افراد نے باہمی اتفاق کے ساتھ اسے ایک خودسر، تباہ کن اور ستمگر حکومت میں تبدیل کر دیا۔رہی بات روائی حیثیت کی تو اس ضمن میں وہ ان روایات کا سہارا لیتے ہیں جو یہ کہتی ہیں: ''ہر وہ پرچم جو امام مہدیؑ کے قیام سے پہلے بلند کیا جائے گمراہی کا پرچم ہے!''

مندرجہ ذیل سطور میں ان روایات کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، یہ روایات حقیقت میں چند گروہوں پر مشتمل ہیں، ہمیں روایات کے ایک گروہ میں یہ ملتا ہے کہ جب تک اہل جور وستم سلاطین اور ظالم حکومتوں کے خلاف خروج اور قیام کا مساعد و مناسب وقت نہ آئے، قیام نہ کرو؛ جیسے:

۱۔''ابو المرھف'' ایک روایت میں امام محمد باقرؑ سے نقل کرتا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"اَلْغُبَرَةُ عَلی مَنْ اَثارَها. هَلَكَ الْمَحاصِيرُ. قُلْتُ جَعِلْتُ فِداكَ وَما الْمَحاصِيرُ؟ قالَ: اَلْمُسْتَعْجِلُونَ..."

یعنی: ''گرد و خاک اور غبار کا رخ اسی کی طرف ہوتا ہے جو اسے پراگندہ کرتا ہے (جو شخص غبار اڑاتا ہے وہ اسی کے چہرے اور دامن کو آلودہ کرتا ہے) ''محاصیر'' ہلاک ہو جاتے ہیں، راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا: آپؑ پر قربان جاؤں ''محاصیر'' کیا ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: وہ لوگ جو جلد بازی کرتے ہیں'' (اور ستمگر حکومت کے خلاف قیام کرنے میں جلدی کرتے ہیں جبکہ قیام کی شرائط ابھی فراہم نہیں ہوتیں)۔[1]

۲۔ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ اپنے آباء کرام سے رسول اکرمؐ کی حضرت علیؑ کو وصیت میں فرماتے ہیں:

"یا عَلِیُّ اِنَّ اِزالَةَ الْجِبالِ الرَّواسی اَهْوَنُ مِنْ اِزالَةِ مُلْكٍ لَمْ تَنْقَضِ اَیّامُهُ:"

یعنی: ''اے علیؑ! ثابت و برقرار پہاڑوں کو اکھاڑنا اس حکومت کے زائل کرنے سے زیادہ آسان ہے جس کی مدت ابھی ختم نہیں ہوئی'' (اور اس کے زوال کی شرائط و اسباب ابھی فراہم نہیں ہوئے)۔[2]

۳۔ایک حدیث میں جسے عیسیٰ بن قاسم نے نقل کیا ہے، امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ''خدا سے ڈرتے رہو اور اپنی مصلحتوں کے بارے میں سوچو اس لئے کہ تم لوگوں سے زیادہ اس بات کے مستحق ہو......اس کے بعد آپؑ نے مزید فرمایا:

"اِنْ اَتاكُمْ مِنّا آتٍ لِیَدْعُوَكُمْ اِلَی الرِّضا مِنّا فَنَحْنُ نُشْهِدُكُمْ اِنّا لا نَرْضی، اِنَّهُ لا

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۱،ص۳۶ (ان روایات کو وسائل الشیعہ کے مولف نے جلد ۱۱ کتاب الجہاد باب ۱۳ میں نقل کیا ہے)

[2] وسائل الشیعہ، ج۱۱،ص۳۸

يُطِيعُنا اليَوْمَ وَهُوَ وَحدَهُوَ كَيْفَ يُطيعُنا إذا اِرْتَفَعَتِ الرّاياتُ وَالاَعْلامُ"

یعنی: ''اگر ہم میں سے کوئی آکر تمہیں ہماری خوشنودی اور رضا مندی کی دعوت دے (توجہ رہے کہ ''آل محمدؐ کی رضا نام کا ایک پرکشش نعرہ لگایا جاتا رہا ہے اس زمانے میں (حکومت کے خلاف) قیام کرنے والے اکثر لوگ اسی نعرے کا سہارا لیتے تھے) تو ہم تمہیں گواہ بناتے ہیں ہم ایسے قیام سے راضی نہیں، وہ آج ہماری حمایت نہیں کر رہا جبکہ وہ تنہا ہے، جب پرچم بلند کئے جائیں (اور لوگوں کی ایک بڑی جماعت اس کے ساتھ ہو) وہ کیسے ہماری حمایت کرے گا؟!''[1]

۴۔نہج البلاغہ میں امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:

" اَلْزِمُوا الاَرْضَ وَ اصْبِرُوا عَلَى الْبلاءِ وَ لاتُحَرِّكُوا بِأَيْدِيكُمْ وَ سُيُوفِكُمْ فِى هَوى اَلْسِنَتِكُمْ وَ لاتَسْتَعْجِلُوا بِمالَمْ يُعَجِّلْهُ اللهُ لَكُمْ. فَإنَّهُ مَنْ ماتَ مِنْكُمْ عَلى فِراشِهِ وَ هُوَ عَلى مَعْرِفَةِ حَقِّ رَبِّهِ وَ حَقِّ رَسُوْلِهِ وَاَهْلِ بَيْتِهِ ماتَ شَهيداً، وَ وَقَعَ اَجْرُهُ عَلَى اللهِ، وَاسْتَوْجَبَ ثَوابَ مانَوى مِنْ صالِحِ عَمَلِهِ، وَقامَتِ النِيَّةُ مَقامَ اِصْلاتِهِ لِسَيْفِهِ فَإنَّ لِكُلِّ شَيئٍ مُدَّةً وَاَجَلاً".

ترجمہ: ''اپنی جگہ پر ہی رہو (اور اجازت کے بغیر قیام نہ کرو) اور مصائب ومشکلات کے سامنے استقامت کا مظاہرہ کرو، اپنی تلواروں کو ہوس، خواہش نفس اور بغیر غور وفکر کے زبان سے نکلنے والے الفاظ کی خاطر استعمال نہ کرو اور جس میں خدا تعالیٰ کا حکم نہیں، اس عمل میں جلد بازی نہ کرو، اس لئے کہ تم لوگوں میں سے جو شخص اپنے بستر پر مر جائے لیکن وہ خدا اور رسولؐ اور ان کے اہلبیتؑ کی معرفت سے مستفید ہو، شہید کے طور پر اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے! اور اس کا اجر وثواب خدا تعالیٰ کے ذمہ ہے اور جن نیک اعمال کو وہ انجام دینے کی نیت رکھتا تھا، ان نیک اعمال کے عمل کا ثواب اسے ملے گا اور اس کی نیت اس کی شمشیر کی ضربوں کی جانشین قرار پائے گی اور (جان لو کہ) ہر چیز کا ایک معین اور مقررہ وقت ہے'' (اگر اس سے پہلے اس کے پیچھے جاؤ گے تو تمہیں ناکام ہونا پڑے گا)۔[2]

واضح ہے کہ اس قسم کی احادیث امام مہدیؑ کے ظہور سے قبل حکومت اسلامی کی تشکیل سے منع نہیں کرتیں بلکہ ان کا پیغام فقط یہ

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۳۸۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۰ (خطبے کا آخری حصہ)۔

ہے کہ موقعہ اور مناسب فرصت کا انتظار کرو اور مناسب فرصت کی دستیابی اور فراہمی کے بغیر اس عمل سے گریز کرو کیونکہ اگر ایسا نہ کیا تو تمھیں بے پناہ جانی اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا اور کوئی حسب خواہش نتیجہ نہیں حاصل کر پاؤ گے۔ بلکہ شاید ان کا مفہوم بعض لوگوں کی توقع کے برعکس ہو اور وہ یہ ہے کہ جب قیام کی شرائط اور حکومت اسلامی کی تشکیل کے اسباب فراہم ہوں تو اس کے حصول کا اقدام کرو۔

درحقیقت ان روایات کا اشارہ اسی مطلب کی طرف ہے جسے نہج البلاغہ کے خطبہ ۵ میں بیان فرمایا گیا ہے:

"وَمُجْتَنِي الثَّمَرَةِلِغَيْرِ وَقْتِ اِيْنَاعِهَا كَالزَّارِعِ بِغَيْرِ اَرْضِهِ"

ترجمہ: ''جو شخص پھل کو پکے بغیر توڑ لے اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے اپنا بیج ایک غیر مناسب اور ناموزوں زمین میں بودیا ہو (ان میں سے کوئی ایک بھی پھل اور نتیجہ نہیں حاصل کر پاتا)''

دوسرے گروہ کی روایات کا مضمون یہ ہے کہ قیام کو ''الرَّضا مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ'' (یعنی آل محمدؐ کی طرف سے رضا) اور ان کے اغراض ومقاصد کے عنوان سے ہونا چاہیے اور اس کے بغیر وہ قیام جائز اور مجاز نہیں ان میں سے ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"اِنْ اَتَاكُمْ آتٍ مِنّا فَانْظُروا عَلٰى اَيِّ شَيْئٍ تَخْرُجُونَ؟ وَلا تَقُولُوا خَرَجَ زَيْدٌ فَاِنَّ زَيداً كَانَ عالِماً وَ كَانَ صَدُوقاً وَلَمْ يَدْعَكُمْ اِلٰى نَفْسِهِ وَاِنَّمَا دَعاكُمْ اِلَى الرِّضا مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ، وَلَوْ ظَهَرَ لَوَفٰى بِما دَعاكُمْ اِلَيْهِ، اِنَّما خَرَجَ اِلٰى سُلطانٍ مُجْتَمِعٍ لِيُنْقِضَهُ، فَالْخارِجُ مِنّا الْيَوْمَ اِلٰى اَيِّ شَيْئٍ يَدْعُوكُمْ؟ اِلَى الرَّضا مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ؟ فَنَحْنُ نُشْهِدُكُمْ اَنّا لَسْنا نَرْضٰى بِهِ وَ هُوَ يَعْصِنَا الْيَوْمَ وَ لَيْسَ مَعَهُ اَحَد، وَ هُوَ اِذا كانَتِ الرّاياتُ وَ الاَلْوِيَّةُ اَجْدَرُ اَنْ لا يَسْمَعَ مِنّا"

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص ہماری طرف سے آئے (اور دعویٰ کرے کہ میں ظالم وجابر حکومت کے خلاف قیام کرنا چاہتا ہوں) تو غور وفکر کرو کہ کس کی خاطر قیام کرنا چاہتے ہو، یہ مت کہو کہ زید نے قیام کیا، زید عالم اور راستگو شخص تھے اور انھوں نے ہرگز تمھیں اپنی طرف دعوت نہیں دی، بلکہ انھوں نے آل محمدؐ کی خوشنودی کی خاطر تمھیں دعوت دی، اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو وہ اس چیز کے ساتھ وفا کرتے جس کی طرف انھوں نے تمھیں دعوت دی تھی (یعنی حکومت کو ہمارے سپرد کر دیتے) انھوں نے ایک مضبوط اور متمرکز حکومت کے خلاف قیام کیا تاکہ اسے ختم کر دیں (لیکن کامیاب نہ ہو سکے) اگر آج ہم میں سے کوئی شخص قیام کرتا ہے تو وہ تمھیں کس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے؟ آل محمدؐ کی رجا کی طرف؟ ہم تمھیں اس بات پر گواہ بناتے ہیں کہ ہم

اس عمل سے راضی نہیں ہیں! آج جبکہ وہ تنہا ہے نافرمانی کر رہا ہے (اور اجازت کے بغیر اس عمل کو انجام دینے کے درپے ہے) تو مسلم ہے کہ جب پرچم بلند ہوگا اور لوگ اس کے گرد جمع ہوں گے تو وہ بطریق اولیٰ ہماری بات نہیں سنے گا۔''[1]

تسلیم شدہ بات ہے کہ یہ حدیث اور اس جیسی دیگر احادیث حکومت اسلامی کی تشکیل و قیام سے منع نہیں کرتیں، بلکہ یہ کہتی ہیں کہ حکومت تشکیل دینے کا ہدف اور مقصد ائمہ معصومینؑ کی خوشنودی ہونا چاہیے جو رسول اکرمؐ کے حقیقی جانشین ہیں۔

خودسرانداز میں ان کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کئے بغیر اس عمل کی انجام دہی کی کوشش جائز نہیں! اس لحاظ سے جب عصر غیبت میں حکومت اسلامی کی تشکیل کے اسباب فراہم ہو جائیں اور یقین کرلیں کہ حضرت مہدیؑ حکومت کی تشکیل سے راضی ہیں اور اس کی تشکیل کا ہدف اسلام اور قرآن کا احیاء (زندہ کرنا) اور آل محمدؐ کی خوشنودی و رضا کو حاصل کرنا ہے تو نہ فقط ایسی حکومت کی تشکیل ممنوع نہیں بلکہ اس کے قیام کے لئے اقدام کرنا ضروری ہے۔ (غور فرمائیں)

روایات کی دوسری قسم ایسی روایات پر مشتمل ہے جو یہ کہتی ہیں: قیام حضرت مہدیؑ سے قبل ہر قیام کو شکست کا سامنا کرنا پڑے گا مثلاً مندرجہ ذیل روایات: ابوبصیر سے منقول امام جعفر صادقؑ کی اس حدیث میں آپؑ نے فرمایا:

"كُلُّ رايَةٍ تُرْفَعُ قَبْلَ قِيامِ الْقائِمِ فَصاحِبُها طاغُوتٌ يَعْبُدُ مِنْ دُونِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ"

ترجمہ: ''قیام قائم = سے قبل ہر بلند ہونے والے پرچم کا صاحب پرچم وہ طاغوت ہے جو خدا تعالیٰ کے غیر کی پرستش کرتا ہے (اور ایسا بت ہے جس کی پرستش کی جاتی ہے)۔''[2]

۲۔ حسین بن خالد سے مروی ایک اور حدیث میں راوی کہتا ہے کہ میں نے امام علی بن موسیٰ الرضاؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ ''عبداللہ بن بکیر'' نے ''عبید بن زرارہ'' سے نقل کیا ہے کہ میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں تھا جب ''محمد بن عبداللہ بن الحسن - [3] نے خروج کیا اور منصور دوانیقی کے خلاف قیام کیا کہ اسی اثنا میں ہمارے اصحاب میں سے ایک شخص داخل ہوا اور امامؑ کی خدمت میں عرض کیا: میں آپؑ پر قربان جاؤں؛ محمد بن عبداللہ نے قیام کیا ہے آپؑ اس بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں؟ کیا ہم ان کے ہمراہ خروج کریں؟! آپؑ نے فرمایا:

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۳٦۔

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۳۷۔

[3] محمد بن عبداللہ بن حسن، امام حسن مجتبیٰ - کے پوتے تھے۔ جنھوں نے منصور عباسی کے خلاف قیام کیا، بہت سارے لوگوں نے ان کی بیعت کی انھوں نے مکہ مدینہ اور یمن کا کنٹرول سنبھال لیا، لیکن منصور نے ایک عظیم لشکر بھیجا جس نے ان پر فتح حاصل کر کے انہیں شہید کر دیا آپ محمد بن عبداللہ ''نفس زکیہ'' کے نام سے معروف ہیں، آپؑ کی شہادت رمضان ۱۴۵ ھجری میں واقع ہوئی (تتمۃ المنتھی، ص ۱۳۵)۔

"اُسْكُنُوا ما سَكَنَتِ السَّماءُ وَالاَرْضُ"

یعنی: ''جب تک آسمان وزمین ساکن ہیں تم لوگ بھی کوئی حرکت نہ کرو!''

عبداللہ بن بکیر نے کہا: اگر مسئلے کی یہی صورتحال ہوتو پھر نہ کسی قیام کرنے والے اور نہ اس کے قیام کا وجود ہوگا (کیونکہ آسمان وزمین ساکن ہیں اوران کی حرکت محسوس اور ظاہر نہیں)۔امام علی رضا - نے فرمایا: امام جعفر صادقؑ نے ٹھیک فرمایا ہے اور مطلب وہ نہیں جو ابن بکیر نے خیال کیا ہے' آسمان کے ساکن ہونے سے مراد اس کا ندا سے ساکن ہونا ہے (وہ مخصوص صدا جو حضرت مہدیؑ کے قیام سے پہلے آسمان سے بلند ہوگی) اور زمین کے ساکن ہونے سے مراد وہ زلزلہ اور زمین میں دھنسنا ہے جو سفیانی کے لشکر کے لئے امام مہدیؑ کے ظہور کے وقت واقع ہوگا۔[1]

اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوگا ہے کہ امام مہدیؑ کے قیام سے پہلے کسی قیام کو واقع نہیں ہونا چاہیے:

۳۔ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک صحابی ''سدیر'' سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اَلْزِمْ بَيْتَكَ وَ كُنْ حَلَساً مِنْ اَحْلاسِهِ, وَاسْكُنْ ما سَكَنَ اللَّيْلُ وَالنَّهارُ فَاِذا بَلَغَكَ اِنَّ السُّفيانى قَدْ خَرَجَ فَارْحَلْ اِلَيْنا وَلَوْ اِلَيْنا وَلَوْ عَلى رِجْلِكَ"

ترجمہ: ''اپنے گھر میں رہو اور اس کے فرش کی طرح ساکن بن جاؤ! جب تک شب وروز ساکن ہیں تم بھی سکون اختیار کرو، لیکن جب تمہیں یہ خبر ملے کہ ''سفیانی'' نے خروج کیا ہے تو اس وقت ہمارے پاس چلے آؤ اگر چہ تم پیدل ہی ہو!''[2]

''سفیانی''، قتل وغارت کرنے والے ظالم حکمرانوں میں سے ایک ظالم حکمران ہے جو حضرت مہدیؑ کے قیام سے قبل آکر مختلف علاقوں پر لشکر کشی کرے گا، ایک لشکر کو مدینہ کی جانب بھی روانہ کرے گا جو مدینہ کے نزدیک ایک صحرا میں زلزلے کے سبب پڑنے والے شگاف کے باعث پورا لشکر زمین میں دھنس جائے گا!

اسی مضمون پر مشتمل کئی اور روایات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مہدیؑ کے ظہور سے قبل قیام کرنا ممنوع ہے، جیسے امام جعفر صادقؑ سے منقول ''عمر بن حنظلہ'' اور ''معلّٰی بن خنیس'' کی روایتیں اور ''جابر'' کی امام محمد باقر - سے روایت اور دوسری روایات ہیں۔[3]

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۱۔

[2] وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۳٦۔

[3] وسائل الشیعہ، ج۱۱، صفحات ۳۵ تا ۴۱۔

بحث وتحقیق

ان روایتوں سے متعلق ہم چند ضروری نکات کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں:

۱۔شریعت اسلامی میں ہمارے پاس کچھ مسلمہ اصول ہیں جنھیں نظر انداز کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں، ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہ مسلّم امور ہیں جن میں کسی قسم کا شک وشبہ جائز نہیں، بہت ساری آیات اور روایات میں ان دو مسلّم قاعدوں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

اب اگر ہم کسی ایسے ماحول میں ہوں جس میں احکام الٰہی کو پامال کیا جاتا ہو، نیک کام بھلا دیئے گئے ہوں، ظلم وفساد نے ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو اور ہم ایک مؤثر قیام کے ذریعے فاسد حکومت کو برطرف کرنے پر قادر بھی ہوں اور وسیع طور پر منکرات کو ختم کر کے ان کی جگہ نیک کاموں کو رائج کر سکتے ہوں، تو کیا ایسی حالت میں کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ ایسا عمل حرام ہے؟ کیا درست ہے کہ ہم خاموش تماشائی بنے بُرائی وتباہی کے مناظر، احکام اسلام کی پامالی اور نوجوانوں کے دین اسلام سے خارج ہونے کا تماشا دیکھتے رہیں؟!

ممکن ہے بہانہ باز افراد یہ کہیں کہ ایسی صورتحال کبھی واقع نہیں ہوئی، تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ فرض کریں ایسی صورت پیش آجاتی ہے، یہ فرض کرنا کوئی عقلی طور پر محال اور ناممکن تو نہیں، کیا پھر بھی یہ کہا جائے گا کہ ضروری ہے کہ کوئی اقدام کرنے سے گریز کرو اور ظلم وفساد کے سامنے سر جھکا لو اگر چہ احکام اسلامی کا تیا پانچہ ہی کیوں نہ ہو جائے؟! ہمارے خیال میں کسی عالم اور محقق کی زبان پر یہ کلمات جاری نہیں ہو سکتے!

ہماری اس گفتگو کے شواہد میں سے ایک شاہد یہ ہے کہ محمد بن عبداللہ المعروف بہ نفس زکیہ جو امام حسن مجتبیٰ -کی اولاد میں سے ہیں، ان کے حالات زندگی میں آیا ہے کہ جب لوگوں کی ایک نامی گرامی جماعت نے ''مہدی'' کی حیثیت سے ان کی بیعت کرلی اور اس واقعے کی اطلاع امام جعفر صادق ؑ کو ملی (یہاں تک کہ انھوں نے امامؑ سے بھی بیعت کرنے کو کہا!) امامؑ نے فرمایا: اس کام کو مت انجام دو، کیونکہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا (اور ظہور امام مہدیؑ آئندہ وقوع پذیر ہوگا) اگر تم (یعنی عبداللہ جو محمد کے والد ہیں) اپنے بیٹے کو مہدی موعود سمجھتے ہو تو وہ مہدی نہیں ہے اور ابھی ان کے ظہور کا وقت نہیں آیا اور اگر اسے مائل کرو کہ وہ خدا کی خاطر خروج کرے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے تو خدا کی قسم ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گے، اور اس کی بیعت کریں گے! لیکن عبداللہ کو غصہ آگیا اور اس نے ایک نامناسب جواب دیا۔[1]

بالفرض مذکورہ بالا روایات اس بات کی تصریح بھی کریں کہ حضرت مہدیؑ کے قیام سے پہلے ہر قسم کا قیام گمراہی کا سبب ہے، پھر بھی ہم خبر واحد یا چند خبروں جو خبر واحد کے حکم میں ہے کی خاطر اسلام کے تسلیم شدہ اصولوں سے جو قرآن اور روایات میں بیان کئے گئے ہیں دستبردار نہیں ہو سکتے، لہٰذا جب بھی حکومت اسلامی کی تشکیل اور ظلم وستم ارجرم وفساد کی بساط الٹنے کے مقدمات اور شرائط فراہم ہوں تو اس

---

[1] ارشاد مفید با تلخیص، ج۲، ص۱۸۵، (باب ۱۳، امام جعفر صادق -کے حالات)۔

وقت ہمیں اقدام کرنے سے ہچکچانا نہیں چاہیے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، حدود جاری کرنے اور اقامۂ عدل وانصاف کے دلائل کو محض چند مشکوک روایات کو عذر بنا کر پامال نہیں کیا جاسکتا!

۲۔ قیام سے منع کرنے والی ان روایات کے مقابلے میں کئی دوسری روایات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ ہدیٰ نے اپنے زمانے میں پیش آنے والے کئی ایک قیاموں کی تعریف کی ہے، اگر چہ یہ قیام اپنے آخری نتیجے تک نہیں پہنچ سکے، ایسی صورت میں کیسے ممکن ہے کہ یہ ممنوع ہوں اور اس کے باوجود قابل تعریف بھی ہوں؟! روایات میں زید بن علیؑ کے قیام کو ایک مقدس قیام کی حیثیت سے یاد کیا گیا ہے: مرحوم شہید کتاب ''قواعد'' میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بحث میں فرماتے ہیں: ''زید، امام محمد باقرؑ کے بعد امام سجاد - کے عالی ترین فرزند، عالم، مجاہد، پارسا، سخی اور شجاع تھے، انھوں نے شمشیر کے ساتھ قیام کیا تا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انجام دیں اور شہداء کربلا کے خون کا بدلہ لیں۔[۱]

مرحوم علامہ مامقانی نے زید بن علی کی مدح اور فضیلت میں کافی روایات نقل کی ہیں اور ان کی مذمت میں نقل شدہ روایات، مدح میں ذکر کی گئی روایات کے مقابلے میں ناچیز اور قابل توجیہ قرار دیں ہیں۔[۲]

مرحوم علامہ مجلسی ''زید'' اور ان کے قیام کے بارے میں روایات کے اختلاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''وہ روایات جو بہت زیادہ ہیں جو ان کے بلند مقام اور تعریف وستائش پر دلالت کرتی ہیں اور جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ حق کے سوا کسی چیز کے مدعی نہ تھے، اسی طرح اصحاب کی اکثریت ان کے عظیم مقام کی معترف ہے۔''[۳]

اگر حضرت مہدیؑ کے قیام سے پہلے ہر قیام گمراہوں اور مشرکوں کا قیام ہو تو کیسے زید بن علیؑ کے قیام کی تعریف وتمجید کی جاسکتی ہے؟! دوسرا نمونہ وہ روایات ہیں جو ''حسین بن علیؑ'' شہید فخؑ کی مدح میں نقل ہوئی ہیں جو امام حسن مجتبیٰ - کے پوتے تھے، آپ نے عباسی خلیفہ ''موسیٰ الہادی'' کے خلاف ۱۶۹ ہجری میں قیام کیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ مدینہ سے مکہ کی طرف حج کی ادائیگی کی غرض سے نکلے جب مکہ کے نزدیک فخ کے مقام پر پہنچے تو آپ کے دوستوں اور خلیفہ عباسی کے لشکر کے درمیان شدید جنگ چھڑ گئی۔

اس جنگ میں حسین بن علی نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جام شہادت نوش کیا، آپ وہی شخصیت ہیں کہ مشہور شاعر دعبل خزاعی نے اپنے معروف اشعار ''مدارس آیات'' میں جنھیں شہداء اہل بیتؑ میں سے ایک عظیم شہید کی حیثیت سے یاد کیا ہے، اور امام رضا - نے یہ اشعار سن کر ان کے بارے میں ایسے الفاظ پر کوئی اعتراض نہ کیا، چنانچہ دعبل کہتے ہیں:

قُبُور بِکرُ فانٍ واُخری بِطَیْبَۃٍ
واُخری بِفَخٍّ نالَها صَلَواتی

---

[۱] تنقیح المقال، (رجال مامقانی) حالات زید۔

[۲] تنقیح المقال، (رجال مامقانی) حالات زید۔

[۳] بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۲۰۵۔

ایک حدیث میں امام نہم یعنی امام محمد تقی -فرماتے ہیں: رسول اکرمؐ جب فخ کے علاقے سے گذر رہے تھے، تو آپؐ سواری سے اتر پڑے اور نماز پڑھنے لگے، دوسری رکعت میں آپؐ اس قدر روئے کہ آپؐ کے رونے سے سب لوگ رو پڑے، نماز ختم کرنے کے بعد جب آپؐ سے اس گریہ کا سبب پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا: جبرائیل -مجھ پر نازل ہوئے ہیں اور مجھ سے کہا ہے کہ:

"ای محمّد! اِنَّ رَجُلاً مِنْ وُلْدِكَ يُقْتَلُ فى هذا الْمكانِ، اَجْرُ الشَّهيدِ مَعَهُ، اَجْرُ شَهيدَيْنِ":

''اے محمدؐ! تمہارا ایک فرزند اس زمین پر قتل کیا جائے گا، اس کے ہمراہ شہید ہونے والے کا ثواب دو شہیدوں کے ثواب کے برابر ہے۔''[1]

یہاں تک کہ امام محمد تقی -ہی سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لَمْ يَكُنْ لَنا بَعْدَ الطَّفِّ مَصْرَعٌ اَعْظَمُ مِنْ فَخٍّ

''کربلا کے بعد ہمارے لئے کوئی قتل گاہ فخ کی قتل گاہ سے بڑھ کر نہیں۔''[2]

اور ایک روایت میں خود حسین بن علی (شہید فخ) سے منقول ہے کہ:

"ما خَرَجْنا حَتّى شاوَرْنا مُوسَى بنِ جَعْفَرٍ فَأَمَرَنا بِالْخُرُوجِ"

''ہم نے یہ قیام، حضرت امام موسیٰ کاظم ؑ کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد کیا ہے اور انھوں نے ہمیں خروج (قیام) کا حکم دیا ہے۔''[3]

مرحوم علامہ مامقانی آپ کے حالات کے اختتامی کلمات میں فرماتے ہیں: ''ہماری اس گفتار سے واضح ہو گیا ہے کہ آپ قابل اعتماد اور باوثوق شخصیت ہیں، کیونکہ امام موسیٰ کاظم ؑ نے ایک حدیث میں اس بات کی گواہی دی ہے اور حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ آپ کے ہمراہ شہید ہونے والا کا اجر وثواب دو شہیدوں کے برابر ہے، اور رسول اکرمؐ نے آپ پر گریہ فرمایا، اور امام جعفر صادق ؑ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کی روح ان کے بدن سے پہلے جنت میں داخل ہو گی!'' اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لئے تنقیح المقال (جلد اول، صفحہ ۳۳۷ و بحار الانوار، ج ۴۸، صفحہ ۱۶۰) کی طرف رجوع کیا جائے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر کئی روایات میں آیا ہے کہ مہدیؑ سے پہلے کئی اقوام قیام کر کے قیام مہدیؑ کی راہ ہموار کریں گی اور روایات میں انھیں نیک الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ اگر مہدیؑ کے قیام سے قبل کے قیام باطل اور طاغوتی ہوتے تو ان روایات کا کوئی درست

---

[1] ۔تنقیح المقال، ج۱، ص ۳۳۷ (حالات حسن بن علی شہید فخ)، بحار الانوار، ج ۴۸، ص ۱۷۔

[2] تنقیح المقال، ج۱، ص ۳۳۷ (حالات حسن بن علی شہید فخ)، بحار الانوار، ج ۴۸، ص ۱۷۔

[3] تنقیح المقال، ج۱، ص ۳۳۷ (حالات حسن بن علی شہید فخ)، بحار الانوار، ج ۴۸، ص ۱۷۔

مفہوم نہ ہوتا، اس مقام پر ہم شیعہ اور اہل سنت کے طریقوں سے منقول دو روایات کے ذکر پر اکتفا کریں گے اگر چہ روایات کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔امام ابوالحسن الاول (امام موسیٰ کاظم -) کی حدیث میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ قُمْ يَدْعُو النّاسَ اِلَى الْحَقِّ يَجْتَمِعُ مَعَهُ قَوْم كَزُبُرِ الْحَدِيدِ لاتَزِلُّهُمُ الرِّيَاحُ الْعَواصِفُ وَ لايَمِلُّوْنَ مِنَ الْحَرْبِ وَ لايَجْبُنُونَ وَ عَلَى اللهِ يَتَوَكَّلُوْنَ وَ الْعاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ:"

یعنی: ''اہل قم میں سے ایک شخص قیام کر کے لوگوں کو حق کی طرف دعوت دے گا جو لوگ اس کے گرد جمع ہوں گے، لوہے کے ٹکڑوں کی مانند سخت ہوں گے سخت طوفان بھی انھیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکیں گے یہ لوگ جنگ سے تھک ہار کر بیٹھ جانے اور خوف جیسی چیز سے نا آشنا ہوں گے، خدا پر توکل کرنے والے ہوں گے اور نیک انجام پر ہیز گاروں ہی کے لئے ہے!''[1]

جن بعض روایات میں اس قسم کے قیام کا اشارہ کیا گیا ہے ان میں واضح طور پر ایسے قیام کو حضرت مہدی = کے قیام کا مقدمہ اور تمہید قرار دیا گیا ہے بہر حال ان سے ظاہر ہوتا ہے امام مہدیؑ کے قیام سے پہلے کچھ مشروع (شرعاً جائز) خونی قیام ہوں گے جن کا مقصد حق کی طرف دعوت دینا ہوگا اور جنھیں کامیابی بھی نصیب ہوگی۔

اہل سنت کی معتبر کتاب ''سنن ابن ماجہ'' کی ایک حدیث میں آیا ہوا ہے: بنی ہاشم کے کچھ جوان افراد رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئے، جب آپؐ نے انھیں دیکھا، تو آپؐ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور آپ کا رنگ مبارک متغیر ہو گیا، سوال کیا گیا کہ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر غم و حزن کے آثار کیوں نظر آ رہے ہیں؟ تو جواباً آپؐ نے فرمایا:

"اِنّا اَهْلُ بَيْتٍ اِخْتارَ اللهُ لَنَا الآخِرَةَ عَلَى الدُّنْيا. اِنَّ اَهْلَ بَيْتِى سَيَلْقَوْنَ بَعْدِى بَلاءً وَ تَشْرِيداً حَتّى يَاْتِيَ قَوْم مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ مَعَهُمْ رايات سُوْء يَيَسْاَلُوْنَ الْخَيْرَ فَلا يَعْطَوْنَه فَيقاتِلُونَ وَ يُنْصَرُونَ فَيُعْطُونَ ماسَأَلُوا فَلا يَقْبَلُونَه حَتّى يَدْفَعُوها اِلى رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ بَيْتِى فَيَملآها قِسْطاً كَما مَلَئُوها جَوْراً فَمَنْ اَدْرَكَ ذلِكَ مِنْكُمْ فَلْيَأْتِهِمْ وَلَوْ حَبْواً عَلَى الثَّلْجِ"

ترجمہ: ''ہمارا تعلق ایک ایسے خاندان کے ساتھ ہے جس کے لئے خدا تعالیٰ نے دنیا کی بجائے آخرت کو انتخاب فرمایا ہے اور میرے بعد میرے خاندان کو سخت مصائب، جلا وطنی اور اپنے مقام سے کنارہ کشی کا

[1] سفینۃ البحار، واثرہ قم۔

سامنا کرنا پڑے گا، یہاں تک کہ کچھ لوگ سیاہ جھنڈوں کے ساتھ مشرق کی طرف سے آئیں گے جو نیکی کے طلبگار ہوں گے (اورحق وعدالت کے خواہاں ہوں گے) لیکن وہ ان کے حوالے نہیں کریں گے، پس وہ جنگ کریں گے اوران کی نصرت کی جائے گی اور وہ کامیاب ہوں گے اور جو وہ چاہتے ہیں انھیں وہ کچھ دیں گے لیکن وہ اسے قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ وہ اسے میرے اہل بیتؑ میں سے کسی کے سپرد کردیں گے پس وہ زمین کو اسی طرح عدالت سے بھردے گا جس طرح وہ ظلم سے بھردی گئی ہوگی، تم میں سے جو شخص اس زمانے کو پائے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے ساتھ ملحق ہوجائے، اگر چہ اسے سینے کے بل برف پر سے گذر کر آنا پڑے!''[1]

اس روایت کے آخری حصہ سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ یہ قیام امام مہدیؑ کے قیام سے کچھ پہلے ہوگا اور یہ شرعی طور پر جائز قیام حضرت مہدیؑ کے قیام کی راہ ہموار کرے گا۔ اس پوری فصل سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ امام مہدیؑ کے قیام سے پہلے کئی قیام عمل میں آئیں گے جو حق کی خاطر ہوں گے، جن میں سے کچھ کامیاب اور کچھ ناکام ہوں گے، اور ایسا نہیں کہ حضرت مہدیؑ سے قبل ہر بلند کیا جانے والا پرچم طاغوتی اور شیطانی پرچم ہوگا اگر چہ وہ اہل بیتؑ کی اجازت سے اور ان کے مقاصد کے حصول ہی کی خاطر کیوں نہ ہو۔ (غور فرمائیں)

۳۔ آخری بات یہ ہے کہ جو روایات یہ کہتی ہیں کہ ''حضرت مہدیؑ کے قیام سے پہلے انجام پانے والا ہر قیام شرک آلود اور طاغوت (شیطان) کی خاطر ہے، ضروری ہے کہ ان کی ایسی تفسیر وتشریح کی جائے جو فقہی مسلّمات، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام اور فساد کے خلاف جنگ کے ساتھ بھی سازگار ہو اور ان متعدد قیاموں کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو جو معصومینؑ کے زمانے میں انجام پائے ہیں اور ان حضراتؑ نے ان کی صحت کی تائید فرمائی ہے ان روایات کی تفسیر کے لئے ہمارے سامنے چند راہیں ہیں:

۱۔ ان سے مراد قیام کی وہ اقسام ہیں جو ائمہ معصومینؑ یا حکام شرع اور زمانہ غیبت میں ان کے عمومی نائبین کی اجازت اور اذن کے بغیر ہوں۔

۲۔ اس قسم کے قیام سے مراد وہ قیام ہوں جو محمدؐ و آل محمدؐ کے اہداف ومقاصد کی طرف دعوت کی بجائے ذاتی اغراض ومقاصد کی طرف دعوت پر مشتمل ہوں جن کی طرف روایات میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔

۳۔ یہاں قیام کی وہ قسمیں مراد ہیں جو مخصوص علاقوں میں برپا ہوئے ہیں اور جن کے لئے کوئی آمادگی اور تیاری نہیں کی گئی اور ائمہ ہدیٰؑ نے اس قسم کے عجولانہ، جلد بازی پر مبنی اور ناپختہ قیام کی روک تھام کے لئے ایسے جملے ارشاد فرمائے اور اس سے روکا ہے، یہاں ہم ایک بار پھر قرآن مجید کی طرف رجوع کرکے اس کی عمومی دعوت پر غور کرتے ہیں، جس میں وہ امت اسلامی کو ظالموں کے خلاف قیام،

---

[1] سنن ابن ماجہ، ج ۲، ص ۱۳۶۶، حدیث ۴۰۸۲۔

مظلومین کی حمایت اور عدل وانصاف قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۷۵ میں ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

''تم لوگ راہ خدا میں اور ان مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر کیوں جنگ نہیں کرتے جو ستمگروں کے ہاتھوں ضعیف اور کمزور ہو گئے (بنادیئے گئے) ہیں؟! وہی (مظلوم اور ستمدیدہ افراد) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس شہر سے باہر نکال، جس کے رہنے والے ظالم اور ستم گر ہیں، اور ہمارے لئے اپنی طرف سے سرپرست اور اپنی جانب سے ناصرو مددگار مقرر فرما۔''

واضح ہے کہ یہ آیت اور اس کے مشابہ دوسری آیات جو عدل وقسط قائم کرنے یا مظلوموں کے دفاع اور ظالموں کے خلاف جنگ جیسے اہداف سے متعلق گفتگو کرتی ہیں، کسی خاص جگہ یا خاص زمانے تک محدود نہیں اور یہ اہداف ومقاصد اسلام کے بنیادی قوانین میں سے ہیں اور ان مقدس اہداف کے اسباب جہاں اور جب بھی فراہم ہوں تو وقت ضائع کئے بغیر انھیں حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔

اسلامی حکومت کے ارکان

مقدمہ

ہم جانتے ہیں کہ ہر حکومت کو تین بنیادی ارکان کی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر وہ جاری نہیں رہ سکتی۔

1-رکن قانون سازی (مقننہ)

2-رکن انتظامی (انتظامیہ)

3-رکن قضائی (عدلیہ)

سب سے پہلے مرحلے میں حکومت کے پاس ایسے قوانین ہونے چاہیں جو معاشرے کی مشکلات کو حل کریں، لوگوں کے باہمی تعلقات قوانین کے زیر سایہ واضح ہوں اور معاشرہ ترقی کی منزل کی جانب رواں دواں ہو، اس سے قطع نظر کہ اس قانون سازی کا سرچشمہ کیا ہے؟ کیونکہ کبھی اس کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی، کبھی کسی فرد واحد کا ارادہ اور کبھی قانون ساز اسمبلیاں ہوتی ہیں، جن کے بارے میں ہم اس کے بعد گفتگو کریں گے۔ یہاں تک کہ قوانین الٰہی کی بنیاد پر استوار معاشرے جن کے قوانین کا سرچشمہ فقط وحی ہوتا ہے وہ بھی قانون ساز ادارے کے محتاج ہوتے ہیں تاکہ وہ الٰہی قوانین کلی اور روزمرہ کی ضروریات کے درمیان مطابقت پیدا کرے اور جزئی اور وقت کے ساتھ ساتھ موافقت اور ہم آہنگی بخشے، یعنی اصولی قوانین کو فروعی مسائل کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔

قوانین کے روشن اور نافذ العمل ہونے کے لئے تیار اور آمادہ ہونے کے بعد ضروری ہے کہ ان کے نفاذ کی ذمہ داری کچھ لوگوں کے سپرد ہو جو اسے معاشرے میں نافذ کریں اور اگر آئین دستور العمل لکھنے کی ضرورت ہو تو اسے لکھیں وگرنہ اسے فوراً نافذ کردیں، اور اسی کو آج کل کی دنیا میں ''انتظامیہ'' یا ''حکومت'' کہا جاتا ہے۔ حکومت کا ایک سربراہ ہوتا ہے جسے صدر، وزیراعظم یا چانسلر کہا جاتا ہے۔ ان کے ماتحت بھی وزراء، اعلیٰ اور ادنیٰ درجے کے افسران ہوتے ہیں کہ جن کے درمیان ونفاذ کی ذمہ داریاں تقسیم ہوتی ہیں۔ اس طرح سربراہ حکومت ان تمام لوگوں کی مدد کے ذریعے اپنے لائحہ عمل کو نافذ کرتا ہے۔

قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں ممکن ہے عوام، حکومتی اداروں یا حکومت اور عوام کے درمیان مختلف حقوقی موضوعات کے بارے میں شدید اختلافات پیدا ہوجائیں، ایسے میں ظالم ومظلوم صاحب حق اور ناقد حق کے درمیان فرق قائم کرنے والے کسی ادارے کا ہونا ضروری ہے، اسی ادارے کا نام ''عدلیہ'' ہے اور بلاشک اسی ادارے کی طرف سے حکم صادر ہونے کے بعد اس حکم کو نافذ کرنے والے ادارے یعنی ''انتظامیہ'' کی ضرورت ہوتی ہے، جو نہایت احتیاط کے ساتھ ان احکام کو جاری اور نافذ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں معاشرے کے سسٹم کے اندر کچھ دوسرے ادارے بھی موجود ہوتے ہیں، جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مستقل اور جداگانہ ارکان کو تشکیل دیتے ہیں اور ممکن ہے کہ انھیں رکن چہارم یا پنجم سے یاد کیا جائے، جیسے محکمۂ جاسوسی وسراغ رسانی اور محکمہ تعلیم وتربیت یا ذرائع ابلاغ

ونشریات اور عسکری اور انتظامی ادارے وغیرہ۔

لیکن واضح ہے کہ یہ ادارے انتظامیہ ہی کا حصہ ہیں اور یہ انتظامیہ آلہ وابزار کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ذریعے وہ بہتر اور موثر انداز میں قوانین کو نافذ کرسکتی ہے۔ جاسوسی کے مراکز خفیہ سازشوں سے پردہ اٹھاتے ہیں اور ملک کے گوشہ وکنار میں رونما ہونے والے واقعات کی رپورٹ انتظامی اداروں کو دیتے ہیں تا کہ وہ سازشوں کا قلع قمع کر کے معاشرے کی بھلائی اور اس کے حق میں برائی سے آگاہ ہو کر اس کے مقابلے میں ایک مناسب موقف اختیار کریں، اسی طرح تعلیمی اور ابلاغ ونشریات کے ادارے ان کی مدد کرتے ہیں تا کہ وہ اپنی منزل مقصود تک ثقافتی ذرائع سے پہنچ سکیں۔

چونکہ قانون کے نفاذ کا بہترین ذریعہ وہ ثقافت ہوتی ہے جو معاشرے کو اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ خود ان قوانین کو اپنے اوپر لاگو کریں اور لِیَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ یعنی: "تا کہ لوگ خود قیام عدالت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں" کا مصداق اور مثال بن جائیں اسی طرح وہ مراکز بھی جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قرآنی آیات کی روشنی میں ان ارکان (حکومت) کے کردار کا مطالعہ کرتے ہیں۔

اسلام میں قانون سازی کا نظام

اشارہ

قرآن، حدیث اور علمائے اسلام کے نقطۂ نظر سے قانون بنانا دراصل خدا کا کام ہے، درحقیقت قانون سازی کا موضوع توحید افعالی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، جس طرح خدا تعالی بطور مطلق عالم موجودات اور عالم انسانی پر حاکم ہے، اسی طرح قانون سازی کا حاکم بھی وہی ہے۔ (غور فرمائیں)

یہ موضوع آیات وروایات میں واضح طور پر ذکر ہونے کے علاوہ عقلی دلیل کے بھی مطابق ہے، چونکہ حقیقی قانون ساز وہی ہوسکتا ہے جس میں درج ذیل شرائط موجود ہوں:

1۔ قانون ساز، انسان اور اس کی جسمانی ونفسانی (روحانی) خصوصیات سے مکمل طور پر آگاہ ہو، یعنی وہ مکمل انسان شناس ہو، اس کے وجود کے تمام اسرار، جذبات، میلانات، غرائز، خواہشات، ہویٰ وہوس اور فطری مسائل سے مکمل طور پر باخبر ہو، اسی طرح افراد و معاشرے کی پوشیدہ صلاحیتوں سے جن کی وہ استعداد رکھتے ہیں، کامل طور پر آگاہ ہو، مختصر یہ کہ انسان کے جسم وجان میں موجود کسی چیز سے بے خبر نہ ہو۔

2۔ اسے مکمل طور پر اس بات کا علم ہو کہ عالم موجودات کی تمام اشیاء کی خصوصیات کیا ہیں اور وہ انسان کے وجود کے ساتھ کیا مناسبت رکھتی ہیں، اسی طرح اسے اس بات کا بھی کما حقہ علم ہو کہ انفرادی اور اجتماعی امور میں سے کون سے امور مصلحت پر مبنی اور کون سے امور برُائی کو جڑ ہیں اور ان کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔

3۔ وہ تمام واقعات وحادثات جو ممکن ہے مستقبل قریب یا بعید میں پیش آئیں ان کا انسان کی سرنوشت کے ساتھ کیا تعلق ہے یہ سب اس کے لئے جاننا ضروری ہے۔

4۔ حقیقی قانون ساز وہ ہے جو ہر قسم کی لغزش، گناہ، خطا اور اشتباہ سے پاک ہو اور اسی طرح مہربان اور مضبوط ارادے کا مالک بھی ہو اور دنیا کی کسی طاقت سے خائف نہ ہو۔

5۔ عالم بشریت میں اس کے ذاتی فوائد ومنافع کا شائبہ موجود نہ ہو، چونکہ کہ اگر وہ ایسا ہو تو قانون سازی کے وقت شعوری یا لاشعوری طور پر وہ قانون میں اپنے منافع وفوائد کا لحاظ رکھے گا اور معاشرے کے فوائد کو اپنے فوائد کی بھینٹ چڑھا دے گا۔ کیا ایسی صفات خدا تعالی کے علاوہ کسی اور کے اندر موجود ہیں؟ کیا کوئی ایسا ہے جو یہ کہے: میں انسان اور اس کی تمام خصوصیات کو جانتا ہوں؟ جبکہ عظیم ترین صاحبان علم ودانش اس سوال کے جواب میں عاجزی اور ناتوانی کا اظہار کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے انسان کو باقاعدہ طور پر ایسی مخلوق کے طور پر متعارف کرایا ہے، جسے پہچانا نہیں گیا، بلکہ انھوں نے اپنی کتابوں کے لئے بھی اسی عنوان کو منتخب کیا ہے (یعنی انسان ایک ایسا موجود

جس کو نہیں پہچانا گیا)۔کیا کوئی ایسا شخص ہے جو انسان کے ماضی اور مستقبل یا اس کے حال کے ساتھ تعلق سے آگاہ ہو؟ کیا کوئی ایسا شخص موجود ہے جو تمام موجودات کے اسرار اور ان کے آثار وخواص کے بارے میں آگاہ ہو اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے پاک ہو؟

یقیناً خدا اور اس کی طرف سے بھیجے گئے افراد کے علاوہ کوئی بھی ان صفات کا حامل نہیں۔اس مختصر اشارے سے بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حقیقی قانون ساز خدا تعالیٰ ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور وہی اس کے وجود کے تمام اسرار سے آگاہ ہے اور سارے موجودات کے اسرار کو بھی جانتا اور گذشتہ وآئندہ کے واقعات سے باخبر ہے اور اُن کے موجودہ حالات سے پیدا ہونے والے تعلقات کو بھی جانتا ہے۔وہ ہر قسم کی لغزش وخطا سے پاک ہے اور کسی سے خائف نہیں اس کی ذات میں کوئی کمی نہیں کہ وہ قانون سازی کے طریقے سے اسے پورا کرے، بلکہ وہ تشکیل قوانین میں فقط بندگان کے فوائد کو ملحوظ رکھتا ہے۔مزید یہ کہ پورے عالم پر اس کی حکومت وحاکمیت ہے اور معقول نہیں کہ کوئی اس کی قلمرو میں اس کے بغیر امر ونہی انجام دے بلکہ دوسروں کے امر ونہی اور قانون کو اس کے قانون کی بجائے قبول کرنا ایک قسم کا شرک اور گمراہی ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف رجوع کر کے ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جو قانون سازی کو فقط خدا تعالیٰ کے ساتھ مختص قرار دیتی ہیں:

۱۔مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا﴿۲۶﴾ (کہف/۲۶)

۲۔وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ (شوریٰ/۱۰)

۳۔وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴿۴۴﴾ (مائدہ/۴۴)

۴۔وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴿۴۵﴾ (مائدہ/۴۵)

۵۔وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴿۴۷﴾ (مائدہ/۴۷)

۶۔وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ (مائدہ/۴۹)

۷۔اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴿۵۰﴾ (مائدہ/۵۰)

۸۔اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۵۱﴾ (نور/۵۱)

۹۔وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۱۵۳﴾ (انعام/۱۵۳)

۱۰۔اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (مائدہ/۳)

ترجمہ:

1۔ان کا اس کے علاوہ کوئی ولی اور سرپرست نہیں !اور وہ کسی کو اپنے حکم میں شریک نہیں کرتے !

2۔جس چیز کے بارے میں بھی تمہیں اختلاف ہو اس کا حکم (فیصلہ) خدا کے پاس ہے۔

3۔اور جو کوئی بھی خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر ہے۔

4۔خدا کی طرف سے نازل شدہ احکام پر عمل نہ کرنے والا، ظالم اور ستمگر ہے۔

5۔جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق عمل نہیں کرتے، فاسق ہیں۔

6۔اور ان (اہل کتاب) کے درمیان خدا کی طرف سے نازل شدہ احکام کے مطابق فیصلہ کرو اور ان کی ہوس کی پیروی نہ کرو اور ان سے ہوشیار رہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں ان بعض احکام سے منحرف کردیں جو خدا نے تم پر نازل کئے ہیں!

7۔کیا وہ لوگ (تم سے) حکم جاہلیت کے خواہاں ہیں؟! اہل یقین لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ سے بہتر کون فیصلہ کرتا ہے؟

8۔جب اہل ایمان کو خدا اور رسول کی طرف دعوت دی جائے تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ فقط یہی کہتے ہیں کہ ''ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی'' اور یہی لوگ حقیقی کامیاب ہیں۔

9۔''یہ میری سیدھی راہ ہے اس کی پیروی کرو!'' اور انحرافی راہ پر مت چلو کیونکہ وہ تمہیں راہ حق سے دور کر دے گی! اور یہ وہ چیز ہے جس کی خدا تمہیں تاکید کرتا ہے، شاید تم لوگ پرہیزگار بن جاؤ!

10۔آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا اور اسلام کو تمہارے لئے میں نے دین کے طور پر پسند کیا۔

آیات کی تفسیر

پہلی سات آیتوں میں گفتگو اس بارے میں ہے کہ حکم فقط خدا کا ہے اور سب کے لئے اس کی پیروی کرنا لازم ہے۔ درست ہے کہ حکم کا معنیٰ ''منع'' کرنا ہے۔[1] لیکن چونکہ امر و نہی اور فرمان، غلط کام سے منع کرنے کا سبب ہوتے ہیں اس لئے انھیں حکم کہا جاتا ہے اور علم و دانش کو حکمت سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جاہلانہ اور غیر عاقلانہ اعمال سے منع کرتے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ

---

[1] مصابیح اللغۃ و مصباح اللغۃ اور مفردات راغب کی طرف رجوع کیا جائے۔

''حکم''،فیصلے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور امرونہی اور فرمان کے معنی میں بھی، جہاں اس سے مراد فیصلہ ہو وہاں بھی ایک قسم کا امرونہی اور فرمان ہی ہوتا ہے جسے قاضی صادر کرتا ہے۔

مذکورہ بیان پر توجہ کے پیش نظر ہم آیات کی طرف دوبارہ رجوع کرتے ہیں، پہلی آیت حاکمیت،حکومت، امرونہی اور ولایت کو خدا کے لئے مخصوص قرار دیتے ہوئے فرماتی ہے:

''وہ لوگ اس کے علاوہ کسی کو اپنا ولی اور سرپرست نہیں رکھتے اور خدا نے اپنے حکم میں کسی کو اپنا شریک نہیں بنایا''

مَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِىٍّ وَلَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

حقیقت میں آیت کا پہلا اور آخری حصہ علت ومعلول کی مانند ہے، چونکہ کہ جب ولایت خدا کے لئے خاص ہو تو فطری بات ہے کہ حکم،فرمان اور قانون بھی اسی کا ہوگا۔واضح ہے کہ ''حکم'' سے یہاں مراد امرونہی بھی ہے اور حکومت وقضاوت بھی کیونکہ یہ سب ولایت کی فروع (شعبے) ہیں اور چونکہ ولایت اس کے ساتھ خاص ہے لہٰذا حکم بھی اسی کا ہے، بلکہ بعض حضرات کی رائے میں حکم سے مراد خدا تعالیٰ کی عالم تخلیق پر تکوینی حاکمیت بھی ہے کیونکہ اس کی ولایت قانون سازی اور تکوین (تخلیق) دونوں پر ثابت ہے پس اس کی حاکمیت کا دائرہ نہایت وسیع اور عمومی ہے۔

دوسری آیت میں خدا کے فیصلے کے بارے میں ہے۔ارشاد فرماتا ہے:

''جس چیز کے بارے میں تم اختلاف میں پڑ جاؤ اس کا فیصلہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے''

وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِيۡهِ مِنۡ شَىۡءٍ فَحُكۡمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ

آیت کے ذیل میں فرمایا گیا ہے:

''یہ ہے اللہ میرا پروردگار، میرا توکل اسی پر ہے اور میں نے اسی کی طرف واپس جانا ہے۔''

"ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّىۡ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ اُنِيۡبُ"

کیونکہ ہر چیز (خاص طور پر حکم وقضاوت) اسی کے لئے ہے، لہٰذا اسی پر توکل کرنا چاہیے اور اسی کی طرف بازگشت بھی ہونی چاہیے۔ اور چونکہ فیصلہ اور قضاوت حکم اور قانون سے جدا نہیں اور اصطلاحی طور پر اکثر اختلافات کا تعلق ''شبہۂ حکمیہ'' سے ہے نہ ''شبہۂ موضوعیہ'' سے پس معلوم ہوا: حکم وفرمان اور قانون سبھی اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں آیت میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہے جو خدا کے نازل کئے گئے احکامات پر عمل نہیں کرتے اور انھیں بالکل اہمیت نہیں دیتے، دوسرے الفاظ میں خدا کے احکام کے علاوہ دوسرے احکام کی پیروی کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو ایک آیت میں ''کافر'' دوسری میں ''ظالم'' اور تیسری میں ''فاسق'' کہا گیا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ"

وہ لوگ جو کافر ہیں وہ اس وجہ سے کہ انھوں نے توحید افعالی کی ایک شاخ یعنی ؛ اللہ کی حاکمیت کی توحید کو فراموش کر دیا ہے، توحید کی یہ فرع (شاخ) کہتی ہے: خدا کا غیر نہ حکم و فرمان کا حق رکھتا ہے نہ حکومت و قضاوت کا، بطور مسلم جو کوئی بھی اس قانون سے انحراف کرے، وہ ایک طرح کے شرک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

وہ اس وجہ سے ظالم ہیں، کہ خود پر اور دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور وہ احکام جو ان کی خوش بختی کا باعث اور ترقی کا سبب ہیں، انھوں نے ان کو چھوڑ دیا ہے اور ان احکام کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں جو بے قیمت یا کم قیمت ہیں اور جن کے پیش نظر محدود انسانی مصلحتیں ہیں۔ اور وہ اس لیے فاسق ہیں، کہ بندگی اور عبودیت کی سرحدوں سے نکل چکے ہیں، چونکہ "فسق" کا مطلب ذمہ داری اور فرمان سے خارج ہونا ہے۔

ان تین آیات میں (کافر، ظالم اور فاسق) کی یہ تین مختلف تعبیرات بہت نپی تلی ہیں اور ممکن ہے کہ ان کا قانون الٰہی کے تین پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو، چونکہ قانون ایک طرف سے قانون ساز تک جا کر ختم ہو جاتا ہے کہ اس صورت میں اس کی مخالفت کفر ہے، اور دوسری طرف سے بندگان خدا پر ختم ہوتا ہے کہ اس صورت میں اس کی مخالفت ظلم ہے اور تیسری طرف سے حاکم اور قاضی پر ختم ہوتا ہے کہ اگر ان کا فیصلہ خدا تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو تو ایسی حالت میں یہ فسق ہے۔

چھٹی آیت میں رسول اکرمؐ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان خدا کے نازل کئے احکام کے مطابق فیصلہ کریں اور اس سلسلے میں ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور ہوشیار رہیں کہ وہ آپؐ کو خدا کے بعض نازل کردہ احکام سے منحرف نہ کر دیں:

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ

جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرنے اور خواہشات نفس کی پیروی کے درمیان موازنہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کوئی خدا کے حکم سے سرتابی اور روگردانی کرتا ہے خواہشات نفس کی ہولناک کھائی میں گر جاتا ہے اور ان سے ہوشیار رہنے کا حکم اور یہ کہ وہ تمہیں فریب میں مبتلا نہ کر دیں اسی تاکید کی تجدید ہے کہ احکام الٰہی کی پیروی اور شیطانی وسوسوں کے خلاف استقامت ہونی چاہیے۔ بلاشبہ رسول اکرمؐ عصمت کے باعث ان کے فریب میں مبتلا نہیں ہو سکتے لیکن مذکورہ بالا بیان بقیہ صاحبان ایمان لوگوں کے لئے ایک درس ہے کہ وہ دشمن کی چالوں کا شکار نہ ہوں اور احکام الٰہی سے انحراف نہ کریں۔

مفسرین نے اس آیت کا جو شان نزول بیان کی ہے اس کے پیش نظر مذکورہ آیت اختلافات و تنازعات کے بارے میں ہے اور کلمہ "بینھم" (ان کے درمیان) بھی اسی مطلب کا ترجمان ہے لیکن تسلیم شدہ بات ہے کہ قضاوت اور فیصلے کو حکم خدا اور اس کے قانون کے مطابق ہونا چاہیے اور آیت شریفہ کا مفہوم یہ ہے کہ قضاوت کو ان احکام کے مطابق ہونا چاہیے جنھیں خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ بعد

والی آیت جو قرآن مجید میں مذکورہ آیت کے بعد قرار دی گئی ہے، فرماتی ہے: ''کیا وہ لوگ تم سے جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں؟ وہ لوگ (جو خدا، روز قیامت اور تمہاری نبوت پر) یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے بڑھ کر کون بہتر فیصلہ کر سکتا ہے؟!

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

یہاں خدا کے غیر کے احکام کو احکام جاہلیت قرار دیا گیا ہے۔ وہ احکام جو جہل و نادانی اور خواہشات نفس سے جنم لیتے ہیں اگر ہم درست انداز میں سوچیں تو پتہ چلے گا کہ یہ مطلب زمانۂ رسول اکرمؐ آپؐ کے جاہلیت کے خلاف قیام کرنے کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر غیر الٰہی جہالت کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے، اس لئے کہ یقینی طور پر انسان کا علم محدود ہے، نہ اسے اپنے وجود کی خصوصیات اور اس کے مختلف گوشوں کا پورا علم ہے اور نہ ان حوادث کا کامل علم ہے جو ماضی، حال اور مستقبل میں پیش آتے ہیں جو احکام کی مصلحتوں اور مفسدوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس کے علاوہ چونکہ معاشرے میں موجود ہر شخص کے ذاتی منافع اور میلانات وجذبات ہوتے ہیں لہٰذا قانون سازی کے وقت وہ اپنے آپ کو ان سے جدا نہیں کر سکتے، فقط خدا ہے جو ہر چیز سے آگاہ اور ہر ایک سے بے نیاز ہے۔ ''برسوئی''، تفسیر روح البیان میں جاہلیت کے مفہوم کے بارے میں کہتا ہے: ''اس سے مراد ہر وہ چیز (حکم) ہے جو وحی اور قرآن کے مطابق نہ ہو''[1]

تفسیر فی ظلال القرآن میں ہے: ''جاہلیت سے مراد کوئی خاص زمانہ نہیں بلکہ مراد وہ مخصوص حالات ہیں جو ماضی میں تھے آج بھی ہو سکتے ہیں اور مستقبل میں بھی، جاہلیت جیسا کہ قرآن نے اس کی توصیف کی ہے انسان کے لئے انسان کے حکم سے عبارت ہے، اس لئے کہ انسان کا انسان کی بندگی اور اس کی پیروی کرنا یعنی خدا کی بندگی سے خارج ہو جانا ہے۔''[2]

تفسیر مجمع البیان میں بعض قدیمی مفسرین سے منقول ہے کہ: جاہلیت سے مراد اس زمانے کے یہودیوں کے افعال ہیں جو معاشرے کے کمزور افراد کے خلاف تورات کے احکام جاری کرتے تھے لیکن اگر عمائدین اور طاقتور افراد کسی گناہ کا ارتکاب کرتے تو ان کا کوئی مواخذہ نہ کرتے تھے، اسی طرح بعض دوسرے مفسرین سے منقول ہے کہ جاہلیت کے مفہوم میں بت پرست بھی داخل ہیں اور اہل کتاب بھی ہیں۔[3]

اس قسم کی غیر منصفانہ ترجیحات جو ہمارے زمانے میں بھی موجود ہیں اور قوانین بھی ملکوں کے اندر اور بین الاقوامی سطح پر صرف کمزوروں پر لاگو ہوتے ہیں اور طاقتور لوگ غالباً ان سے مستثنیٰ ہوتے ہیں یہ سب جاہلی معاشروں کے وجود کی علامت ہیں! قابل توجہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا بہت ساری آیات جو اس بات کی ترجمان ہیں کہ قانون سازی کا حق صرف خدا کو حاصل ہے، ان آیات کا تعلق

---

[1] تفسیر روح البیان، ج ۲، صفحہ ۴۱۰

[2] فی ظلال القرآن، ج ۲، ص ۷۵۱۔

[3] جملہ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ میں ایک مذوف موجود ہے بعض نے کہا ہے کہ اس کی حقیقت صورت افحکم الامة الجاهلية ہے بعض نے نزدیک افحکم حکم الجاهلية ہے (تفسیر قرطبی اور تفسری مجمع البیان، ذیل آیت موضوع بحث) یا حکام الجاهلية

سورہ مائدہ سے ہے جو مشہور قول کے مطابق آخری سورہ ہے یا ان آخری سوروں میں سے ایک ہے جو رسول اکرمؐ پر نازل ہوا، اور اس میں بہت سے اہم اسلامی مسائل اور حکومت جو اہم اسلامی رکن ہے کے بارے میں مسائل پیش کئے گئے ہیں اور اس سورے کی متعدد آیات میں تاکیداً بیان ہوا ہے کہ حکم و فرمان اور قانون سازی صرف خدا تعالیٰ کا حق ہے اور اس سورے میں ان تاکیدات بہت سے معانی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

آٹھویں آیت خدا پر ایمان اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہے: ''جب اہل ایمان کو خدا اور رسول کی طرف دعوت دی جائے تا کہ وہ ان کے درمیان حکم کرے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔'' بعض تفاسیر میں اس کے بعد والی آیات کا یہ شان نزول بیان ہوا ہے کہ کچھ منافقین نے جب اپنی حالت کو متزلزل پایا تو وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ ہم آپؐ کے ہر فرمان کی اطاعت کرتے ہیں۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت جو منافقین کے مدمقابل اہل ایمان کے بارے میں ہے، اس میں مومنین یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہم خدا کے ہر فرمان کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں اور اس کے فرمان کے علاوہ ہر فرمان کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں اور اگر اس سے مراد صرف قضاوت اور فیصلہ ہو تو بھی ہمارے مقصود پر اس کی دلالت واضح ہے، چونکہ کہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں: قضاوت کو بھی کسی قانون کی اساس پر عملی صورت حاصل ہوتی ہے، لہٰذا خدا اور رسول کی قضاوت کے سامنے سر جھکانا قانون الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے برابر ہے، اسی لئے قاضی حضرات اپنے احکام صادر کرتے وقت ایک یا چند قانونی مآخذ پر اعتماد کرتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر حکم صادر کرتے ہیں، اہل ایمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوانین الٰہی کے مآخذ پر اعتبار کریں اور انھیں اپنی سند قرار دیں۔

نویں آیت میں پہلی آیت کا مضمون بیان ہوا ہے (یعنی ترک شرک، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، اولاد کو ہلاک کرنے سے اجتناب، بطور مجموعی بے گناہوں کا خون بہانے اور برے عمل انجام دینے سے پرہیز کرنا) اور ان سارے امور کے آخر میں آیت فرماتی ہے:

''یہ میری سیدھی راہ ہے اس کی پیروی کرو اور مختلف راہوں اور (غلط قوانین) کی پیروی نہ کرو کیونکہ یہ تمھیں صراط مستقیم اور حق کی راہ سے دور کر دیں گے یہ وہ چیز ہے جس کی خدا تمھیں تاکید کرتا ہے تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔''

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۱۵۳﴾

اس تعبیر سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ صراط مستقیم سے مُراد قانون، حکم اور فرمان الٰہی ہی ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ غلط اور غیر صحیح راہیں ہیں۔ جو لوگوں کو خدا کی سیدھی راہ سے دور کر دیتی ہیں اسی طرح اس بیان سے یہ استفادہ بھی ہوتا ہے کہ دوسری راہوں کو طے کرنا اور ان پر چلنا تفرقے اور انتشار کا سبب ہے۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ تمام انسانوں بلکہ بڑے بڑے دانشور بھی تمام

کاموں کے مصالح (فوائد) اور مفاسد (نقصانات) کی تشخیص میں مختلف نظر رکھتے ہیں، اور اگر قانون سازی کا فریضہ انسان کے سپرد کر دیا جائے تو انسانی معاشرے پر ایک دائمی اختلاف وانتشار حاکم ہو جائے گا۔ ''ابن مسعود'' رسول اکرمؐ سے ایک حدیث میں نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایک خط مستقیم کھینچا، پھر فرمایا: ''یہی راہ درست ہے پھر اس کے دائیں اور بائیں طرف سے مختلف خطوط کھینچے اور فرمایا: یہ راہیں متفرق ہیں ان میں سے ہر ایک پر ایک شیطان بیٹھا ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔''[۱]

دسویں اور آخری موضوع بحث آیت میں اگر چہ براہ راست یہ نہیں کہا گیا کہ قانون سازی فقط خدا کا حق ہے، لیکن اس کے مضمون سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی کے لئے قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں، آیت فرماتی ہے۔

''آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا اور اسلام کو تمہارے لیے ایک جاودانی دین کے طور پر پسند کر لیا ہے۔''

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

معلوم ہے کہ دین اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ انسان کے تمام احوال کا احاطہ کرتا ہے اور اس بات کے پیش نظر کہ اسلام ادیان کا خاتمہ کرنے والا اور آخر تک باقی رہنے والا دین ہے، آیت شریفہ کا یہ مفہوم ہے کہ دنیا کے اختتام تک جن قوانین کی انسان کو ضرورت ہے، اسلام نے انھیں اپنے پیش نظر رکھا ہے، اس لحاظ سے کسی کے لئے کسی قانون سازی کی ضرورت اور گنجائش باقی نہیں رہتی۔

البتہ ان قوانین میں سے بعض خاص اور جزئی ہیں جبکہ بعض عام اور کلی ہیں اسلامی قانون ساز افراد اور علماء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان عام قوانین وقواعد اور ان کے مصادیق کے درمیان مطابقت پیدا کریں اور اس طرح ضروری قوانین کو ان عام اور کلی قواعد سے اخذ کریں۔

روایات میں بھی اس مطلب کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور حضرت علیؑ نے بھی ان لوگوں کی مذمت میں تفصیلی طور پر بیان کیا ہے جو اپنے آپ کو اسلامی معاشرے میں قانون سازی کا مجاز سمجھتے تھے اور اپنے اس عمل کو اجتہاد کا نام دیتے تھے، آپؑ کے بیان کا ایک حصہ یہ ہے:

اَمْ اَنْزَلَ اللّٰهُ سُبحانَهُ دیناً ناقِصاً فَاسْتَعانَ بِهِمْ عَلى اِتْمامِهِ اَمْ كانُوا شُرَكاءَ لَهُ فَلَهُمْ اَنْ يَقُولُوا وَعَلَيْهِ اَنْ يَرْضَى"

یعنی: ''کیا خدا نے ناقص دین نازل کیا تھا جو اس نے ان لوگوں سے اسے مکمل کرنے کی خواہش کی ہے؟ یا یہ لوگ خدا کے شریک ہیں جنھیں یہ حق دیا گیا ہے کہ جو چاہیں کہیں اور (قانون بنائیں) اور خدا پر لازم ہے کہ وہ ان کے اس عمل سے راضی ہو اور اسے قبول کرے؟''[۲]

---

[۱] تفسیر فخر رازی ج ۱۴، ص ۳۔

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۔

کئی ایک روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلامی امت کے لئے تمام ضروری امور کو اسلامی قوانین میں پیش نظر رکھا گیا ہے، اگر چہ وہ کسی کے بدن پر لگائی جانے والی خراش کی دیت ہی کیوں نہ ہو اور یہ کہ ان احکام کو ان کے اصل افراد سے لیا جائے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں قانون بنانا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور دوسروں کے لئے اس سلسلے میں کوئی جگہ نہیں۔

اس بناء پر جو عمل اسلامی قانون ساز اسمبلی میں انجام دیا جاتا ہے وہ کلی اور عام قاعدوں پر خاص اور جزئی مصادیق کی تطبیق کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔امام محمد باقر -نے ایک حدیث میں فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ تَبارَكَ وَتَعالی لَمْ يَدَعْ شَيْئاً يَحْتاجُ اِلَيْهِ الاُمَّةُ اِلاّٰ اَنْزَلَهُ فِی كِتابِهِ وَ بَيَّنَهُ لِرَسُوْلِهِ"

''خدا تعالیٰ نے امت کی ضرورت کی کسی چیز کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا اور اپنے رسول کے لئے اسے واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔'' [۱]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"ما مِنْ شَيْئٍ اِلاّٰ وَفيهِ كِتاب وَسُنَّة"

''ہر چیز کے بارے میں کتاب وسنت میں حکم بیان ہوا ہے۔'' [۲]

دوسری روایات میں ذکر ہوا ہے کہ امت اسلامی کے لئے تمام ضروری قوانین واحکام تشکیل دیئے گئے ہیں، ان میں سے ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"ما تَرَكَ عَلِیٌّ شَيْئاً اِلاّٰ كَتَبَهُ حَتّٰی اَرْشِ الْخَدْشِ"

''علی -نے کسی قانون کو نہ چھوڑا بلکہ رسول اکرمؐ کی املاء سے علیؑ نے ہر حکم کو تحریر کیا یہاں تک کہ خراش کی دیت کو بھی لکھا۔'' [۳]

اس قسم کی احادیث سے مزید آگاہی کے لئے جامع الاحادیث جلد ۱، مقدمات کے باب ۴ کی طرف رجوع کیا جائے۔

---

[۱] اصول کافی، ج۱، ص۵۹، حدیث ۲۔

[۲] اصول کافی، ج۱، ص۵۹، حدیث ۴

[۳] جامع احادیث الشیعہ، ج۱، باب۴، ابواب مقدمات، حدیث ۲۶

کیارسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام قانون سازی کا حق رکھتے ہیں؟

ولایت تشریعی کا موضوع یا سادہ الفاظ میں رسول اکرمؐ اور ائمہؑ کے لئے قانون سازی کے حق کا ثابت ہونا بہت پیچیدہ موضوع ہے، کہ جس کے بارے میں احادیث میں بہت گفتگو کی گئی ہے۔کیا رسول اکرمؐ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپؐ جس چیز کو مصلحت کے مطابق پائیں اسے مسلمانوں کے لئے ایک قانون کی حیثیت دے دیں خواہ خدا کی طرف سے اس کے بارے میں خصوصی طور پر وحی نازل نہ ہوئی ہو؟ بلاشک یہ بات محال اور ناممکن نہیں، البتہ اس شرط کے ساتھ کہ خدا نے انھیں ایسا حق (حق قانون سازی) دے رکھا ہو، بحث اس بارے میں ہے کہ کیا ایسا امر وقوع پذیر ہوا ہے یا نہیں اور دلائل نقلی اس کی گواہی دیتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے پاس بکثرت روایات موجود ہیں (جن میں سے کچھ صحیح اور کچھ ضعیف ہیں) جو یہ کہتی ہیں:

خدا تعالیٰ نے رسول اکرمؐ اور ان کے بعد اوصیاء کو ''تفویض امر'' کیا ہے (تفویض امر سے مراد قانون سازی کا حق ہے)۔مرحوم کلینی نے ''تفویض'' سے متعلق احادیث کو اصول کافی کی جلد اول کے ایک باب میں جمع کیا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے دس روایات نقل کی ہیں جن میں سے امام محمد باقر -اور امام جعفر صادق -سے مروی حدیث میں فرمایا گیا ہے:

''اِنَّ اللّٰہَ تَبارَکَ وَتَعالی فَوَّضَ اِلی نَبِیِّهِ اَمْرَ خَلْقِهِ لِیَنْظُرَ کَیْفَ طاعَتُهُمْ ثُمَّ تَلی هذِهِ الآیَةَ وَ ما آتاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَ ما نَهاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا''

''خدا تعالیٰ نے لوگوں کے امور کو رسول اکرمؐ کے سپرد (تفویض) کیا تاکہ وہ ملاحظہ کرے کہ لوگ کیسے اطاعت کرتے ہیں، پھر آپؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ ہر اس چیز کو جس کا رسول حکم دیں لے لو اور اس پر عمل کرو اور جس چیز سے تمھیں روکیں اس سے رک جاؤ۔'' [1]

امام جعفر صادقؑ کی ایک اور حدیث میں ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ اَدَّبَ نَبِیَّهُ عَلی مَحَبَّتِهِ فَقالَ وَاِنَّکَ لَعَلی خُلُقٍ عَظیمٍ ثُمَّ فَوَّضَ اِلَیْهِ فَقالَ عَزَّوَجَلَّ وَ ما آتاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَما نَهاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا، وَقالَ عَزَّوَجَلَّ مَنْ یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطاعَ اللّٰہَ...:

'خدا تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو اپنی محبت سے آشنا کیا اور انھیں پروان چڑھایا پھر فرمایا: تم عظیم اخلاق کے مالک ہو پھر انھیں امر تفویض کیا اور فرمایا: جو کچھ رسول تمہارے لئے لائے اسے لے لو اور جس چیز سے تمھیں منع

---

[1] اصول کافی، ج۱،ص۲۶۷، حدیث ۵

کرے اس سے باز آجاؤ اور فرمایا: جس نے رسول خداؐ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی ہے"[1]

مذکورہ بالا عبارت میں ایسے قرائن وشواہد موجود ہیں جو بخوبی ظاہر کرتے ہیں کہ تفویض سے مراد کیا ہے۔ ان روایات میں سے بعض میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے اس تفویض کے بعد رسول اکرمؐ نے چند قوانین وضع کئے؛ مثلاً خدا نے نماز کو دو رکعت قرار دیا اور رسول اکرمؐ نے (نماز ظہر، عصر اور عشاء میں) دو رکعت کا اضافہ کر دیا اور نماز مغرب میں ایک رکعت کا اور رسول اکرمؐ کی یہ قانون سازی فریضہ الٰہی کے ہم پلہ اور واجب ہے۔ اسی طرح آپؐ نے ۳۴ رکعت (فرائض کے دوگنا) کو نماز نافلہ کے عنوان سے فرائض پر اضافہ کیا، خدا تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے اور رسول اکرمؐ نے ماہ شعبان اور ہر ماہ کے تین روزے مستحب قرار دیئے۔[2]

دوسری احادیث جو رسول اکرمؐ کو قانون سازی کا حق دینے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان میں رسول اکرمؐ کی قانون سازی کے اور نمونے بھی ملتے ہیں۔[3]

تفویض امر (امر کی سپردگی) سے مراد کیا ہے؟ اس بارے میں چند احتمالات ہیں:

۱۔ قانون سازی کا رسول اکرمؐ کو مکمل اختیار۔

۲۔ محدود مواقع پر میں جزئی طور پر قانون سازی کا اختیار کچھ اس طریقے سے کہ رسول اکرمؐ نے احکام الٰہی کے نزول سے پہلے یا بعد میں کچھ قوانین بنائے ہیں جنھیں خدا تعالیٰ کی تائید حاصل ہوئی ہے۔

۳۔ عطا کرنے اور محروم کرنے کی تفویض واختیار (یعنی جسے چاہیں مصلحت کی بناء پر بیت المال سے عطا کریں اور جسے چاہیں عطا نہ کریں)

۴۔ امور حکومت، تدبیر وسیاست، حفاظت نظام اور نفوس کی تربیت کی تفویض واختیار۔

۵۔ اسرار کے بیان کا اختیار، یعنی احکام واسرار میں سے جنھیں چاہیں بیان کریں اور جن کے اظہار میں مصلحت نہ ہو، بیان نہ کریں۔ باب تفویض میں نقل ہونے والی روایات سے احتمال نمبر دو کا مفہوم ہی اخذ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ رسول اکرمؐ نے محدود مقامات پر خدا تعالیٰ کے اذن سے قانون سازی کی ہے (شاید ان کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہو) اور اس بات کو خدا کی طرف سے تائید حاصل ہوئی ہے، دوسرے الفاظ میں خدا تعالیٰ نے یہ اختیار آپؐ کو دیا ہے کہ آپؐ بعض صورتوں میں قانون تشکیل دیں اور پھر اس کی تائید کر دیں۔

اسی ضمن میں ان روایات سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انھیں یہ مقام چند وجوہات کی بناء پر عطا کیا ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کے مقام کی عظمت کو ظاہر کرے کہ ان کی قانون سازی خدا کی قانون سازی کے ہم پلہ ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگوں کا امتحان لے کہ وہ کس قدر رسولؐ کے فرمانبردار ہیں، تیسری یہ کہ خدا نے ان کی تائید وحمایت روح القدس کے ذریعے فرمائی ہے اور اس طرح

---

[1] اصول کافی، ج ۱، ص ۲۶۵، حدیث ۱

[2] اصول کافی، ج ۱، ص ۲۶۶، حدیث ۴

[3] روایات تفویض کی تحقیق اور وضاحت کیلئے کتاب انوار الفقاھۃ، جلد اول، صفحہ ۵۵۲ تا ۵۸۵ کا مطالعہ فرمائیں۔

انھیں احکام واسرار الٰہی سے آشنا کیا ہے۔ مذکورہ بالا بیان سے چند نکتے واضح ہوجاتے ہیں:

1۔ روایات تفویض سے مجموعی طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو اجمالی طور پر ولایت تشریعی عطا کی ہے اور یہ بات ایک طرف سے اطاعت خلق کے امتحان کے لئے اور دوسری طرف سے رسول اکرمؐ کی خدا کے نزدیک عظمت ومنزلت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

2۔ یہ تفویض کلیت اور عمومیت نہیں رکھتی بلکہ محدود اور گنے چنے حالات میں واقع ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ غالباً اہم مسائل کے بارے میں جب آپؐ سے پوچھا جاتا تو آپؐ وحی کا انتظار کرتے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ تفویض عمومیت کی حامل نہیں تھی، وگرنہ رسولؐ وحی کا انتظار کئے بغیر خود ہی قانون بناڈالتے۔ (غور فرمائیں)

3۔ یہ اعلیٰ مقام رسولؐ کو خدا کے اذن واجازت کے ساتھ عطا ہوا ہے اس کے علاوہ رسولؐ کے ہاتھوں بعض قوانین کی تشکیل کے بعد خدا ان کی تائید کردیتا تھا، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ ایک سے زیادہ قانون ساز ہیں بلکہ رسولؐ کی قانون سازی خدا ہی کی قانون سازی کی فرع اور اسی کا جلوہ ہے۔

4۔ یہ اعلیٰ مقام رسولؐ کو خدا کی طرف سے تائید شدہ ہونے کے بعد عطا ہوا اور جب آپؐ کو روح القدس کے ذریعے قوت عطا کر دی گئی لہٰذا آپؐ معصوم تھے اور آپؐ سے کسی خطا ولغزش کے سرزد ہونے کا امکان نہ تھا، اس بناء پر جو لوگ ان صفات کے حامل نہ ہوں یہ سب ان کے لئے ثابت نہیں ہوسکتا۔

5۔ ائمہ معصومینؑ اگرچہ روح القدس کی تائید کے حامل تھے اور ہر لغزش وخطا سے پاک وپاکیزہ، لیکن انھوں نے جدید قانون سازی نہیں کی اس لئے کہ اکمال دین اور اتمام نعمت کے بعد امت کے لئے ضروری تمام احکامات' ان روایات کے مطابق جو حد تواتر کو پہنچتی ہوئی ہیں' قانون کے طور پر وضع کئے جاچکے تھے اور نئی قانون سازی کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، اس بناء پر ائمہ معصومینؑ کی ذمہ داری ان احکام کی توضیح تھی جو انھیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر رسول اکرمؐ سے حاصل ہوئے تھے۔

سوال

ممکن ہے کہا جائے کہ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علیؑ نے گھوڑے پر زکات مقرر فرمائی اور یہ ایک جدید قانون سازی تھی۔ روایت اس طرح ہے کہ امام محمد باقر -اور امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"وَضَعَ اَمیرُ الْمُؤمِنینَ عَلَی الْخَیْلِ الْعِتاقِ الرّاعِیَۃِ فی کُلِّ فَرَس فی کلِّ عامٍ دینارینِ وَ عَلَی البراذینِ دیناراً"۔

یعنی: "امیر المؤمنین -نے دشت میں چرنے والے اچھے گھوڑوں پر ہر سال فی کس دو دو دینار مقرر کئے اور وزن اٹھانے والے گھوڑے (ٹٹو) پر ایک دینار معین کیا۔"

اسی طرح علی بن مھزیار کی روایت میں ذکر ہوا ہے کہ امام محمد تقی الجواد - جب ۲۲۰ ؁ میں بغداد میں داخل ہوئے تو آپؑ نے عام طور پر لئے جانے والے واجب خمس کے علاوہ ایک اور خمس کو بہت بڑی مقدار کے مال میں یکبارگی مقرر فرمایا۔[1] دونوں حدیثیں سند کے لحاظ سے قابل اعتبار ہیں لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ائمہ معصومینؑ بھی قانون سازی کا حق رکھتے تھے۔

جواب

اس مقام پر حکومتی احکام اور عمومی احکام کے درمیان خلط ملط کر دیا گیا ہے، عمومی احکام وہ قوانین ہیں جو ہر دور اور ہر جگہ قیامت تک کے لئے ثابت اور برقرار ہوتے ہیں، لیکن حکومتی احکام وہ ہوتے ہیں جو ضرورت کے مطابق وقتی طور پر مقرر کئے جاتے ہیں (جیسے تمباکو کی حرمت کا حکم جو انگلستان کے اقتصادی سامراج کا مقابلہ کرنے کی خاطر ایک بزرگ فقیہ کی طرف سے صادر ہوا اور پھر جب اس کی ضرورت نہ رہی اور خطرہ ٹل گیا تو اس حکم کو ختم کر دیا گیا)۔

امام محمد تقی الجواد - کی روایت میں موجود قرائن سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ جب آپؑ بغداد میں داخل ہوئے اس وقت شیعہ سخت مالی بحران کا شکار تھے اور امامؑ نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے متعدد بار خمس لیا اور حقیقت میں آپؑ نے عنوان ثانی کی اس کے ایک مصداق پر تطبیق فرمائی نہ یہ کہ کوئی جدید قانون سازی کی۔ امیر المؤمنین علیؑ کی روایت میں مذکور حکم زکوٰۃ بھی ممکن ہے اسی طرح کا ہو، لہٰذا یہ حکم اسی زمانے تک محدود تھا اور فقہاء نے اسے ایک عام وضع شدہ قانون کی حیثیت نہیں دی اور نہ ہی اس کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ (غور فرمائیں)

6- نمبر ۵ کے تحت جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے، ائمہ معصومینؑ کے علاوہ کوئی بھی شخص بطریق اولیٰ قوانین عامہٴ الٰہی کی تشکیل کا حق نہیں رکھتا کیونکہ ختم نبوت، رسول اکرمؐ کی رحلت اور اکمال دین و اتمام نعمت کی وجہ سے کسی کے لئے قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور قیامت تک لوگوں کو پیش آنے والے مسائل سے متعلق احکام بکثرت روایات کے مطابق واضح طور پر بیان ہو چکے ہیں اور پھر غیر معصومین، روح القدس کی تائید سے بھی مستفید نہیں تا کہ اس قسم کا حق ان کے لئے ثابت ہو سکے، چونکہ گذشتہ روایات میں قانون سازی کی اہلیت کی ایک شرط اسی تائید کو قرار دیا گیا ہے۔

7۔ توجہ رہے کہ بعض روایات کی مراد وضع احکام نہیں، بلکہ ان کی نظر حکومت وولایت کی تفویض یا بیت المال کی تفویض (سپردگی) کی طرف ہے۔

8۔ بعض اہل سنت فقہا، فقہائے اسلام کو مالانص فیہ میں وضع احکام کی تفویض کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ علمائے اہل سنت مسائل کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں: ما فیہ نص (جس چیز کے بارے میں قرآن وسنت میں حکم موجود ہو) ما لا نص فیہٖ (جس چیز کے بارے میں کوئی حکم قرآن وسنت میں موجود نہ ہو)

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ٦، ابواب ما یجب فیہ الخمس، باب ۸ حدیث ۵۔

پہلی قسم یعنی نص کی موجودگی کی صورت میں سب کی رائے یہی ہے کہ نص کے مطابق عمل کیا جائے جبکہ دوسری قسم میں اکثر اہل سنت کی رائے یہ ہے کہ نص نہ ہونے کی صورت میں پہلے ''قیاس'' کی طرف رجوع کیا جائے گا، یعنی اس مسئلے کا موازنہ کسی اور مشابہ مسئلے کے ساتھ کیا جائے گا جس کا حکم موجود ہے اور پھر اس مسئلے کا بھی وہی حکم قرار دیا جائے گا جو اس کے مشابہ مسئلے کا ہے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو علمائے دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس عمل کی مصلحت اور مفسدہ کی تحقیق کریں اور پھر مصلحت یا مفسدے (نقصان) میں سے جو بھی قوی ہو اس کے مطابق حکم و قانون وضع کریں اور ان کی تقلید کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ اس حکم کو تسلیم کریں اور اسے حکم خدا سمجھ کر اس کے مطابق عمل کریں۔

یہ وہی چیز ہے جس کو بعض اوقات ''اجتہاد'' اور کبھی ''تصویب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے (البتہ اجتہاد ایک خاص معنی میں نہ اجتہاد یعنی دلائل شرعیہ سے احکام کو استنباط و اخذ کرنا) اور تصویب کے بارے میں وہ کہتے ہیں جس چیز کو فقیہ اس قسم کے حالات میں قانون کے طور پر وضع کرتا ہے خدا بھی اسے صائب اور درست قرار دیتا ہے! اور اگر کئی ایک فقہاء مختلف اور متعدد احکام وضع کریں تو وہ سب کے سب احکام الٰہی کے عنوان سے قابل قبول ہیں! اور اس طرح وہ فقہاء کو ان صورتوں میں قانون سازی کا حق دیتے ہیں جن میں کوئی حکم وارد نہ ہوا ہو۔

لیکن فقہائے شیعہ مکتب اہل بیتؑ کی پیروی میں اس بات کے بنیاد ہی سے مخالف ہیں اور یہ کہتے ہیں: قیامت تک کے لئے وہ قوانین جن کی انسانیت کو ضرورت پڑ سکتی ہے شریعت اسلامی میں انھیں پیش نظر رکھا گیا ہے اور کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جس کے بارے میں کوئی حکم نہ ہو تاکہ کسی کو حکم وضع کرنے کی ضرورت پڑے۔

البتہ ان احکام میں سے بعض واضح طور پر قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں اور بعض قواعد کلیہ اور اصول عامہ کی صورت میں یا دوسرے الفاظ میں ''عمومات'' اور ''اطلاقات'' میں دلائل اولیہ اور ثانویہ کی شکل میں نظر آتے ہیں اس طرح کہ موضوعات میں سے ہر موضوع کا حکم موجود ہے اگر چہ یہ حکم کبھی واقعی اور کبھی حکم ظاہری کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

اس بناء پر کوئی چیز اجتہاد (خاص معنی میں) یا قیاس اور مالانص فیہ کے عنوان سے موجود نہیں اور فقہاء کا کام صرف احکام کلی اور ان کے مصادیق کے درمیان مطابقت پیدا کرنا ہے۔ اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجلس قانون ساز، میں قانون سازی مذہب اہل بیت ÷ کی پیروی کرنے والوں کے نزدیک مبتلا بہ مسائل میں جدید احکام وضع کرنے کے معنیٰ میں نہیں بلکہ مراد اصول کی فروع پر تطبیق یا مختلف موضوعات کی تشخیص ہے جسے مہارت موضوعی بھی کہا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ مذہب شیعہ کے نزدیک قانون ساز مجالس (اسمبلیاں) احکام اسلام کے مقابلے میں یا ''مالانص فیہ'' میں جدید احکام وقانون کی تشکیل نہیں کرتیں بلکہ یہ سب احکام کی تطبیق ہوتی ہے یا کسی موضوع کی شناخت حاصل کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس قانون ساز کے ساتھ شوریٰ نگہبان بھی موجود ہے تاکہ فقہاء کی ایک جماعت اسمبلی (مجلس قانون ساز) کی نگرانی کرے کہ وضع شدہ قوانین، احکام اسلام کے خلاف تو نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ مجلس تشخیص مصلحت کہ جسے حال ہی میں آئین میں پیش نظر رکھا گیا ہے، بھی تشخیص موضوع کی

خاطر ہے نہ وضع قانون کے لئے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ عنوانات ثانویہ سے ایک عنوان ہے ''اہم'' اور ''کم اہم'' یعنی جب دو شرعی مسئلوں میں تضاد واقع ہو جائے مثلاً کبھی لوگوں کے مال کی حفاظت اور مالک کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف نہ کرنے اور شہر سے دور تک روڈ بنانے کے مسئلے کا آپس میں تضاد ہو جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف سے معاشرتی نظام کی حفاظت واجب ہے اور جو روڈ بنائے بغیر ناممکن ہے اور دوسری طرف سے لوگ کی زمین اور مال کی حفاظت بھی لازم ہے، اس قسم کی صورتحال میں اہم کو کم یا غیر اہم پر ترجیح دی جائے گی اور لوگوں کو اپنی زمینوں میں سے روڈ گذرنے کی اجازت دینی پڑے گی اور حکومت کی طرف سے ان کی جائیداد کے نقصان کی تلافی ہونی چاہیے۔

اسی طرح مختلف اجناس کے بھاؤ مقرر کرنے سے متعلق اسلام کا اولی اور پہلا حکم آزادئ نرخ ہے، لیکن اگر یہ آزادی منافع خوروں کے سوء استفادہ کا سبب بن جائے اور معاشرہ مشکلات کا شکار ہو جائے اور معاشرے کے اقتصادی نظام کی حفاظت حکومت کی طرف سے نرخ کی تعیین پر متوقف ہو تو اس صورت میں بلاشبہ نظام کی حفاظت مقدم اور قابل ترجیح ہوگی، یہاں اجناس کے نرخ کا تعیین کا قانون وضع کرنا اور اسے نافذ کرنا حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے۔

مجلس تشخیص مصلحت کو چاہیے کہ ایسے حالات میں جو چیز ''اہم'' ہے اس کا نہایت احتیاط کے ساتھ انتخاب کرے تاکہ اسلامی حکومت اسے نافذ کر سکے، یہ ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح جان کی حفاظت لازم ہے اور حرام گوشت کا کھانا ممنوع ہے لیکن بعض مخصوص حالات میں حرام گوشت سے استفادہ کرنا جائز ہو جاتا ہے کیونکہ نسل کی حفاظت کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔

اس بناء پر مجلس تشخیص مصلحت اور اجتہاد و استحسان اور مصالح مرسلہ جن کے اہل سنت قائل ہیں، کے درمیان بے پناہ فرق ہے، تشخیص مصلحت میں دو حکم کا تعارض مدنظر ہوتا ہے اور حکم اہم کی مصلحت کو ترجیح دی جاتی ہے اور اہل سنت کے ہاں وہ موضوع جس کے لئے کوئی حکم وضع نہیں ہوا ہوتا، حکم وضع کیا جاتا ہے۔ (غور فرمائیں)

مذکورہ بالا بیانات سے مجموعی طور پر نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قانون ساز اسمبلی، حکومت اسلامی کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ کیونکہ ہر زمانے، ماحول اور حالات میں ضرورتیں اور جدید مسائل جنم لیتے ہیں، جن کے متعلق پہلے سے قانون پیش نظر ہونا چاہیے، لیکن قانون سازی سے مراد ہے لائحہ عمل، اصول کی فروع پر تطبیق، قوانین کلی سے فروعی قوانین کا اخذ و استخراج اور محتاط انداز میں موضوعات کی تشخیص ہے۔

مجلس شوریٰ اور نمائندوں کا انتخاب

یہاں سب سے پہلے اسلام میں مشورے کی اہمیت اور کن صورتوں میں مشورہ ضروری ہے اور کن لوگوں سے مشورہ لیا جائے، کے بارے میں گفتگو ضروری ہے۔

ا۔ مشورے کی ضرورت اور اہمیت

مشورت کا موضوع خاص طور پر اجتماعی امور اور ان مسائل میں جو معاشرے کے لئے تقدیر ساز ہیں' ان اہم موضوعات میں سے ایک ہے جس کو اسلام نے بڑی اہمیت اور احتیاط کے ساتھ پیش کیا ہے اور یہ موضوع قرآنی آیات، احادیث اور اسلام کے عظیم پیشواؤں کی تاریخ وسیرت میں ایک مخصوص مقام رکھتا ہے۔ قرآن مجید کی کئی آیتوں میں مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں خدا تعالیٰ رسول اکرمؐ کو مسلمانوں کے ساتھ مختلف امور میں مشورہ کرنے کا حکم دیتا ہے: ''وَشَاوِرۡهُمۡ فِي الۡاَمۡرِ'' اور سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۸ میں سچے اہل ایمان کے واضح اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

الَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۖ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ۖ

یعنی: ''وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں، نماز کو قائم کرتے ہیں اور ان کے امور باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔''

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے کہ اس آیت میں مسئلہ شوریٰ کو خدا پر ایمان اور نماز کے مترادف قرار دیا گیا ہے جو اس کی غیر معمولی اہمیت کی علامت ہے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ لوگوں کے ساتھ مشورے پر اس وجہ سے مامور ہیں کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کی شخصیت کا احترام ملحوظ رہے اور انھیں معاشرتی مسائل میں شریک قرار دیا جائے۔ چونکہ کہ آخری فیصلہ کرنا خود رسول اکرمؐ کا کام ہے نہ کہ شوریٰ کا چنانچہ قرآن مجید مشورت سے متعلق اس آیت کے آخر میں فرماتا ہے:

''فَإِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ''

یعنی ''جب آپؐ فیصلہ کرلیں تو خدا پر توکل کریں۔''

لیکن تسلیم شدہ بات ہے کہ ذیل آیت سے یہ مراد نہیں کہ لوگوں سے مشورہ لو اور پھر ان کی آراء سے چشم پوشی کرتے ہوئے کوئی اور راہ اختیار کرو ایسا کام نہ آیت کے مقصد کے ساتھ کوئی مناسبت رکھتا ہے (اس لئے کہ ایسا کرنا لوگوں کے عمومی افکار کی بے احترامی ہے جو مسلمانوں کے رنج کا باعث بن کر الٹا نتیجہ دے سکتی ہے) اور نہ رسول اکرمؐ کی سیرت کے ساتھ سازگار ہے کیونکہ جب آپؐ لوگوں سے اہم واقعات میں مشورہ لیتے تو لوگوں کی رائے کا احترام بھی کرتے تھے اور کبھی اپنی ذاتی رائے سے صرف نظر کر لیتے تا کہ مشورے کی حیثیت اور حقیقت ان کے درمیان تقویت حاصل کرے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیت مشورت اپنے سے پہلی اور بعد والی آیات کے پیش نظر غزوہ احد کی طرف ناظر ہے اور معلوم ہے کہ جنگ احد کے واقعے میں رسول اکرمؐ لشکر کے شہر سے باہر جانے کے موافق نہیں تھے، لیکن جب اکثر لوگوں کی رائے اسی پر ٹھہری تو آپؐ بھی ان کے موافق ہو گئے۔[1]

بالفرض کہ یہ آیت رسول اکرمؐ کے لئے ایسی خصوصیت کو ثابت کرے کہ لوگوں سے آپؐ کا مشورہ محض ان کی حوصلہ افزائی اور احترام کی خاطر ہوتا تھا، لیکن سورۂ شوریٰ کی آیت جو عام مسلمانوں کا حکم بیان کر رہی ہے مکمل طور پر اس مطلب کی ترجمان ہے کہ اہم امور مسلمانوں کے درمیان باہمی مشورے اور شوریٰ کے ذریعے انجام پائیں اور شوریٰ ایک مقررہ کردار ادا کرتی ہے۔ واضح ہے کہ شوریٰ کا تعلق ایسے امور سے ہوتا ہے جن کے بارے میں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص حکم نازل نہ ہوا ہو، اور اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ شوریٰ رسول اکرمؐ کی جانشینی کے سلسلے میں بے اختیار ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بارے میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص فرمان صادر ہو چکا تھا اور وحی کے ذریعے رسولؐ کے خلیفہ اور وصی کی تعیین کے بعد شوریٰ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

دوسرے الفاظ میں مشورہ ہمیشہ موضوعات میں ہوتا ہے نہ احکام میں کہ ان کے بارے میں خدا کی طرف سے فرمان صادر ہو چکا ہوتا ہے۔ بہر حال شوریٰ ایک محدود دائرے میں اسلام کا ایک بنیادی قاعدہ ہے جس کی وضاحت کی جا چکی ہے اور یہ لفظ اپنے وسیع مفہوم کی بدولت تمام سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی امور پر حاوی ہے۔ قرآن مجید میں خاندانی نظام سے متعلق امور میں بھی مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے مثلاً پورے دو سال تک پہنچنے سے پہلے بچے کا دودھ چھڑا دینا قاعدۂ مشورت کی طرف اشارہ کرتا ہے، ارشاد قرآنی ہے:

"فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا"

یعنی: "اگر وہ دو (ماں باپ) ایک دوسرے کی رضا مندی سے اور مشورہ انجام دینے کے بعد چاہیں کہ دو سال پورے ہونے سے پہلے بچے کا دودھ چھڑا دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔"[2]

یہ اپنے امور میں مشورے کی غیر معمولی اہمیت پر ایک دلیل ہے۔

احادیث میں مشورے کی اہمیت

رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ سے مروی احادیث میں مشورے کی بہت زیادہ اہمیت ذکر کی گئی ہے یہاں تک کہ رسول اکرمؐ نے ایک حدیث میں مشورے کو معاشرے کی حیات کے اسباب میں سے ایک سبب قرار دیا ہے اور ترک مشورے کو معاشرے کی موت کے اسباب میں سے ایک سبب کے طور پر متعارف کرایا ہے، فرماتے ہیں:

اِذا كَانَ اُمَرَائُكُمْ خِيَارَكُمْ وَ اَغْنِيَائُكُمْ سُمَحَائِكُمْ وَ اَمْرُكُمْ شُورىٰ بَيْنَكُمْ فَظَهْرُ

---

[1] سید المرسلین، ج ۲، ص ۱۴۲

[2] سورہ بقرہ۔ ۲۳۳

الاَرْضِ خَیرلَکُمْ مِنْ بَطْنِها، وَاِذا کانَ اُمَرائِکُمْ شِرارَکُمْ وَ اَغْنیائُکُمْ بُخَلائَکُمْ وَلَمْ یَکُنْ اَمْرُکُمْ شُوری بِیْنَکُمْ فَبَطْنُ الاَرْضِ خَیْرلَکُمْ مِنْ ظَھْرِھا:

ترجمہ:''جب تمہارے حکمران نیک اور دولتمند لوگ سخی ہوں اور تمہارے کام مشورے سے انجام پائیں تو اس صورتحال میں زمین کی اوپر والی سطح اس کی نچلی سطح کی نسبت تمہارے لئے بہتر ہے (یعنی زندہ رہنے کے قابل ہو) لیکن اگر تمہارے حکمران بُرے لوگ اور اہل مال ودولت کنجوس ہوں اور تمہارے کام مشورے سے نہ ہوں تو اس صورت میں زمین کی نچلی سطح (قبر) اس کی اوپر والی سطح سے تمہارے لئے بہتر ہے!''[1]

مشورے کی اہمیت اس حد تک ہے کہ علیؑ نے فرمایا:

اَلاِسْتِشارَۃُ عَیْنُ الْھِدایَۃِ، وَقَدْ خاطَرَ مَنْ اِسْتَغنی بِرَایِہِ:

یعنی:''مشورہ لینا عین ہدایت ہے اور جو شخص فقط اپنی فکر پر قناعت کرے، اس نے اپنے آپ کو خطرے میں جھونک دیا ہے!''[2]

حضرت علیؑ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

لا یَسْتَغتنِی الْعاقِلُ عَنِ الْمُشاوَرَۃِ:

یعنی''عاقل شخص اپنے آپ کو مشورے سے بے نیاز نہیں سمجھتا۔''[3]

اس کی دلیل بھی واضح ہے اور وہ حضرت علیؑ کے بیان کے مطابق کچھ یوں ہے:

حَقّ الْعاقِلِ اَنْ یُضیفَ اِلی رَأیِہِ رَأیَ الْعُقَلاءِ وَیَضُمَّ اِلی عِلْمِہِ عُلُومَ الْحُکَماءِ:

''عاقل شخص یہ حق رکھتا ہے کہ وہ دوسرے عقلاء کی آراء کو اپنی رائے کے ساتھ ملائے اور اہل علم کے علوم کا اپنے علم میں اضافہ کرے (اور ان سب سے باتوں کے بعد اہم کاموں کا فیصلہ کرے)۔''[4]

آپؑ ہی ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

مَنْ شاوَرَ ذَوِی الْعُقُولِ اِسْتَضاءَ بِاَنْوارِ الْعُقُولِ:

---

[1] تحف العقول، مختصر اقوال رسول کا حصہ، حدیث ۱۳۔

[2] بحار، ج ۷۵، ص ۱۰۴۔

[3] غرر الحکم

[4] غرر الحکم

''ہر وہ شخص جو صاحبانِ عقل سے مشورہ لیتا ہے ان کی عقل کے نور سے نورانیت حاصل کرتا ہے۔''[۱]

اس بناء پر مشورہ اپنی عقل وعلم وتجربے کے ساتھ دوسروں کے علوم، عقول اور تجربات کا اضافہ کرنا ہے کہ اس صورت میں انسان سے خطا ولغزش کا احتمال بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں احادیث بکثرت موجود ہیں اور اس مختصر بحث کو رسول اکرمؐ اور حضرت علیؑ کی ایک ایک حدیث کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"لا مُظاهَرَةَ اَوْثَقُ مِنَ الْمُشاوَرَةِ"

یعنی ''مشورے سے زیادہ مضبوط کوئی پشت پناہ نہیں۔''[۲]

اور حضرت علیؑ نے فرمایا:

"شاوِرْ ذَوِی الْعُقُولِ تَأْمَنْ مِنَ الزَّلَلِ وَالنَّدَمِ"

یعنی ''عقلمندوں سے مشورہ لو تا کہ لغزش اور ندامت سے محفوظ رہو۔''[۳]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ضروری نہیں کہ مشورہ دینے والے انسان سے بالاتر ہوں بسا اوقات عام افراد جو خداداد عقل کے حامل ہوتے ہیں ان کے ساتھ مشورہ کرنے سے راہ حل نکل آتی ہے، چنانچہ امام رضا - سے مروی ایک روایت میں آیا ہے کہ آپؑ کی بارگاہ میں آپؑ کے والد گرامی کا ذکر چل پڑا۔ آپؑ نے فرمایا میرے والد گرامی کی عقل کا دوسروں کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے باوجود آپؑ سیاہ فام غلاموں سے مشورہ لیتے، آپؑ سے پوچھا گیا کہ کیا آپؑ ان جیسوں سے مشورہ لیتے تھے؟! تو آپؑ نے جواب دیا:

"اِنَّ اللہَ تَبارَكَ وَتَعالی رُبَّما فَتَحَ عَلی لِسانِهِ:"

ترجمہ: ''بسا اوقات خدا تعالیٰ حق کو اس (جیسوں) کی زبان پر جاری کر دیتا ہے۔''[۴]

اہمیت مشورہ کو عربی زبان کے ایک خوبصورت شعر کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

اَقْرِنْ بِرَأْيِكَ رَأْيَ غَيْرِكَ وَاسْتَشِرْ
فَالْحَقُّ لايَخْتفی عَلَی الاِثْنَيْنِ
لِلْمَرْءِ مِرآةٌ تُرِيهِ وَجْهَهُ
وَيَرى قَفاهُ بِجَمْعِ مِرآتَيْنِ:

---

[۱] غرر الحکم
[۲] بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۱۰۰
[۳] غرر الحکم
[۴] میزان الحکمۃ، ج ۵، ص ۲۱۱

''دوسروں کی فکر ونظر کو اپنی فکر ونظر کے قریب کرو اور مشورہ کرو، اس لئے کہ حق دو افراد پر مخفی نہیں رہتا۔''
کیونکہ ایک آئینہ صرف انسان کے چہرے کو ظاہر کرتا ہے لیکن اگر دو آئینے ایک دوسرے کے بالمقابل قرار دیئے جائیں تو پس پشت منظر بھی دکھائی دیتا ہے!

مشورہ دینے والوں کی شرائط

بلاشبہ اہم امور اور حساس معاشرتی مسائل میں ہر ایک سے مشورہ نہیں لیا جا سکتا، بلکہ مشورہ دینے والا خاص صفات کا حامل ہونا چاہیے جن کی بناء پر وہ اس کام (مشورہ دینے) کی صلاحیت رکھتا ہو یہی وجہ ہے کہ روایات میں بعض لوگوں کو مشورے کے لائق اور بعض کو اس کے لائق نہیں قرار دیا گیا۔ امام جعفر صادق -فرماتے ہیں:

اِنَّ الْمَشْوِرَةَ لاتَكُونُ اِلاّ بِحُدودِها الاَرْبَعَةِ... فَاَوَّلُها اَنْ يَكُونَ الَّذى تُشاوِرُهُ عاقِلاً، وَالثّانى اَنْ يَكُونَ حُرّاً مُتَدَيِّناً، وَالثّالِثُ اَنْ يَكُونَ صَديقاً مُؤاخِياً، وَالرّابِعُ اَنْ تُطْلِعَهُ عَلى سِرِّكَ فَيَكُونَ عِلْمُهُ بِهِ كَعِلْمِكَ...:

''مشورہ صرف چار شرائط کے ساتھ مفید ہے؛ پہلی یہ کہ مشورہ دینے والا عقلمند ہو دوسری یہ کہ آزاد اور مؤمن ہو، تیسری یہ کہ ہمدرد اور اچھا دوست ہو اور چوتھی یہ کہ اسے راز دار بناؤ تاکہ جس چیز کے بارے میں اس سے مشورہ لے رہے ہو اس سے وہ بھی اسی طرح آگاہ ہو جس طرح تم آگاہ ہو۔''[1]

حضرت علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

خَيْرُ ما شاوَرْتَ ذَوُوا النُّهى وَالْعِلمِ وَاُولُوا التَّجارِبِ وَالْحَزْمِ

''جن سے تم مشورہ طلب کرتے ہو انھیں صاحب علم و عقل اور دور اندیشی اور تجربات کا حامل ہونا چاہیے۔''[2]

اس کے برعکس کنجوس، ڈرپوک، لالچی اور احمق شخص سے مشورہ طلب کرنے سے روایات میں شدت کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔
رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

يا علي! لا تُشاوِرْ جَباناً فَاِنَّهُ يُضَيِّقُ عَلَيْكَ الْمَخْرَجَ وَلا تُشاوِرِ الْبَخيلَ فَاِنَّهُ يُقَصِّرُ بِكَ عَنْ غايَتِكَ، وَلا تُشاوِرْ حَريصاً فَاِنَّهُ يُزَيِّنُ لَكَ شَرَهاً

''اے علیؑ! بزدل شخص سے مشورہ نہ لو کہ وہ مشکلات سے نکلنے کی راہ تم پر تنگ کر دے گا اور کنجوس شخص سے

---

[1] میزان الحکمۃ ج۵، ص۳۱۸

[2] غرر الحکم

مشورہ نہ طلب کرو کیونکہ وہ تمہیں جائز اور بجا طور پر خرچ وعطا سے اور مقصد تک پہنچنے سے باز رکھے گا اور حریص اور لالچی شخص سے بھی مشورہ نہ کرو کیونکہ وہ حرص اور لالچ کو تمہاری نظروں میں پر کشش بنا کر پیش کرے گا (اور تمہیں خطا کی طرف کھینچ لے جائے گا)۔"[1] کچھ اور روایات میں احمق، نادان اور جھوٹے شخص سے مشورہ کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔"[2]

مذکورہ بالا بیان سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے مشیروں کو خاص طور پر اہم امور میں ذہین، عاقل، خیرخواہ، تجربہ کار، راستگو، امین، شجاع اور سخی ہونا چاہیے اور مذکورہ صفات میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کی وجہ سے مشورے کے ارکان متزلزل ہوجاتے ہیں۔ مثلاً اگر مشیر احمق اور جاہل شخص ہو تو وہ حقائق کو تبدیل کر دیتا ہے اور جیسا کہ احادیث میں بیان ہوا کہ وہ تمہیں نیکی پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس کی بجائے شر اور برائی کا سبب بن جاتا ہے! اور اگر وہ ڈرپوک ہو تو وہ اقدام کرنے اور مضبوط فیصلہ کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔

اور اگر مشیر جھوٹا شخص ہو تو روایات کے بیان کے مطابق دور کو تمہاری نظر میں نزدیک اور نزدیک کو دور کر دیتا ہے اور وہ اس سراب کی مانند ہوتا ہے جو صحرا میں پیاسوں کو فریب دیتا ہے اور اگر وہ بخیل اور کنجوس ہو تو ہر کار خیر کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے اور انسان کو ہمیشہ تنگدستی اور ناداری سے ڈراتا ہے اور اگر وہ بزدل ہو تو موقع کی مناسبت سے فیصلہ کرنے میں مانع بنتا ہے اور فرصت ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور اگر کم تجربہ یا بے تجربہ شخص ہو تو ہر چیز کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ جامع اور تقدیر ساز کاموں کو شکست سے دوچار کر دیتا ہے اور اگر وہ حریص شخص ہو تو تمہیں ظلم وستم کی دعوت دے گا یہاں تک کہ اس کی حرص کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے۔[3]

ان نتائج کے پیش نظر مشیروں کے انتخاب میں سخت گیر ہونا چاہیے خاص طور پر اہم معاشرتی مسائل میں جہاں دوسرے لوگوں کے حقوق بھی ہوں، پس مذکورہ بالا معیاروں کا پوری طرح خیال رکھنا چاہیے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مشورہ ایک قسم کے حق کو جنم دیتا ہے یعنی مشورہ دینے والا یا تو مشورہ دینے کو قبول نہ کرے اور اگر قبول کرے تو حق امانت کی رعایت کرے اور جو چیز باعث خیر وفلاح ہو مشورہ کرنے والے کے اختیار میں وہی قرار دے بصورت دیگر خائن (خیانت کار) شمار ہوگا اور مشورے میں خیانت ایک عظیم گناہ ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"مَنِ اسْتَشَارَهُ اَخُوهُ الْمُؤمِنُ فَلَمْ يُمَحِّضْهُ النّصِيْحَةَ سَلَبَ اللهُ لُبَّهُ"

"وہ شخص جس سے اس کا مومن بھائی مشورہ مانگے اور وہ مخلصانہ خیرخواہی کے ساتھ اس عمل کو انجام نہ دے تو

---

[1] بحار، ج ۷۰، ص ۳۴۔

[2] بحار الانوار ج ۷۵، ص ۲۳۰، حدیث ۱۳۔

[3] مذکورہ بالا مطالب مختلف روایات سے لئے گئے ہیں۔

خدا تعالیٰ اسے اس کی عقل وخرد سے محروم کردے گا۔''[1]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"خِيانَةُ الْمُسْتَسْلِمِ وَ الْمُسْتَشيرِ مِنْ اَفْظَعِ الاُمُورِ وَ اَعْظَمِ الشُّرُورِ وَ مُوجِبُ عَذابِ السَّعيرِ"

''اس شخص کے ساتھ خیانت کرنا جس نے تمہارے سامنے سر جھکا لیا اور تم سے مشورہ چاہا ہو، بدترین عمل اور نہایت عظیم برائی اور قیامت کے دن جلا دینے والے عذاب کا باعث ہے!''[2]

مشورے اور اس کی فروع کے بارے میں بحث بہت وسیع ہے، مذکورہ بالا بیان دراصل ان ابحاث کا نچوڑ ہے جو دیگر ابحاث کے لئے راستہ کھولتا ہے۔ اس بحث کو ایک اور دلکش شعر کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو مشیروں کی صفات کے بارے میں ہے:

لاتَسْتَشِرْ غَيرَ نَدْبٍ حازِمٍ فَطِنٍ
قَدْ اسْتَوى مِنْهُ اِسْرار وَاِعْلان
فَلِلتَّدابِيرِ فُرسان اِذا رَكَضُوا
فيها اَبَرُّوا كَما لِلْحَرْبِ فُرْسانُ

مشورہ صرف ان لوگوں سے لو جو ذہین، بافضیلت اور دور اندیش ہوں اور جن کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ کیونکہ امور کی تدبیر کے لئے کچھ بہادر لوگ ہوتے ہیں جو جب سواری پر سوار ہوتے ہیں اپنے کام کو بخوبی انجام دیتے ہیں، جیسا کہ جنگ کے لئے بھی سوار لازم ہوتے ہیں۔[3]

☆☆☆☆

---

[1] بحار، ج ۷۲، ص ۱۰۴

[2] غرر الحکم

[3] حیوۃ الحیوۃ، دمیری، ج ۱، ص ۱۷۳۔

مجلس شوریٰ کا اسلامی مشاورت کے معیار پر پورا اُترنا

یہاں ایک اہم سوال پیش آتا ہے اور وہ یہ کہ: مان لیا جائے کہ مشاورت کا موضوع اسلام کے بنیادی قوانین میں سے ایک ہے۔ لیکن اپنی موجودہ شکل میں جس کے مطابق لوگوں کی ایک جماعت منتخب ہو کر مجلس شوری اسلامی میں جمع ہوتی ہے اور خاص قواعد وضوابط کے مطابق اس کے جلسے (Meetings) منعقد ہوتی ہیں اور بحث وتحقیق کے بعد اظہار رائے کیا جاتا ہے اور ووٹ ڈالے جاتے ہیں اور اکثریت آراء سے کسی چیز (Bill) کو منظور کرکے اس کے نفاذ کو لازم قرار دیا جاتا ہے، اس کی کیا شرعی دلیل ہوسکتی ہے؟! دوسرے الفاظ میں موجودہ قانون ساز مجالس کے لئے ایسے تکلفات کسی آیت وروایت اور تاریخ میں بیان نہیں کئے گئے، پس ان کے لوازمات کی پابندی کا جواز کس طرح سے ثابت ہوا ہے جبکہ آج حکومت اسلامی کے تین بنیادی ارکان میں سے ایک کو اپنے آئین، قواعد وضوابط اور مخصوص قوانین کے ساتھ یہی مجلس شوریٰ (اسمبلی) تشکیل دیتی ہے۔ یہی مطلب نچلی سطح پر قواعد وضوابط کی منظوری کے سلسلے میں مجالس وزراء، اقتصادی، ثقافتی، سیاسی اور عسکری مسائل کے فیصلے کرنے والوں میں بھی نظر آتا ہے۔ اس اہم سوال کا جواب ایک مختصر جملے میں یہ ہے کہ موجودہ مجالس شوریٰ حقیقت میں ''مشورے کی ترقی یافتہ شکل'' ہے جس کا ذکر اسلام میں ہوا ہے۔

توضیح یہ کہ: اہم اجتماعی اور معاشرتی مسائل جو کسی ملک سے متعلق ہوں ان میں ضروری ہے کہ سارے ملک کے لوگوں سے مشورہ کیا جائے، لیکن چونکہ عملی طور پر ایسی وسیع شوریٰ (مشورہ) ممکن نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ تمام لوگ بھی تمام مسائل میں مکمل مہارت نہیں رکھتے، لہٰذا ان دو نکتوں کے پیش نظر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ لوگ کچھ نمائندوں کا انتخاب کریں تاکہ وہ باہم مل کر مشاورتی عمل کو انجام دیں، اور یہ نمائندے جن کی اسمبلی میں موجودگی گویا تمام لوگوں کی موجودگی ہوتی ہے جس چیز کو منتخب اور منظور کریں تو ان کا ایسا کرنا ایک مکمل طور پر اسلامی شوریٰ کا ترجمان ہوتا ہے۔

چونکہ غالب مسائل میں اتفاق آراء غیر ممکن ہوتا ہے لہٰذا اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا کہ اکثریت کی رائے ہی کو معیار قرار دیا جائے جو واقعیت سے زیادہ نزدیک ہوتی ہے۔ البتہ یہاں اکثریت ایک ایسی اکثریت ہے جسے آگاہ وباایمان افراد نے تشکیل دیا ہوتا ہے اس لئے کہ ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ لوگ اپنی شرعی ذمہ داری سمجھ کر ایسے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں جن میں نمائندگی کی تمام ضروری شرائط موجود ہوتی ہیں۔

اس بناء پر یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن نے بہت سے مقامات پر اکثریت کی مذمت کی ہے، مسلمہ طور پر ہمارے موضوع سے خارج ہے وہ اکثریت جو آیات ''أَكْثَرُهُمْ لَايَعْقِلُونَ'' (مائدہ/۱۰۳) ''أَكْثَرَهُمْ لَايَعْلَمُونَ'' (انعام/۳۷) ''أَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ'' (توبہ/۸) ''أَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ'' (مؤمنون/۷۰) اور دوسری آیت میں ذکر ہوئی ہے ایسی اکثریت ہے جس کا تعلق منحرف اور بے تربیت معاشروں سے ہے نہ اس اکثریت سے جسے آگاہ اور باوفا مؤمنین تشکیل دیتے ہیں۔ یہ ضمائر اپنے سے پہلے مذکورہ کلمات کے قرینے سے مشرک، گناہوں سے آلودہ، نادان، متعصب اور لاابالی افراد کی طرف لوٹتے ہیں، قرآن یہ ہرگز نہیں کہتا کہ

"اکثر مؤمنین یا اکثر المتقین لا یعلمون ولا یفقھون"

اسی دلیل کے پیش نظر علم اصول کے باب ''تعادل وتراجیح'' میں تعارض روایات کی بحث میں فقہاء کے درمیان شہرت، مرجحات میں سے ایک مرجح (ترجیح دینے والے چیز) ہے اور شہرت یعنی اکثر فقہاء کی رائے کے ساتھ تمسک؛ حدیث میں مذکور ہے کہ

"خُذْ بِمَا اشْتَهَرَ بَیْنَ اَصْحابِكَ وَ دَعِ الشّاذَّ النَّادِرَ فَاِنَّ الْمُجْمَعَ عَلَیْهِ لارَیْبَ فیه"

''وہ روایت جو تمہارے اصحاب (مومن وآگاہ افراد) کے درمیان مشہور ہے اسے لے لو، اور وہ روایت جس کے طرفدار کم ہوں اسے چھوڑ دو، اس لئے کہ مشہور روایت جس کے ساتھ اکثر فقہاء نے تمسک کیا ہو اطمینان بخش اور شک وشبہے سے پاک ہوتی ہے۔''[1]

یہاں تک کہ رسول اکرمؐ کی سیرت سے بھی یہ بات مکمل طور پر واضح ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ عقلِ کل ہونے کے باوجود مسلمانوں کی اکثریتی رائے کا احترام کرتے تھے۔ مثلاً جب آپؐ نے جنگ احد کے بارے میں مسلمانوں سے مشورہ لیا کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے یا شہر سے باہر نکلا جائے، چونکہ مسلمانوں کی اکثریت اس بات پر متفق تھی کہ مدینہ سے باہر نکلنا چاہیے۔ آپؐ نے ان کی تجویز مان لی اور اسے عملی جامہ پہنایا اور اقلیت پر مبنی اپنی رائے سے چشم پوشی کر لی اور اس طرح مشورے کی اہمیت کے بارے میں مسلمانوں کو ایک عظیم درس دیا۔[2]

اگرچہ یہ کام' جیسا کہ معلوم ہے اتنا اچھا نہیں ثابت ہوا، لیکن جنگ احد کے ان عظیم نقصانات کے مقابلے میں مشورے کے احترام کے فوائد زیادہ تھے! (غور فرمائیں)

جنگ خندق میں بھی ایسی ہی صورتحال پیش آئی؛ مغازی واقدی میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ جنگی مسائل کے بارے میں اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے، چنانچہ جنگ خندق سے پہلے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: کیا مدینہ سے نکل کر گروہوں پر مشتمل دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا مدینہ ہی میں رہیں اور شہر کے اطراف میں خندق کھودی جائے، یا مدینہ کے نزدیک رہ کر پشت پہاڑ کی طرف کر لیں؟ اس جگہ رسولؐ کے اصحاب میں اختلاف پڑ گیا، بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نکلنا بہتر ہے، لیکن جناب سلیمان نے رائے پیش کی کہ ہم لوگ جب دشمن سے خوفزدہ ہوتے تو شہر کے گرد خندق کھودتے تھے، اے رسول خداؐ! کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ مدینہ کے اطراف میں خندق کھودیں؟ سلیمان کی رائے سے اکثر لوگوں نے اتفاق کیا (اور خندق کھودنے کو ترجیح دی اور رسول اکرمؐ نے بھی اسے قبول کر لیا)۔[3]

ہم پھر کہتے ہیں کہ مشوروں کے سلسلے میں جب کچھ لوگ مشیر ہوں، خاص طور پر اہم اجتماعی مسائل میں، تو ایک رائے پر

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۸، ص۷۵، حدیث ا، باب ۹ازصفا القاضی

[2] سیرہ ابن ہشام، ج۳، ص۶۶

[3] مغازی واقدی، ج ا، ص ۴۴۴ (بالتلخیص)

اتفاق کم ہی ہوتا ہے اور اگر اکثریت پر توجہ نہ دی جائے تو یہ عمل کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس نکتے کا ذکر بھی لازم ہے کہ شوریٰ اور مشورے کا مسئلہ اسلام کے آنے سے پہلے بھی دنیا کے عقلاء کے درمیان رائج رہا ہے اور اسلام نے چند شرائط کے اضافے کے ساتھ اس کی تائید کی ہے، عقلاء عالم کے نزدیک بھی یہ مطلب اسی طرح سے ہے، یعنی اکثریت کی رائے معیار ہوتی ہے، اس بیان کا تعلق اکثریت کی رائے پر اعتماد سے تھا۔

لیکن وہ قواعد وضوابط جو قانون ساز اسمبلی میں اسمبلی چلانے کے طریقے اور رائے لینے کے لئے معیار قرار پاتے ہیں وہ بھی اسی مجلس (اسمبلی) کی طرف سے منظوری کی بنیاد پر شوریٰ کے طریقے سے تشکیل دیئے جاتے ہیں۔

اس بناء پر اسلامی قانون ساز اسمبلیاں جو انتخابات، منتخب افراد، جلسات کے انعقاد، مسائل کی تحقیق کی روش اور ان کی فوری اور غیر فوری میں تقسیم کی جو کاروائیاں کرتی ہیں سب اصل مشورہ کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں جس کو اسلام نے ایک بنیادی قانون وقاعدے کی حیثیت دی ہے اور ان سب کو اس اصل وقاعدے کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔

واضح ہے کہ اگر یہ مجالس (پارلیمنٹز) اسلامی شوریٰ کے سلسلے میں مشیروں یا دوسرے امور کے اعتبار سے انحراف کا شکار ہو جائے اور جاہل یا لاابالی قسم کے لوگ منتخب ہو جائیں یا رائے کا آزادانہ ماحول دباؤ اور گھٹن سے دوچار ہو جائے یا قوانین اسلام کے خلاف امور منظور کئے جانے لگیں تو یقینی طور پر ایسی مجلس، مجلس شوریٰ اسلامی نہ ہوگی اور ہم اس کا دفاع نہیں کرتے۔

اسلامی قانون ساز اسمبلی کی اصل ذمہ داری

مقننہ یا مجلس قانون ساز کہ یہ نام دوسروں سے لئے گئے، ان کے یہ نام سنتے ہی انسان کا ذہن اس مطلب کی طرف چلا جاتا ہے کہ اس مجلس میں موجود عوامی نمائندے وضع قانون یعنی حلال وحرام کا قانون بناتے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہوتا اور جس طرح سابقہ بحثوں میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایسی مجالس میں نمائندوں کا اصلی کام کلی احکام کو ان کے جزئی مصادیق پر منطبق کرنا ہوتا ہے۔ یعنی وہ مل بیٹھ کر مشورے کے انداز میں ضروری اور پیچیدہ موضوعات کو اسلامی احکام کی تطبیق کے لئے سامنے رکھیں۔

مثلاً اسلامی مملکت کا دفاع اور اغیار کے حملوں کا مقابلہ کرنا ایک ضروری امر ہے جیسا کہ خاص حالات میں ان کے ساتھ صلح کرنا اسلام کی تقویت اور ان کے شر کو دفع کرنے کا باعث بنتا ہے، لیکن اس مطلب کی تشخیص کہ کیا موجودہ حالات میں، جنگ ان کے شر کو دفع کرنے کا باعث ہے یا صلح؟ یہ عمل موضوعی مہارت اور تجربہ کار محتاج ہے، مجلس کی کاروائی ہوتی ہے اور وہ حالات کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر جس صورت کو مصلحت پر مبنی سمجھتی ہے اسے اختیار کر لیتی ہے۔ یا یہ کہ بیت المال کے مصرف کے مسئلے میں کس قدر بجٹ رکھا جائے تا کہ عادلانہ روش اختیار کی جا سکے اور وہ عدل وانصاف کا مصداق بن جائے اس ضمن میں مجلس (پارلیمنٹ) مشورہ کرتی ہے اور جسے زیادہ مصلحت کا باعث سمجھتی ہے اسے انتخاب کر لیتی ہے۔

البتہ ممکن ہے کہ کبھی احکام اسلامی کی مصادیق پر تطبیق میں مجلس کسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے، چونکہ اکثر نمائندگان، فقہاء اور مجتہدین نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے جمہوری اسلامی کے نظام میں اس قسم کی غلطی سے بچنے کی خاطر ایک ادارہ ''شوریٰ نگہبان'' کے نام سے بنایا گیا

ہے جو فقہاء اور قانون سے آگاہ افراد پر مشتمل ہے تاکہ قوانین کے اسلامی ہونے کے بارے میں مجلس کو اطمینان حاصل ہو۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اسلامی قانون ساز مجالس (اسمبلیوں) اور دیگر ممالک کی اسمبلیوں میں دو بنیادی فرق ہیں:

۱۔ غیر مذہبی اسمبلیوں میں حکم الٰہی کی پابندی کئے بغیر واقعاً حکم وضع ہوتا ہے اور حلال وحرام اور مجاز اور ممنوع کے احکام وضع کئے جاتے ہیں، لیکن اسلامی قانون ساز اسمبلی میں حقیقی کام وہی احکام کلی کی مصادیق پر تطبیق یا موضوع کا رشناسی ہے۔

۲۔ اسلامی قانون ساز اسمبلیوں میں مقصد مشکلات کے حل کے لئے ضرورتیں پوری کرنا اور اسلامی تعلیمات کے دائرے میں رہتے ہوئے تمام مثبت صورتوں میں اسلامی معاشرے کی پیش رفت ہوتا ہے جبکہ مغربی اور لا مذہب قانون ساز اسمبلیوں میں مقصد لوگوں کی خواہش کے پیچھے چلنا ہوتا ہے۔ چاہے ان کی یہ خواہشات منفی وانحرافی اور معاشرے کے زوال کا باعث ہوں یا مثبت اور تعمیری، یہی وجہ ہے کہ ان اسمبلیوں میں بعض گھناؤنے اور احمقانہ مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں اور نہایت ہی غیر اخلاقی قانون تصویب اور منظور ہوتے نظر آتے ہیں مثلاً ہم جنس پرستی کا جائز ہونا، دو مذکر افراد کے درمیان شادی وغیرہ کا سرکاری اور قانونی طور پر صحیح ہونا! جبکہ اسلامی قانون سازی میں بنیادی محور خدا تعالیٰ کی پسند اور اسلام کے طے شدہ اصول ہوتے ہیں اور لوگوں کی خواہشات کی طرف توجہ بھی اسی دائرے میں محدود ہوتی ہے نہ کہ ان کی ہر خواہش کی پیروی کرنے میں۔

دوسرا رکن: انتظامیہ

عملاً نفاذ کے بغیر قوانین صفحۂ کاغذ پر بکھرے محض الفاظ ہوتے ہیں، ان کی حقیقی قدرو قیمت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ عملی جامہ پہنیں، بالکل ایک ڈاکٹر کے نسخے کی طرح کہ جو خواہ کتنا ہی ماہرانہ کیوں نہ ہو جب تک اس پر عمل نہ ہو بیمار کے حال پر کسی طرح بھی کوئی اثر قائم نہیں کرتا، بیماری کی پہچان، تمام ٹیسٹوں کی درست اور محتاط انجام دہی ادویات کی مقدار اور کیفیت سے آگاہی وغیرہ دواؤں کے استعمال کے بغیر بالکل بیکار ہوتے ہیں، پس رکن اصلی عمل ہے۔ ایک قانون کتنا ہی اچھا اور قیمتی کیوں نہ ہو جب تک اسے عملی طور پر نافذ نہیں کیا جاتا وہ بالکل بے اثر ہوتا ہے، کسی قانون ساز نظام کی آبرو کی حفاظت انتظامیہ کے ذمے ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ مسئلہ نہایت واضح ہے پھر بھی اس کے بارے میں کچھ قرآنی اشارات پیش کئے جاتے ہیں:

۱۔ جب حضرت موسیٰ -نے کوہ طور کے کنارے وادی ایمن میں پیام رسالت دریافت کیا اور انھیں بنی اسرائیل کی نجات کے لئے فرعون سے مقابلہ کرنے اور توحید وحق اور عدالت کی دعوت کا حکم ملا تو انھوں نے اسے عملی جامہ پہنانے کی غرض سے خدا تعالیٰ سے مدد چاہی اور عرض کیا:

"وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا [1] مِنْ أَهْلِي هَارُونَ أَخِي اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي"

حضرت موسیٰ -سے شرح صدر، گرۂ زبان کے کھلنے اور کاموں کے آسان ہونے کی درخواست کے ساتھ عرض کیا:

''اے خدا! میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر مقرر فرما اس کے ذریعے میری پشت کو مضبوط کر اور اسے میرے کام میں میرا شریک بنا دے۔''

۲۔ بنی اسرائیل اور طالوت کی داستان میں ہے کہ جب بنی اسرائیل جالوت کے مظالم سے تنگ آ گئے جس نے انھیں دربدر کر دیا اور ان کی اولاد کو اسیر کر لیا تھا، تو انھوں نے اس کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنایا لیکن اس منصوبے کو عملی شکل دینے کے لئے کسی طاقتور، آگاہ، مدبر و مدیر کی ضرورت تھی لہٰذا ایسے فرد کے انتخاب کے لئے وہ اپنے زمانے کے نبی حضرت اشموئیل -کے پاس آئے اور عرض کیا:

ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللهِ ط (بقرہ/۲۴۶)

یعنی ''ہمارے لئے ایک بادشاہ کا انتخاب کریں جس کی زیر قیادت راہ خدا میں ہم دشمن کے ساتھ جنگ کریں۔''

انھوں نے بھی خدا کی بارگاہ سے یہ فرمان حاصل کیا کہ ایک باایمان، جوان اور شجاع شخص طالوت کو اس مقصد کے لئے انتخاب کریں، آپؑ

---

[1] (طہ۔۹۲ تا۲۳) ماوردی نے احکام السطانیہ میں لکھا ہے ''وزیر'' ممکن ہے وزر (بھاری پن) سے مشتق ہو کیونکہ وہ ذمہ داری کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر ڈالتا ہے یا ''وَزر'' (پناہ گاہ) سے مشتق ہوّ کیونکہ وزیر لوگوں کو پناہ گاہ ہوتا ہے) یا ''اَزر'' (پشت) سے مشتق ہو کیونکہ وہ اپنے سربراہ کا پشت پناہ ہوتا ہے (الاحکام السطانیہ، ص ۲۴)

نے ان سے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ

یعنی "خدا تعالیٰ نے تم پر طالوت کو سربراہ مقرر کیا ہے۔" [1]

۳۔حضرت یوسف -کی داستان میں بھی ہے کہ جب انھوں نے اقتصادی نقطۂ نظر سے اہل مصر کے لئے چند سخت اور خطرناک سالوں کی پیش گوئی کی اور ان سالوں کا ایک عاقلانہ منصوبہ ترتیب دیا تو حضرت یوسف -کی خود اپنی تجویز کے مطابق سلطان مصر نے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ منصوبہ ان کے حوالے کر دیا۔قرآن فرماتا ہے:

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

یعنی "یوسفؑ نے کہا: مجھے اس سرزمین کے خزانوں کا سرپرست بنا دو کہ میں جاننے والا اور حفاظت کرنے والا ہوں۔" [2]

یوسف -مدبرانہ اور مضبوط انتظام کے ساتھ ملک مصر کو بخوبی قحط کے سالوں سے نکال لے گئے۔

۴۔سلیمانؑ کی حکومت بلاشبہ زمین پر قائم ہونے والی وسیع ترین اور بینظیر حکومت تھی، انھوں نے معاشرۂ انسانی کی پیشرفت اور عدالت کی نشر واشاعت کی خاطر تمام ممکنہ طاقتوں اور قوتوں سے ایک منظم ومضبوط انداز میں استفادہ کیا بالفاظ دیگر خدا تعالیٰ نے ان امور کو عملی شکل دینے کے لئے ہر قسم کے ضروری وسائل کو ان کے اختیار میں دے دیا اور انھوں نے بھی ان وسائل سے استفادہ کیا اور اہم مقاصد حاصل کئے۔قرآن مجید سورۂ نمل میں حضرت داؤدؑ اور ان کے فرزند حضرت سلیمانؑ کی داستان میں ان دونوں کے وسیع علم کی طرف اشارہ کرکے فرماتا ہے:

"وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا"

"یعنی ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم کثیر عنایت فرمایا۔"

پھر مزید فرمایا:

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ

"سلیمانؑ، داؤدؑ کے وارث ہوئے اور انھوں نے کہا: اے لوگو! پرندوں کی زبان جاننے تک کا علم ہمیں عطا کیا گیا ہے اور ہر چیز سے ہمیں نوازا گیا ہے۔" [3]

---

[1] بقرہ۔۲۴۷

[2] یوسف۔۵۵۔

[3] نمل۔۱۵۔۱۶۔

قرآن مجید سورۂ سبا میں اس باپ بیٹے کے بارے میں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ ﴿۱۰﴾ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۖ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱﴾ وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ ۖ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۖ وَمَنْ یَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِیْرِ ﴿۱۲﴾ یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ۖ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۖ وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾

''اور ہم نے داؤدؑ کو اپنی طرف سے ایک عظیم فضیلت عطا کی (ہم نے پہاڑوں اور پرندوں سے کہا) اے پہاڑ اور اے پرندوں داؤدؑ کے ساتھ ہم آواز بن جاؤ اور اس کے ہمراہ خدا کی تسبیح کرو اور لوہے کو ہم نے اس کے لئے نرم کیا (اور ہم نے اس سے کہا) کامل اور فراخ زرہیں بناؤ اور اس کی کڑیوں کو ایک خاص اندازے سے متناسب بناؤ اور عمل صالح بجالاؤ کہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو میں اس سے آگاہ ہوں اور ہوا کو ہم نے سلیمانؑ کے تابع کر دیا کہ جو صبح شام ایک ایک ماہ کی مسافت طے کرتی تھی اور اس کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا ہم نے چشمہ جاری کیا اور جنوں کا ایک گروہ خدا کے اذن کے ساتھ اس کے سامنے کام کرتا تھا اور ان میں جو کوئی ہماری حکم عدولی کرے اسے ہم جلانے والا عذاب چکھائیں گے وہ جو کچھ سلیمانؑ کا تقاضا ہوتا، بنا ڈالتے، معابد، تصویریں، مجسمے، کھانے کے بڑے بڑے برتن، حوض اور ثابت اور اپنی جگہ پر جمی ہوئی دیگیں جو بڑی ہونے کے باعث ادھر ادھر منتقل نہیں کی جاسکتی تھیں! (اور ہم نے ان سے کہا) اے آل داؤدؑ! ان نعمتوں کا شکر بجالاؤ لیکن میرے بندوں میں سے کم ہی شکر گذار ہیں۔'' (سبا/ ۱۰ تا ۱۳)

نظام کو نافذ العمل قرار دینے میں حضرت سلیمانؑ کی انتظامی سرگرمیاں اس قدر نظم و ضبط کی حامل تھیں کہ جب انھوں نے جان خدا کے سپرد کی تو اس وقت وہ عصا کا سہارا لئے کھڑے تھے (اسی وجہ سے آپؑ کا جسد مبارک سیدھے کھڑے ہونے کی حالت میں تھا) اور ان کے کارندے محتاط انداز میں اپنے امور انجام دے رہے تھے یہاں تک کہ عصا دیمک خوردہ ہو کر ٹوٹ گیا اور آپؑ زمین پر گر پڑے۔ چنانچہ قرآن مذکورہ بالا آیات کے بعد فرماتا ہے:

فَلَمَّا قَضَیْنَا عَلَیْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰی مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ الْغَیْبَ مَا لَبِثُوْا فِی الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ ﴿۱۴﴾

ترجمہ:"(سلیمانؑ اس شان وشوکت کے باوجود) جب موت سے ہمکنار ہوئے تو کسی نے ان (کارندوں) کوان کی موت سے آگاہ نہیں کیا مگر ایک زمینی کیڑے یعنی دیمک نے ان کے عصا کو چاٹ لیا یہاں تک کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اوران کا جسم زمین بوس ہوگیا، جب وہ گرے تو اس وقت جنوں کو معلوم ہوا کہ اگر وہ غیب سے آگاہ ہوتے تو اس باعث ذلت عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔" (سبا/۱۴)

یہ ساری باتیں حضرت سلیمانؑ کی مضبوط انتظامی صلاحیتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ اصولی طور پر جس طرح نظام تخلیق میں خدا کے انتظامی امور چلانے والے (کارندے) ہیں جنھیں قرآن میں "فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا" (نازعات/۵) سے تعبیر کیا گیا ہے اور عالم کا نظام چلانے والے فرشتوں کے اعمال کے بارے میں کافی تعداد میں قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں اسی طرح دنیائے انسانیت میں بھی نفاذ قانون کے ایک قوی نظام، تقسیم کار اور ذمہ داریوں کی تقسیم، نظم ونسق کی برقراری اور نفاذ قانون بے حد ضروری ہے۔

حضرت علیؑ کے مالک اشتر کے نام فرمان میں یہ مطلب اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ جو امور مملکت کا انتظام چلانے کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ اس فرمان میں مالک اشتر کے انتظامی امور میں ان کے مشیروں کا تذکرہ کرنے کے بعد ملک مصر کے حاکم کے عنوان سے حضرت علیؑ انھیں حکم دیتے ہیں کہ: اپنے افراد میں سے ایسے افراد کا بطور وزراء انتخاب کرو جو اچھا ماضی رکھتے ہوں جن کا لہجہ واضح ہو، جو اہل صدق، باتقویٰ اور ہر قسم کی چاپلوسی سے دور ہوں اور ہر کام اور ہر حال میں ملک کی مصلحتوں کی خاطر علماء اور اہل عقل سے مشورے لو۔

اس کے بعد حکومت کا نفاذ کے مختلف شعبوں کا ذکر کرتے ہیں، سب سے پہلے دفاعی طاقت یعنی ایک قوی اسلامی فوج کا تذکرہ کرتے ہیں اس کے بعد اہل تجارت اور صنعتی وتجارتی اور اقتصادی امور کی بات کرتے ہیں اور آخر میں معاشرے کے محروم اور محتاج افراد سے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی ذمہ داریوں کو ان امور سے متعلق تفصیلی طور پر بیان کرتے ہیں۔

یہ عہد نامہ جو حقیقت میں قرآنی آیات اور احادیث نبوی کا نچوڑ ہے، اس قدر منظم ہے کہ چودہ سوسالوں نے نہ صرف اس کو بوسیدہ نہیں کیا بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت کو چار چاند لگ گئے ہیں اور یہ حکومت اسلامی میں انتظامی امور پر حاکم اصولوں کے سلسلے میں ایک درست لائحہ عمل کا واضح نمونہ ہے۔

رسول اکرمؐ کی حکومتی انتظامیہ

اگر چہ رسول اکرمؐ کے مبارک دور میں حکومت اسلامی ایک نہایت سادہ شکل میں تھی لیکن جو کچھ ایک طاقتور حکومت کے لئے ضروری تھا وہ سب اس دور کی حکومت میں موجود تھا، مسجد نبویؐ اپنی سادگی کے باوجود حکومت اور قوانین کے نفاذ کا اصلی مرکز تھی۔ ایک طرف سے تو یہ علم ودانش کا مرکز تھی، چونکہ رات دن اس سے تعلیم وتربیت کی نشر واشاعت ہوتی تھی۔ دوسری طرف سے یہ فوجی عملے کا اور فوج کی اعلیٰ قیادت کا مرکز تھی اور پھر عدالت گاہ کا کردار بھی ادا کرتی تھی۔ اور چوتھی جانب سے بیت المال اور صدقات وخیرات اور جنگی غنائم کا مرکز شمار ہوتی تھی اور اپنی تمام تر سادگی کے ساتھ اس میں یہ تمام امور انجام پاتے تھے۔

رسول اکرمؐ نے ان امور میں سے ہرایک امر کے لئے ایک یا کئی ذمہ دار افراد مقرر کر رکھے تھے اور یہ صورتحال آنحضرتؐ کے بعد بھی جاری رہی خاص طور پر حضرت علیؑ کے دور میں اس نظام نے اسلام کی پیشرفت کے ساتھ ساتھ جدید اور وسیع و منظم شکل وصورت اختیار کر لی تھی جس کے اصول وقواعد کی توضیح عہدنامہ مالک اشتر میں بیان کی گئی ہے۔

یہ ساری چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ مسئلہ شوریٰ کے بعد اہم مسئلہ قانون کے نفاذ اور اجرا کا مسئلہ ہے کیونکہ اس کے بغیر ہر قانون اپنی قیمت ووقعت کھودیتا ہے۔

قانون نافذ کرنے والے عہداروں کی شرائط وصفات

قرآن مجید کی تین آیتوں میں بطور صریح اور چند آیتوں میں اشارتاً حکومت کے لائق منتظمین کی صفات اور خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل اور طالوت کی داستان میں ہے کہ

''جب بنی اسرائیل نے طالوت کو اپنا حکمران بنانے کی وجہ سے اپنے نبیؑ پر اعتراض کیا اور اسے مال ودولت نہ رکھنے اور بنی اسرائیل کے کسی معروف خاندان سے منسوب نہ ہونے کی وجہ سے اس منصب کا اہل نہ جانا تو ان کے نبیؑ نے ان سے کہا: وہ دو خصوصیات کا مالک ہے؛ کثرت علم اور جسمانی قوت وتوانائی، اور انھیں دو خصوصیات کی وجہ سے خدا نے طالوت کو اس منصب کے لئے منتخب کیا ہے۔''[1]

نتیجے کے طور پر حکومت اسلامی کے سربراہ اور دوسرے مرحلے میں تمام منتظمین کے لئے علم وتوانائی کی دو شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت یوسف -کی داستان میں حکومت کے اعلیٰ پائے کے منتظمین اور کارندوں مثلاً بیت المال کے محافظوں کے لئے بھی ان دو شرائط کا موجود ہونا اشارتاً ذکر کیا گیا ہے:

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَاۗىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝

یعنی ''یوسفؑ نے کہا: مجھے اس سرزمین کے خزانوں کا سرپرست مقرر کرو کیونکہ میں حفاظت کرنے والا اور آگاہ ہوں (میں ان کی حفاظت کے لئے بھی کوشاں رہوں گا اور اس کے مصرف پر بھی نظر رکھوں گا)''۔[2]

لائق کارکنوں کے مسئلے میں داستان شعیب-وموسیٰؑ میں بھی حضرت شعیب -کی بیٹیوں کی زبانی ان دو شرائط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝

''ان دو میں سے ایک نے کہا: اے والد بزرگوار! (خطاب شعیبؑ سے ہے) اس شخص کو ملازم رکھ

---

[1] سورہ بقرہ۔ ۲۴۔

[2] سورہ یوسف۔ ۵۵

لو(حضرت موسیؑ کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت ایک طاقتور جوان تھے) چونکہ بہترین ملازم جو آپ رکھ سکیں اُسے توانا اور امین ہونا چاہیے۔"[1]

نتیجہ یہ نکلا کہ علم وعقل، طاقت وقدرت، امانت اور خوش اخلاقی ایک منتظم کی شرائط ہیں، چاہے وہ منتظم سربراہ حکومت ہو یا وزراء اور دیگر ملازمین، البتہ مراتب کے فرق کے ساتھ۔قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی یہی مطلب دکھائی دیتا ہے یعنی منتظمین کی شرائط بیان کی گئی ہیں جن میں کچھ کا بیان درج ذیل ہے:

۱۔اسراف کرنے والوں کے ساتھ تعاون سے پرہیز:

وَلَا تُطِيعُوٓا۟ أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ﴿١٥١﴾

یعنی اسراف کرنے والے لوگوں کی اطاعت نہ کرو۔"[2]

۲۔سفیہ (احمق) اور کم عقل لوگوں کے ساتھ تعاون سے پرہیز:

وَلَا تُؤْتُوا۟ ٱلسُّفَهَآءَ أَمْوَٰلَكُمُ ٱلَّتِى جَعَلَ ٱللَّهُ لَكُمْ قِيَٰمًا

"اپنے اموال کو جنھیں خدا نے تمہاری معاش کا ذریعہ بنایا ہے انھیں سفیہ اور احمق لوگوں کے حوالے نہ کرو۔"

[3]

۳۔گمراہوں سے تعاون طلب کرنے سے پرہیز:

وَمَا كُنتُ مُتَّخِذَ ٱلْمُضِلِّينَ عَضُدًا ﴿٥١﴾

یعنی "میں گمراہوں کو اپنا مددگار بنانے والا نہیں ہوں۔"[4]

۴۔جھوٹ بولنے والوں سے اجتناب:

فَلَا تُطِعِ ٱلْمُكَذِّبِينَ ﴿٨﴾ [5]

۵۔عیب جو، چغلی خور، خیر سے منع کرنے والا، تجاوز کرنے والے، گناہگار، کینہ توز اور بداخلاق لوگوں سے پرہیز:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ﴿١٠﴾ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ﴿١١﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴿١٢﴾

---

[1] قصص۔۲۶

[2] شعراء۔۱۵۱

[3] نساء۔۵

[4] کہف۔۵۱

[5] قلم۔۸

عُتُلٍّ بَعۡدَ ذٰلِكَ زَنِيۡمٍ ﴿۱۳﴾ [۱]

۶۔خواہش نفس کی پیروی سے پرہیز:

فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰۤى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۚ

''خواہش نفس وہوس کی پیروی نہ کروکہیں ایسانہ ہوکہ حق سے منحرف ہوجاؤ۔'' [۲]

۷۔مومنین کے ساتھ تعاون اور غیر مسلموں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرنا، کیونکہ اس وجہ سے وہ مسلمانوں پر مسلط ہوسکتے ہیں:

وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۱﴾

ترجمہ:''خداوندتعالیٰ ہرگز کافروں کو اہل ایمان پر غلبہ اور تسلط عطانہیں کرتا۔'' [۳]

یہ وہ شرائط ہیں جن کا اسلامی حکومت کے منتظمین میں خیال رکھنا ضروری ہے۔

احادیث میں اسلامی حکومت کے منتظمین کی شرائط

احادیث میں بھی حکومتی عہدیداروں اور منتظمین کی نہایت کڑی اور قابل توجہ شرائط قرار دی گئی ہیں کہ جن کے بغیر کامل طور پر حکومت اسلامی وقوع پذیر نہیں ہوسکتی۔

۱۔علم وآگاہی کی بلندترین سطح پر ہونا

رسول اکرمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"مَنۡ اَمَّ قَوۡماً وَ فيهِمۡ مَنۡ هُوَ اَعۡلَمُ مِنۡهُ لَمۡ يَزَلۡ اَمۡرُهُمۡ اِلَى السِّفالِ اِلى يَوۡم الۡقيامَةِ"

''وہ شخص جو کسی قوم کی قیادت اور پیشوائی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے حالانکہ لوگوں میں اس سے زیادہ علم والا موجود ہے، وہ لوگ مسلسل قیامت تک زوال اور انحطاط کی کیفیت میں مبتلا رہیں گے۔'' [۴]

---

[۱] قلم۔۱۰تا۱۳

[۲] نساء۱۳۵

[۳] نساء۔۱۴۱

[۴] وسائل، ج۵،ص۴۱۵،(باب۲۶ازابواب صلوٰۃ الجماعۃ)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق -نے فرمایا:

"مَنْ دَعَی النّاسَ اِلی نَفْسِهِ وَ فِیهِمْ مَنْ هُوَ اَعْلَمُ مِنْهُ فَهُوَ مُبْدِعٍ ضَآلٌ"

ترجمہ: "جو شخص لوگوں کو اپنی طرف بلائے حالانکہ لوگوں میں اس سے زیادہ آگاہ افراد موجود ہوں تو ایسا شخص بدعت گذار اور گمراہ ہے۔"[1]

۲۔ وسعت قلبی اور مختلف حوادث کے لئے آمادگی

امیر المؤمنین -اپنے ایک مختصر جملے میں فرماتے ہیں:

"آلَةُ الرِّیاسَةِ سِعَةُ الصَّدْرِ"

یعنی "ریاست اور سربراہی کا آلہ وسعت قلبی وفکری اور کشادگی روح اور بہت زیادہ قوت برداشت ہے۔"[2]

۳۔ اپنے زمانے کے مسائل سے آگاہی

امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"اَلْعالِمُ بِزَمانِهِ لا تَهْجُمُ عَلَیْهِ اللَّوابِسُ"

"جو شخص اپنے زمانے کے حالات سے آگاہ ہو وہ پیچیدہ اور گمراہ کن مسائل کے حملے کا نشانہ نہیں بنتا۔"[3]

۴۔ عدالت کی رعایت اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دینا

ایک حدیث میں ہے کہ امام علیؑ نے عمر بن خطاب سے فرمایا:

"ثَلاثٌ اِنْ حَفِظْتَهُنَّ وَ عَلِمْتَ بِهِنَّ كَفَتْكَ ما سِواهُنَّ، وَ اِنْ تَرَكْتَهُنَّ لَمْ یَنْفَعْكَ شَیْئٌ سِواهُنَّ: قالَ: وَما هُنَّ یا اَبَاالْحَسَنْ؟ قالَ: اِقامَةُ الْحُدودِ عَلَی القَریبِ وَالْبَعیدِ، وَالْحُكْمُ بِكِتابِ اللهِ فِی الرِّضا وَالسَّخَطِ، وَالْقِسْمُ بِالْعَدْلِ بَیْنَ الاَحْمَرِ وَالاَسْوَدِ: فقالَ عُمَرُ: لَقَدْ اَوْجَزْتَ وَاَبْلَغْتَ!"

"تین چیزیں ایسی ہیں جنھیں اگر بخوبی حفظ کرو اور ان پر عمل کرو تو وہ تمہیں دوسرے امور سے بے نیاز کر

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲، (مادہ علم)

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار۔ ۱۷۶

[3] اصول کافی، ج ۱، ص ۲۷

دیں گی اور اگر انھیں ترک کرو تو ان کے علاوہ کوئی چیز تمھیں فائدہ نہیں پہنچا سکتی ۔عمر نے عرض کیا: اے ابوالحسن! وہ کیا چیزیں ہیں؟! آپؑ نے فرمایا: دور ونزدیک کے افراد پر خدا کی حدود جاری کرنا اور خوشی اور غضب کی دونوں حالتوں میں خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنا اور سیاہ وسفید کے درمیان عادلانہ اور منصفانہ انداز میں تقسیم کرنا۔عمر نے عرض کیا: سچی بات تو یہ ہے کہ آپؑ نے مختصر کہا ہے لیکن مطلب کا حق ادا کردیا ہے!''[1]

۵۔نیک لوگوں کو اجر دینا اور جن گناہگاروں سے توبہ کی اُمید ہو اُن سے چشم پوشی کرنا

امام جعفر صادقؑ نے ایک حدیث میں فرمایا:

" ثَلاثَة تَجِبُ عَلَى السُّلطانِ لِلْخاصَّةِ وَالعامَّةِ: مُكافَآةُ الْمُحسِنَ بِالإحسانِ لِيَزْدادُوا رَغْبَةً فيهِ، وَ تَغَمُّدُ ذُنُوبِ الْمُسيئِ لِيَتُوبَ وَيَرْجِعَ عَنْ غيِّهِ، وَتَألُّفُهُمْ جَميعاً بِالإحسانِ وَالإنْصافِ"

''تین کام ایسے ہیں جن کے بارے میں اسلامی حاکم پر لازم ہے کہ وہ انہیں عام وخاص کے متعلق انجام دے، نیکوکار لوگوں کو اچھا بدلہ دے تاکہ مزید نیکی کا ان کے اندر شوق پیدا ہو اور گناہگاروں کی پردہ پوشی کرے یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلیں اور گمراہی سے باز آجائیں اور سب کو اپنے احسان اور انصاف کے سائے میں جمع کرلے۔''[2]

٦۔لوگوں کے اور اپنے منافع کو یکساں سمجھنا

جب حضرت علیؑ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا والی مقرر کیا تو انھیں کچھ احکامات بھی دیئے ان میں سے ایک حکم یہ تھا:

" اَحِبَّ لِعامَّةِ رَعِيَّتِكَ ما تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَ اَهْلِبَيْتِكَ، وَاَكْرِهْ لَهُمْ ماتَكْرَهُ لِنَفْسِكَ وَاَهْلِبَيْتِكَ فَإنَّ ذلكَ اَوْجَبُ وَاَصْلَحُ لِلرَّعِيَّةِ"

''عوام الناس کے لئے بھی وہی چیز پسند کرو جسے تم اپنے لئے اور اپنے اہل خانہ کے لئے پسند کرتے ہو اور جس چیز کو اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ناپسند سمجھتے ہو اسے عام لوگوں کے لئے بھی ناپسند شمار کرو کیونکہ یہ

[1] بحارالانوار، ج۷۲، ص۳۴۹، حدیث ۵۳

[2] بحارالانوار جلد ۷۵، ص ۲۳۳۔

کام تمہاری عقل و منطق کو اور پختہ کرے گا اور لوگوں کو صلاح اور اصلاح کے نزدیک کردے گا۔“[1]

۷۔ لوگوں کے ساتھ جذباتی لگاؤ

بعض احادیث میں سلطان عادل کو باپ کی جگہ قرار دیا گیا ہے اور لوگوں کو تاکید کی گئی ہے وہ اپنے باپ کی طرح اس کا احترام کریں، اسے بھی چاہیے کہ وہ انہیں اپنی اولاد کی طرح سمجھے جس کے نتیجے میں ایک قوی جذباتی رشتہ جو ایک باپ اور اس کی اولاد کے درمیان ہوتا ہے، ایسا ہی رشتہ اس کے اور اس کی رعایا کے درمیان برقرار ہونا چاہیے امام موسیٰ کاظم -فرماتے ہیں:

”اِنَّ السُّلْطانَ الْعادِلَ بِمَنْزِلَةِ الْوالِدِ الرَّحیمِ فَأَحِبُّوا لَهُ ما تُحِبُّونَ لأَنْفُسِكُمْ وَاَكْرِهُوا لَهُ ما تَكْرَهُونَ بِاَنْفُسِكُمْ“

”سلطان عادل ایک مہربان باپ کی طرح ہے پس اس کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جس چیز کو تم اپنے لئے ناپسندیدہ قرار دیتے ہو اسے اس کے لئے بھی ناپسندیدہ شمار کرو۔“[2]

۸۔ بخل، جہالت اور ظلم وستم سے دوری

امیر المؤمنین علیؑ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

”وَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنَّهُ لا یَنْبَغی اَنْ یَكُونَ الْوالی عَلَى الْفُرُوجِ وَالدِّماءِ وَالْمغانِمِ وَالاَحْكامِ وَ اِمامَةِ الْمُسْلِمینَ، اَلْبَخیلُ، فَتَكُونَ فی اَمْوالِهِمْ نَهْمَتُه، وَلا الْجاهِلُ فَیُضِلَّهُمْ بِجَهْلِهِ، وَلا الْجافی فَیَقْطَعَهُمْ بِجِفائِهِ، وَلا الْخائِفُ لِلدُّوَلِ، فَیَتَّخِذَ قَوماً دُوْنَ قَومٍ، وَلا الْمُرتَشِی فی الْحُكْمِ فَیَذْهَبُ بِالْحُقُوقِ وَیَقِفُ بِها دُوْنَ الْمَقاطِعِ، وَلا الْمُعَطِّلِ لِلْسُنَّةِ فَیُهْلِكَ الاُمَّةَ۔“

”تم لوگ جانتے ہو کہ جو شخص لوگوں کے خون، غنائم، احکام وراہنمائی اور ناموس پر حکومت کرتا ہے اسے بخیل اور کنجوس نہیں ہونا چاہیے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان کے اموال کی جمع آوری میں اپنے آپ کو حریص نہ بنا لے اور اسے جاہل ونادان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اپنے جہالت ونادانی کی وجہ سے لوگوں کو گمراہ کردے گا، نہ اسے جفا کار ہونا چاہیے وگرنہ وہ لوگوں کے درمیان تعلق کو ختم کردے گا اور نہ ہی ستمگر ہو ورنہ وہ ایک گروہ کو دوسرے

---

[1] بحار، ج ۲۷، ص ۲۷۔

[2] وسایل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۴۹۲، حدیث ۱

پر بلا وجہ ترجیح دے گا اور رشوت خور بھی نہ ہو ورنہ قضاوت میں لوگوں کے حقوق پامال کر دے گا، اور حقدار تک اس کا حق پہنچانے میں کوتاہی کرے گا اور نہ سنت کو معطل اور بے کار کر دینے والا ہو نہیں تو وہ امت کو ہلاکت میں ڈال دے گا۔'' (ایسے افراد میں سے کوئی شخص بھی حکومت کے لائق نہیں)۔[1]

۹۔ اہل باطل کے ساتھ صلح و آتشی اور ہم آہنگی سے پرہیز

امام علیؑ ہی نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں فرماتے ہیں:

"لا يُقيمُ اَمْرَ اللهِ سُبْحانَهُ اِلاّ مَنْ لا يُصانِعُ وَلا يُضارِعُ وَلا يَتَّبِعُ الْمَطامِعَ"

''فرمان خدا کو فقط وہی شخص قائم کر سکتا ہے جو ہر بات سے اتفاق کرنے والا نہ ہو اور اہل باطل کی روش پر گامزن نہ ہو اور نہ ہی طمع و لالچ کا پابند ہو۔''[2]

۱۰۔ اپنے عہدے اور منصب کو امانت سمجھے

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ متعدد روایات میں عہدوں اور مناصب کو حکومت اسلامی میں امانت کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے، نہ ایک برتری طلبی اور ذاتی استفادے کے عنوان سے۔ یہاں تک کہ احادیث سے پہلے قرآن کی بعض آیات میں بھی اس مطلب کو بصورت اشارہ بیان کیا گیا ہے، سورۂ نساء کی آیت ۵۸ میں ہے:

"إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ"

''خدا تعالیٰ تمہیں امانتیں ان کے اہل افراد کے سپرد کرنے کا حکم دیتا ہے، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو اسے عدالت پر مبنی ہونا چاہیے، خدا تعالیٰ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے، خدا سمیع و بصیر (سننے اور دیکھنے والا) ہے۔''

اس آیۂ شریفہ کے ذیل میں تفاسیر اور کتب حدیث میں متعدد روایات بیان ہوئی ہیں جن میں امانت سے مراد ولایت و حکومت

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳۱

[2] کلمات قصار، کلمہ ۱۲۰

اور پہلے مرحلے میں ائمہ معصومینؑ کی ولایت ہے۔[1]

مذکورہ آیت کی تفسیر میں ذکر شدہ چند روایات یہ ہیں

"یَعْنِی الأَمامَةَ، وَالإِمامَةُ الاَمانَةُ:

''اس آیت سے مراد امامت ہے اور امامت، امانت کے معنی میں ہے!''

دعائم الاسلام نامی کتاب میں بھی حضرت علیؑ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپؑ نے اہواز کے قاضی ''رفاعہ'' کی طرف بھی یہی لکھا:

"اِعْلَمْ یا رُفاعَةَ اِنَّ هٰذِهِ الاَمانَةُ، فَمَنْ جَعَلَها خِیانَةً فَعَلَیْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ اِلی یَوْمِ الْقِیامَةِ، وَمَنْ اِسْتَعْمَلَ خائِناً فَاِنَّ مُحَمَّداً(ص) بَرِیٌٔ مِنْهُ فِی الدُّنْیا وَالآخِرَةِ"

''اے رفاعہ! جان لو کہ یہ حکومت (اور اس کے مختلف عہدے) (خدا کی) امانت ہیں، جو کوئی ان میں خیانت کرے اس پر قیامت تک خدا کی لعنت ہو اور جو شخص کسی خائن سے کام لے محمدؐ اس سے دنیا و آخرت میں بیزار ہیں۔''[2]

تفسیر درالمنثور میں حضرت علیؑ ہی سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"حَقٌّ عَلَی الإِمامِ اَنْ یَحْکُمَ بِما اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاَنْ یُؤَدِّیَ الاَمانَةَ، فَاِذا فَعَلَ ذٰلِكَ فَحَقٌّ عَلَی النّاسِ اَنْ یَسْمَعُوا لَهُ وَاَنْ یُطیعُوا وَاَنْ یُجیبُوا اِذا دعُوا:"

''امام اور مسلمانوں کے رہبر پر لازم ہے کہ وہ خدا کے نازل کردہ (قرآن) کے مطابق حکومت کرے اور امانت کو ادا کرے، جب وہ یہ عمل انجام دے تو لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی باتوں پر توجہ دیں اور اس کی اطاعت کریں اور جب کبھی وہ انھیں بلائے تو وہ اس کی آواز پر لبیک کہیں۔''[3]

نہج البلاغہ میں بھی وہ خط ہے جسے جناب امیرؑ نے آذربائیجان کے حاکم کے نام لکھا:

"وَاِنَّ عَمَلَكَ لَیْسَ بِطُعْمَةٍ وَلٰکِنَّهُ فی عُنُقِكَ اَمانَةٌ"

''تیرا یہ کام (حکومت) تیری آب و نان (روٹی پانی) کا وسیلہ نہیں بلکہ تیری گردن پر ایک ذمہ داری۔''[4]

---

[1] تفسیر برہان میں کم از کم سات روایات اس ضمن میں کی گئی ہے، بحارالانوار میں بھی جلد ۲۳، ۶۷ اور ۱۰۲ میں صفحات ۲۸۰، قع ۲۵۲ پر اس ضمن میں کئی روایت ملتی ہیں۔

[2] دعائم الاسلام، ج۲، ص۵۳۱

[3] در المنثور، ج۲، ص۱۷۵

[4] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۔

واضح ہے کہ یہ روایات، آیۂ شریفہ کے وسیع مفہوم کو جو تمام امانتوں کی حفاظت کی تاکید کرتا ہے، محدود نہیں کرتیں بلکہ امانت کے ایک واضح نمونے کو بیان کرتی ہیں جو امانت الٰہی کا مصداق ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جو شخص اس منصب اور مقام کو امانت الٰہی کی نظر سے دیکھتا ہے، ان لوگوں کی نسبت اس کا طرز عمل بہت ہی مختلف ہوتا ہے کہ جو اسے اپنا حق سمجھتے ہیں اور اپنی مالکیت سمجھتے ہیں۔

جیسا کہ مال وثروت کے بارے میں بھی قرآن نے یہی تعبیر اختیار کی ہے اور اسے لوگوں کے ہاتھوں میں اللہ کی امانت قرار دیا ہے اور خدا کو اس کا اصلی مالک قرار دیا ہے کہ یہ امانت فقط چند دن اس کے بندوں کے سپرد کی گئی ہے جیسا کہ اس نے فرمایا:

"آمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِينَ فِيهِ"

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور اس چیز پر جس میں اس نے تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے۔[1]

یقیناً جو مال انسان کے ہاتھ میں بطور امانت ہے اور اس کے مالک نے اسے خاص موقعوں پر استعمال کرنے کا حکم دیا ہے اسے استعمال کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہے جبکہ اگر انسان اسے اپنا اصلی مالک جانے تو اس کا خرچ کرنا اس کے لئے آسان نہیں ہوتا۔

---

[1] حدید۔۷

انتظامیہ کی ترکیب

عام طور پر نظام نفاذ (انتظامیہ) ایک وسیع سلسلے پر مشتمل ہوتا ہے جس میں سر فہرست، حکومت کا صدر ہوتا ہے اور اس کے بعد وزراء ہوتے ہیں اور پھر تیسرے درجے پر ڈائریکٹر جنرل، گورنر، چیف کمشنرز اور ڈپٹی کمشنرز قرار پاتے ہیں ہر چھوٹے یا بڑے ملک کو اس طرح کی تقسیم کرنی پڑتی ہے، چاہے انہی ناموں کے ساتھ یا کسی اور نام سے۔ درحقیقت اس وسیع سلسلے کا ایک واضح فلسفہ ہے جس کا سرچشمہ کام میں تقسیم کی ضرورت ہے۔

قوانین کی دنیا اور انسانی معاشرے کے نظاموں میں اس قسم کی ضرورت اور تقسیم درحقیقت تکوینی نظام ہی کی نقل ہے۔ جب ہم انسان کے بدن کو اس کے اندرونی اور بیرونی نظام کے لحاظ سے دیکھتے ہیں تو یہ ''چھوٹی سی دنیا'' کہ جس میں ''ایک بڑی دنیا'' سمائی ہے تقسیم کار کے لحاظ سے انتہائی منظم اور وسیع وعریض سلسلے پر مشتمل ہے۔

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ جب انسان کو خطرے کا احساس ہوتا ہے اور وہ مثلاً کسی درندے کے وجود کو اپنی آنکھ اور کان سے اپنے قریب محسوس کرتا ہے (اور وہ اُس درندے کے چہرے کو دیکھتا یا اس کی آواز کو سنتا ہے) اور اگر اس کے پاس دفاع کے لئے کوئی ہتھیار وغیرہ نہ ہو اور وہاں نزدیک کوئی پناہ گاہ ہو تو عقل کی طرف سے اس پناہ گاہ کی طرف فرار کرنے کا حکم جاری ہوجاتا ہے اعصابی وعضلاتی سلسلہ بھی ایک دم متحرک ہوجاتا ہے، دل کی دھڑکنیں عضلات تک خون پہنچانے کے لئے شدت کے ساتھ اوپر نیچے ہونے لگتی ہیں۔

خون کی صفائی اور عضلات کے لئے زیادہ سے زیادہ آکسیجن کی فراہمی کے لئے پھیپھڑے سرعت کے ساتھ کام کرنے لگتے ہیں ہر قسم کی تھکاوٹ، کسالت اور نیند وقتی طور پر ختم ہوجاتی ہے اور انسان پوری ہوشیاری کے ساتھ اپنی حرکات اور حالات کی نگرانی کرنے لگتا ہے اور بقول مشہور اس کی نیند اڑ جاتی ہے۔

اس طرح وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کی سوچ کو مشغول رکھتے ہوئے اُسے اس اہم کام سے روک سکتی ہیں مثلاً بھوک و پیاس اور درد وغیرہ تو وہ سب اچانک فراموش ہوجاتی ہیں!! اسی طرح بدن میں ذخیرہ شدہ قوتیں مکمل طور پر فعال ہو کر سخت ترین کاموں کے لئے تیار ہوجاتی ہیں اور کبھی تو انسان عام حالت میں جس طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے اس کے دس گنا زیادہ طاقت ظاہر کرنے لگتا ہے اور یہ سب خود بخود ہوتا ہے اور یہ اتنا صحیح اور باریک بینی کے ساتھ ہوتا ہے کہ فقط اسی چیز کا مطالعہ پروردگار کے علم اور قدرت کو سمجھنے اور توحید کی حقیقت کا ادراک کرنے کے لئے کافی ہے۔

ایک انسانی معاشرہ بھی انسانی بدن کی طرح ہوتا ہے اس لئے اس میں بھی تمام کام صحیح طور پر تقسیم ہونے چاہیں اور معاشرے کے تمام ثقافتی، معاشی، عسکری، معنوی اور مادی تقاضے ایک صحیح منصوبہ بندی کے ساتھ انجام پانے چاہیں لہٰذا ان میں جدائی کے باوجود ان کا ہم آہنگ ہونا اور ہر ایک کام کا دوسرے کام کی تکمیل کا باعث بننا ضروری ہے۔

اسی وجہ سے تمام انسانی معاشروں نے خواہ وہ دیندار ہوں یا بے دین، مشرقی ہوں یا مغربی اور جدید ہوں یا قدیم، اسی اصول کو

اپنی معاشرتی زندگی میں قبول کر رکھا ہے۔ اگرچہ کاموں، عہدوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم اور کیفیت میں فرق ہوسکتا ہے۔ بعض بہت ہی ابتدائی مرحلے میں ہوتے ہیں اور بعض پورے حساب و کتاب کے ساتھ منظم انداز میں کام کرتے ہیں۔

عالم خلقت میں نظام نفاذ

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر اور توانا ہے اور وہ جس چیز کا بھی ارادہ کرے تو وہ فوراً ہو جاتی ہے:

إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾

''اس کا امر تو صرف یہ ہے کہ جس وقت وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے ''ہو جا'' پس وہ ہو جاتی ہے''[1]

اس طرح قرآن مجید کی آیات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے کاموں کو تقسیم کیا ہوا ہے۔ فرشتوں کے بہت سے گروہوں کو خلقت وشریعت کے اہم کاموں میں سے ہر ایک کام پر مأمور فرمایا ہوا ہے۔ کبھی تو کلی طور پر اس موضوع کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتا ہے:

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا أُولِيٓ أَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ

''وہی اللہ جس نے فرشتوں کو رسول قرار دیا ہے کہ جو دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہیں''[2]

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

"فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا"

''قسم ہے اُن فرشتوں کی جو امور کی تدبیر کرتے ہیں''[3]

ایک دوسری جگہ فرشتوں کی زبان سے اس طرح بیان کرتا ہے:

وَمَا مِنَّآ إِلَّا لَهُۥ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ ﴿١٦٤﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّونَ ﴿١٦٥﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ ﴿١٦٦﴾

یعنی: ''ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک معلوم مقام ہے اور ہم سب کے سب خدا کے حکم کی اطاعت کے لئے صف باندھے کھڑے ہیں اور ہم سب کے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں''[4]

---

[1] یس۔۸۲

[2] فاطر۔۱

[3] نازعات۔۵

[4] صافات۔۱۶۴،۱۶۶

اور کبھی خاص گروہوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اُن کے مخصوص فرائض کا ذکر کرتا ہے۔ بطور مثال چند گروہوں کا نام لیا جا سکتا ہے:

۱۔ وہ فرشتے جو وحی پہنچانے والے اور کتب آسمانی لانے والے تھے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ [1]

۲۔ وہ فرشتے جو حاملان عرش ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ [2]

۳۔ وہ فرشتے جو انسانوں کے اعمال ثبت کرنے پر مقرر ہیں:

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝۱۱ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۱۲ [3]

۴۔ فرشتوں کا وہ گروہ جو خدا کی طرف سے مؤمن کی جنگ کے سخت حالات میں یا زندگی کے نشیب وفراز میں مدد کرتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝۹ [4]

۵۔ فرشتوں کا وہ گروہ کہ جو بہت سے خطرات اور حادثوں میں انسانوں کی حفاظت کرتا ہے:

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ [5]

۶۔ کچھ فرشتے ارواح قبض کرنے پر مأمور ہیں:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ [6]

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ [7]

۷۔ کچھ فرشتے رزق تقسیم کرنے پر مأمور ہیں:

---

[1] نحل۔۲

[2] غافر۔۷

[3] انفطار۔۱۰،۱۲

[4] احزاب۔۹

[5] انعام۔۶۱

[6] سجدہ۔۱۱

[7] نحل۔۳۲

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ﴿۴﴾[1]

اس آیت کی تفسیر میں بعض نے اسے پہلے والی آیات کی مناسبت سے اُن فرشتوں کی طرف اشارہ قرار دیا ہے جو بندوں کے درمیان رزق تقسیم کرتے ہیں اور بعض نے اِسے اُن فرشتوں کی طرف ناظر قرار دیا ہے جو کائنات میں تمام کام تقسیم کرنے پر ماٴمور ہیں۔

۸۔ وہ فرشتے جو بادلوں کو پھیلانے اور بارشوں کو برسانے اور اُن کے برسنے کے بعد اُن کو بکھیرنے پر ماٴمور ہیں:

وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾،[2]

۹۔ کچھ فرشتے مؤمنین کے دلوں سے شیطانی وسواس کو ختم کرنے پر ماٴمور ہیں اور مؤمن بندوں کے دل و دماغ پر حملہ کرنے والے شیاطین کا مقابلہ کرتے ہوئے اُن کے وسوسوں کو بے اثر بناتے ہیں:

فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ﴿۲﴾ (صافات/۲)[3]

۱۰۔ وہ فرشتے جو شب قدر میں نازل ہوتے ہیں اور ایک سال کے دوران الٰہی مقدرات کو پہنچانے پر ماٴمور ہیں۔ یہ مقدرات ہر انسان کی لیاقت وصلاحیت کے مطابق مقرر ہوتے ہیں نہ کہ بغیر کسی حساب و کتاب اور جبر کے:

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ﴿۴﴾ (قدر/۴)

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا اللہ تعالیٰ ہر کام کے بارے میں جو قدرت وطاقت رکھتا ہے، اُس کے مطابق اُس نے اس کائنات کے کاموں کی تدبیر کا کام فرشتوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اُن کے ہر گروہ کو ایک ذمہ داری اور ماٴموریت دے دی ہے۔ اسلامی روایات میں بھی ذمہ داریوں کی تقسیم کے حوالے سے فرشتوں کی اصناف واقسام کے بارے میں بہت ہی بامعنی تعبیرات دیکھنے میں آئی ہیں، منجملہ نہج البلاغہ کے خطبۂ اشباح میں آیا ہے:

"مِنْهُمْ مَنْ هُوَ فِي خَلْقِ الْغَمَامِ الدُّلَّحِ، وَفِي عِظَمِ الْجِبَالِ الشُّمَّخِ، وَفِي قَتَرَةِ الظَّلَامِ الْاَبْهَمِ، وَمِنْهُمْ مَنْ خَرَقَتْ اَقْدَامُهُمْ تُخُومَ الْاَرْضِ السُّفْلَى، فَهِيَ كَرَايَاتٍ بِيضٍ قَدْ نَفَذَتْ فِي مَخَارِقِ الْهَوَاءِ، وَتَحْتَهَا رِيحٌ هَفَّافَةٌ تَحْبِسُهَا عَلَى حَيْثُ انْتَهَتْ مِنَ الْحُدُودِ الْمُتَنَاهِيَةِ، قَدِ اسْتَفْرَغَتْهُمْ اَشْغَالُ عِبَادَتِهِ، وَوَصَلَتْ حَقَائِقُ الْاِيمَانِ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَعْرِفَتِهِ، وَقَطَعَهُمُ الْاِيقَانُ بِهِ اِلَى الْوَلَهِ اِلَيْهِ، وَلَمْ تُجَاوِزْ رَغَبَاتُهُمْ مَا عِنْدَهُ اِلَى مَا عِنْدَ غَيْرِهِ، قَدْ ذَاقُوا حَلَاوَةَ مَعْرِفَتِهِ، وَشَرِبُوا بِالْكَاْسِ الرَّوِيَّةِ مِنْ مَحَبَّتِهِ"

---

[1] ذاریات۔۴

[2] مرسلات۔۳،۴

[3] اس کی تفسیر میں مختلف قسم کی باتیں کہی گئی ہیں کہ جن میں سے ایک تو وہی ہے جسے اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

یعنی: ''اُن میں سے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو بارش سے پُر بادلوں، بلند پہاڑوں اور تاریکیوں کی خلقت میں لگے ہوئے ہیں۔ اور کچھ فرشتے ایسے ہیں جن کے قدموں نے زمین میں سوراخ کر دیئے اور وہ زمین کے انتہائی پست مقام تک پہنچے ہوئے ہیں۔ پس ملائکہ کے یہ قدم ان سفید پرچموں کی مانند ہیں جنھیں فضا [ہوا] کی پھٹن میں گاڑ دیا گیا ہو اور ان کے قدموں کے نیچے ہوا چل رہی ہے جو انھیں ان کی قرارگاہ میں ٹھہرائے ہوئے ہے۔ خدا کی عبادت نے انھیں ہر کام سے روک رکھا ہے اور حقائق ایمان نے ان کے اور خدا کی معرفت کے درمیان ایک ارتباط اور تعلق پیدا کر دیا ہے۔ اس کی معرفت کی مٹھاس وہ چکھ چکے ہیں اور اس کی محبت اور دوستی سے لبریز اور سیراب کرنے والا جام انھوں نے پی لیا ہے۔''[۱]

فرشتوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں اور بھی روایات ہیں کہ جن سب کو یہاں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔[۲]

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے قرآن کا یہ پیغام مل رہا ہے کہ اگر انسان بھی اس کائنات میں پروردگار عالم کی ربوبیت پر مبنی نظام کے ساتھ ہم آہنگ اور ہم قدر ہونا اور عالم تکوین میں اس کے انتظامات کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے تو اسے بھی انسانی معاشرے میں پوری توجہ کے ساتھ کاموں اور ذمہ داریوں کی تقسیم کرنی چاہیے تا کہ اس کی زندگی کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔ دوسرے الفاظ میں ہم جانتے ہیں کہ تکوینی اور قانونی نظام ایک ساتھ چلنے چاہیں اور انسانوں کی زندگی کو خلقت الٰہی سے رہنمائی لینی چاہیے اور الٰہی رنگ اپنانا چاہیے اور جس طرح وہاں پر انجام پا رہا ہے یہاں بھی انجام پانا چاہیے اس حقیقت کی طرف توجہ ہمیں امور کے نفاذ کو منظم کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

عصر پیغمبرؐ میں نظام نفاذ

اگر چہ عصر پیغمبرؐ میں اسلامی حکومت انتہائی سادہ انداز میں تھی اس کے باوجود اس حکومت کے نظام نفاذ میں ذمہ داریوں کی تقسیم بالکل واضح اور منظم انداز میں تھی۔ منجملہ جب بھی پیغمبر اکرمؐ کسی جنگ میں بذات خود شرکت نہ فرماتے تو ایک یا چند سپہ سالاروں کو مقرر فرما دیتے تھے اور کبھی کسی ممکنہ حادثے کے امکان کی صورت میں پہلے سپہ سالار کے جانشین کے طور پر ایک اور سپہ سالار کو بھی مقرر کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً جنگ موتہ میں لشکر اسلام کا اصلی سپہ سالار جعفر بن ابی طالب کو مقرر کیا گیا تھا پھر مزید فرمایا: اگر جعفر کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو پھر ''زید بن حارثہ''، اور اگر ان کے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آ یا جائے ''عبداللہ بن رواحہ'' سپہ سالار رہوں گے اور اگر ان کو بھی کوئی حادثہ پیش آ جائے تو مسلمان باہمی مشورے سے اپنے میں سے کسی کو لشکر کی کمانڈ سونپ دیں۔[۳]

اسی طرح تاریخی کتب میں آیا ہے کہ وحی اور دوسرے امور کی کتابت کے لئے رسول اکرمؐ کے کچھ کاتب بھی تھے جن میں

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۹۱ (یہ خطبہ اشباح کے نام سے مشہور ہ ۷)

[۲] فرشتوں کی صناف کے بارے میں تفصیل جاننے کیلئے بحار الانوار، ج ۵۹ ص ۱۷۴، اور صحیفہ سجادیہ، دعائے سوم کی طرف رجوع کیجئے۔

[۳] سید المرسلین، ج ۲ ص ۴۴، بعض مورخین نے تینوں امیروں کی ترتیب کسی اور شکل میں ذکر کی ہے کہ جس کا ہمارے مقصد کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں۔

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابیطالبؑ وراسی طرح ''زید بن ثابت''، ''علاء بن حضرمی'' اور ''ابی بن کعب'' کا نام لیا جاسکتا ہے۔[1]

زکوٰۃ جمع کرنے کے لئے اور بیت المال کی ذمہ داریوں کے لیے بھی کچھ افراد کو منتخب کیا گیا تھا ان میں ''مہاجر بن ابی امیہ'' کو صنعا میں بیت المال کے اموال کو جمع کرنے کے لیے نگران مقرر کیا گیا تھا اور ''زیاد بن لبید'' کو حضر موت میں اور ''عدی بن حاتم'' کو قبیلہ طی میں، ''مالک بن نویرہ'' کو بنی حنظلہ میں، ''زبرقان بن بدر کو قبیلہ بنی اسد اور ''علاء بن حضرمی'' کو بحرین میں بیت المال کے اموال جمع کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔[2]

پیغمبر اکرمؐ نے نخلستانوں کی پیداوار کا تخمینہ لگانے اور زکوٰۃ کی مقدار کا تعین کرنے کے لئے بھی کچھ ماہرین مقرر فرمائے ہوئے تھے جن میں ''عبداللہ بن رواحہ'' کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مختلف علاقوں کے لئے آپؐ نے کچھ سپہ سالار بھی انتخاب کئے ہوئے تھے کہ جن میں یمن کے لئے حضرت علیؑ اور معاذ بن جبل، مکہ کے لئے عتاب بن اُسید اور بنی ثقیف کے علاقے کے لئے عثمان بن ابی العاص کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح آنحضرتؐ کے بہت سے سفیر بھی تھے جن میں سے ہر ایک کو دعوت اسلام کی تبلیغ کے لئے ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں اور بادشاہوں کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ منجملہ آپؐ نے ساسانی بادشاہ کسریٰ کی طرف ''عبداللہ بن حذافہ'' کو، روم کے بادشاہ ''قیصر'' کی طرف ''دحیۂ کلبی'' کو مصر کے بادشاہ ''مقوقس'' کی طرف ''حاطب بن ابی بلتعہ'' کو اور ''حبشہ'' کے حکمران ''نجاشی'' کی جانب ''عمرو بن امیہ'' کو بھیجا تھا۔[3]

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قسم کے تکلفات سے خالی اس حکومت میں نظام نفاذ مکمل طور پر منظم مختلف حصوں پر مشتمل تھا اور ہر حصے کے لئے ایک یا چند نگران مقرر تھے۔ ان سب باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے نظام نفاذ کے مختلف حصوں میں انتظامی امور اور ذمہ داریوں کی تقسیم کا مسئلہ ایک مسلمہ اور ناقابل انکار مسئلہ ہے۔

نظام نفاذ (انتظامیہ) کے سربراہ اور دیگر عہدہ داروں کے انتخاب کا طریقہ

اسلامی نظریہ کائنات میں حکومت اللہ تعالیٰ سے مختص ہے اور انسانی معاشروں میں اس کی مشروعیت (جواز) کا سرچشمہ اور اس کی سند اللہ تعالیٰ کی اجازت اور الٰہی تفویض ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر نظام نفاذ پیغمبر اکرمؐ اور پھر ائمہ معصومین × کی جانب سے اور ان کے بعد ان ذوات مقدسہ کے جانشینوں اور نمائندوں یعنی فقہاء عظام کی طرف سے تمام سلسلہ مراتب کے تحت مقرر ہوگا۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں جب پیغمبر اکرمؐ نے ہجرت کے آغاز میں مدینہ میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی اور اپنی باقی حیات مبارکہ میں اسے وسیع کیا اور تمام مقامات

---

[1] کامل ابن اثیر، ج ۲، ص ۳۱۳

[2] سیرہ ابن ہشام، ج ۴، ص ۲۴۶

[3] خاندان وحی، ص ۲۶

پر بذات خود گورنر، فوجی سپہ سالار، قاضی اور سفیر مقرر فرمائے اور جہاں ضرورت ہوئی تو اہم موقعوں پر ان عہدہ داروں کو مقرر کرنے کے لئے اپنے اصحاب کے ساتھ مشورہ بھی کیا۔

لیکن یقینا جب یہ کام جامع الشرائط فقیہ کے سپرد ہوتا ہے خصوصاً ہمارے زمانے میں تو حکومتی مسائل میں عوام کی شرکت ایک واضح چیز ہے، چونکہ عوامی شرکت کے بغیر حکومت کے ساتھ تعاون کا کوئی محرک باقی نہیں رہتا لہذا نظام نفاذ کی اعلیٰ سطح کے عہدہ داروں کا انتخاب کرنے کے لئے جو بھی لائحہ عمل بنایا جائے اس میں عوام کے ساتھ مشورہ ضرور ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں عوام کو نظام نفاذ کے سربراہ اور اس نظام کے اعلیٰ سطح کے عہدہ داروں کی پہچان ضروری ہے۔ اگر جامع الشرائط فقیہ اس سلسلے میں بے اعتنائی اور لاپرواہی کرے گا تو یقینا وہ مسلمانوں کی مصلحتوں کو خطرے میں ڈال دے گا اور اسلامی نظام کو متزلزل کر دے گا۔ جس کی وجہ سے اس کی ولایت کی مشروعیت (جواز) بھی ختم ہو جائے گی۔

ولی فقیہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں معصومین۔ کا جانشین ہوں اور اسلامی حکومت میں زمانہ رسول خداؐ کی طرح قانون نافذ کرنے والے تمام منتظمین، وزیر اعظم، وزیروں اور صدر کو خود مقرر کروں گا چونکہ یہ چیز عوامی مصلحت، مسلمانوں کے مفاد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی شرائط کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے اس لیے اس سے حکومت کے ستون کمزور، بنیادیں متزلزل اور اس کی طاقت کم ہو سکتی ہے بلکہ بہت جلد ایسی حکومت کی بساط لپیٹی جا سکتی ہے۔

ولی فقیہ کو چاہیے کہ وہ اس اہم مسئلے میں ''شوریٰ'' جیسے قرآنی اصول کا احترام کرتے ہوئے انتخاب میں عوام کو اہمیت دے اور انھیں اس اہم کام میں حصہ دار بنائے اور اس کا بہترین طریقہ وہی ہے کہ جس کو اسلامی جمہوری (ایران) کے آئین میں مدنظر رکھا گیا ہے جس کے مطابق پہلے مرحلے میں صدر کو عوام چنتے ہیں ان ووٹ سے وہ عوامی حمایت حاصل کر لیتا ہے اور آخری مرحلے میں جامع الشرائط فقیہ کی جانب سے اس کے صدارتی عہدے کی توثیق ہو جاتی ہے۔ اس طرح ایک جانب سے اگر اس کا عوامی پہلو ثابت ہوتا ہے تو دوسری جانب سے وہ الٰہی پہلو کا بھی حامل ہوتا ہے جس سے اس کی بنیاد تشکیل پاتی ہے۔ (غور فرمائیں)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ جب بھی ایک مؤمن اور مذہبی معاشرے میں پہلے سے درست طریقے کے مطابق مکمل پہچان وتعلیم کے ساتھ عوامی انتخاب عمل میں آتا ہے تو وہ اکثر صحیح ہوتا ہے۔ اب بعض مواقع پر عمومی تشخیص اور ضمیر سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے جبکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے، تو اس وقت جامع الشرائط فقیہ اپنے اختیارات سے استفادہ کرتے ہوئے ایسے شخص کے توثیق شدہ حکم کو واپس لے سکتا ہے لیکن چونکہ ولی فقیہ خود عوام کی طرف سے منتخب شدہ ہے (جیسا کہ بعد میں اس کی طرف اشارہ ہوگا) لہٰذا وہ پوری تدبیر وعقلمندی اور دلائل کے ساتھ لوگوں پر واضح کرے اور عمومی افکار کو اس بارے میں مطمئن کرے اور اگر کوئی غلط فہمی پیش آئے تو اس کی روک تھام کرے۔

البتہ ممکن ہے عوامی انتخاب بالواسطہ طریقے سے عمل میں آئے، یعنی؛ اسلامی اسمبلی کے لئے عوام اپنے نمائندوں کو چنیں اور پھر وہ نمائندے وزارت عظمیٰ کے عہدے کے لئے کسی کا نام پیش کریں اور بعد میں کافی مشورے کے بعد اس کی (اس عہدے کے لئے)

صلاحیت کو جانچا پرکھا جائے اور پھر اسے اعتماد کا ووٹ دے کر توثیق کے لئے ولی فقیہ کی طرف بھیج دیا جائے اور ولی فقیہ بھی کبھی تو بلاواسطہ اور کبھی بالواسطہ طریقے سے اس انتخاب کی تائید اور توثیق کردے (جیسا کہ شوریٰ نگہبان کے فقہاء کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں)۔

اگرچہ اسلامی جمہوری (ایران) کے نظام میں فی الحال انتظامیہ کے سربراہ یعنی؛ صدرمملکت کا انتخاب عوام کی طرف سے ہوتا ہے، لیکن اعلیٰ سطح کے عہدے داریعنی؛ وزراءصدر کے مشورے سے اسمبلی میں عوامی نمائندوں کے ذریعے چُنے جاتے ہیں۔اس طرح عوام دوطرح سے وزیروں کے انتخاب میں شریک ہوتے ہیں: ایک مجلس شوریٰ اسلامی کے نمائندوں کے ذریعے اور دوسرے صدرمملکت کے ذریعے کہ جوخود عوام کا منتخب شدہ ہوتا ہے۔

جامع الشرائط فقیہ بھی شوریٰ نگہبان اور پھر صدر کے حکم کی توثیق کے ذریعے اِس عمل کی نگرانی کرتا ہے۔ یہ طریقہ اتنا پیچیدہ نہیں اور پھر اس میں شرعی معیار کے مطابق جامع الشرائط فقیہ کا عمل دخل بھی واضح ہے اورعوامی شرکت بھی۔اس طرح اس نظام میں عوامی اور شرعی ہردو پہلوؤں کا بہت ہی احتیاط کے ساتھ خیال رکھا جاتا ہے۔(غور کیجئے)

اسلامی حکومت اور اس پر حاکم ثقافت

حکومت اسلامی سے متعلق کا یہ حصہ انتہائی اہم اور تعمیری حیثیت رکھتا ہے، چونکہ ممکن ہے کہ گذشتہ بحث میں حکومت اسلامی کے نظام نفاذ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے یہ تصور کیا جائے کہ حکومت اسلامی میں بھی وہی راہ وروش اختیار کی جاتی ہے جو غیر اسلامی حکمرانوں کی ہے۔یعنی غیر اسلامی حکومتوں میں جس طرح ذمہ داریوں کی تقسیم، وزارتوں کی تشکیل، وزیروں اور بلند پایہ اور نچلی سطح کے سرکاری افسران اور وزیر اعظم کا انتخاب ہوتا ہے، اسی طرح اسلامی نظام میں بھی، عوامی انتخابات اور لوگوں کی آراء چاہے براہ راست ہوں یا اسمبلی میں ان کے موجود نمائندوں کے ذریعے، پر تکیہ کیا جاتا ہے، بنابریں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے درمیان فرق محض نام اور عنوان کا ہے!

لیکن یہ تصور نہایت غلط ہے کیونکہ سب سے اہم چیز جو اقوام وملل اور حکومتوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے وہ ان (اسلامی وغیر اسلامی حکومتوں پر حاکم تہذیب وتمدن ہے) اس لئے کہ کوئی حکومت اپنے اداروں اور حکومتی اعضاء وارکان سمیت فقط جسم کی مانند ہے اور اس کی روح وہی ثقافت ہے جس کی اس پر حکمرانی ہے۔نظام اسلامی پر حاکم ثقافت اسلامی کا سراغ لگانے کے لئے بہت سی ابحاث ضروری ہیں اور اس مقصد کے لئے ایک جداگانہ کتاب یا کئی کتابیں تحریر کرنے کی ضرورت ہے جبکہ یہاں فقط ایک فہرست پر ہی اکتفا کی جاتی ہے۔

البتہ یہ فہرست قارئین کرام کو اس مسئلے کی اجمالی کیفیت اور اس کے مقاصد واہمیت سے آگاہی بخشنے کے لئے ایک حد تک کفایت کرتی ہے۔مجموعی طور پر تین بنیادی اور اساسی قوانین ہیں جو اسلامی نظام حکومت پر حکم فرما ہیں اور اسے دوسری حکومتوں سے ممتاز اور جدا کرتے ہیں:

۱۔قوانین کو نافذ کرنے والے ذمہ دار افراد اپنے آپ کو خدا کی طرف سے امانتدار جانتے ہیں اور حکومت اور اس کے عہدوں کو جو ان کے سپرد کئے گئے ہیں امانت خدا قرار دیتے ہوئے ممکنہ حد تک ان کی حفاظت اور پاسداری کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنیں اور خدائی فرمان کو اس کے بندوں پر من وعن نافذ کریں۔ایسے لوگ ہرگز اپنے عہدے کی حفاظت اور اپنے یا کسی خاص گروہ کے منافع کے حصول کے چکروں میں پڑ ہی نہیں سکتے۔

حالانکہ مادی اور غیر اسلامی حکمرانوں کی نظر میں اپنے عہدے اور منافع کی حفاظت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی، اور گاہے ممکن ہے کہ کسی عہدے کے حصول کے لئے کروڑوں روپے خرچ کر ڈالیں اس یقین کے ساتھ کہ حکومت تک رسائی کے بعد وہ خرچ شدہ رقم کا کئی گناہ حاصل کرلیں گے، یا کم از کم ان کا تعلق کسی خاص طبقے یا کسی خاص پارٹی سے ہوتا ہے جو ایسے افراد کو حکومت میں لانے کے لئے مال ودولت خرچ کرتی ہے تا کہ بعد ازاں اس سرمایہ کاری سے خوب منافع کمائے۔اس لئے ایسے منتخب افراد پارٹی وغیرہ کے منافع کا بھرپور تحفظ کرتے ہیں۔اس غیر اسلامی اور اسلامی نقطۂ نظر کا فرق بالکل واضح اور مکمل طور پر عیاں ہے۔

۲۔لوگ اسلامی حکومت کے عہدیداروں کو خدا کی طرف سے مبعوث شدہ جانتے ہیں چونکہ ان کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت کا پرتو ہوتی ہے اوران کا فرمان حقیقت میں فرمان خدا ہوتا ہے۔لوگ حکومت اسلامی کے قوانین کو خدا کے قوانین سمجھتے ہیں اور ان کی اطاعت کو آخرت میں نجات کا سبب خیال کرتے ہیں اوران قوانین کی مخالفت کو گناہ اورآخرت میں عذاب کا سبب جانتے ہیں البتہ یہ اس صورت میں ممکن ہے جب حکومت اسلامی صحیح بنیادوں پر استوار ہو۔یہ نقطۂ نظر مادی حکومتوں کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے چونکہ لوگ غیر اسلامی حکمرانوں کو اپنی طرح کا عام انسان خیال کرتے ہیں جو غالباً اپنے یا اپنی پارٹی کے منافع کے حصول کے درپے ہوتے ہیں اور جب کبھی انھیں کوئی قانون پسند نہ آئے اورسزا کا خوف بھی نہ ہو تو ایسے قانون کی خلاف ورزی کرنے میں وہ (لوگ) کسی بات کی پرواہ نہیں کرتے۔

۳۔اصولی طور پر حکومت اسلامی میں معنویت اوراخلاقی قدریں ہر چیز سے زیادہ اہم ہوتی ہیں لہٰذا ہر کام اخلاقی اورانسانی عنوان سے انجام پانا چاہیے، تمام (روحانی) محرکات کو مادی محرکات پر فضیلت اورسبقت حاصل ہونی چاہیے، کیا تشکیل حکومت اور بہتر زندگی کا انتہائی مقصد، سیر الیٰ اللہ، خدا کا قرب ونزدیکی اورروحانی ومعنوی کمالات کے حصول کے مقدمات کی فراہمی نہیں ہے؟ (یعنی تشکیل حکومت کا مقصد، قرب خدا تعالیٰ کا حصول ہے اوراسلامی حکومت کی تشکیل ہوگی تو انسان کے لئے یہ مقصد حاصل کرنا ممکن ہوگا)۔کیا ممکن ہے کہ اسلام میں تشکیل حکومت کے محرکات ایک مادی حکومت میں موجود کارندوں اورعوام کے محرکات کے ساتھ مساوی ہوں؟

البتہ سو فیصد خالص حکومت الٰہی واسلامی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ایک طویل سفر درپیش ہے اورضروری ہے کہ معاشرے کو تعلیم وتربیت کے اسلحے سے لیس کیا جائے لیکن بہرحال حکومت اسلامی کی شکل وصورت ثقافتی اورتمدنی نقطۂ نظر سے مادی حکومتوں کی شکل وصورت سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مکمل طور پر جدا ہیں۔اس مختصر سی تحلیل وتوضیح کے بعد ضروری ہے کہ پہلے آیات قرآن اور پھر احادیث کی طرف رجوع کیا جائے تاکہ ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کے مختلف محوروں پر حاکم ثقافت کو پرکھا جاسکے۔

۱۔خدا تعالیٰ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں فرماتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝۱۵۹

''اے رسولؐ! رحمت خداوندی کی برکت سے آپؐ ان لوگوں کے حق میں نرم اورمہربان ہیں اوراگر آپ تندخو اورسنگدل ہوتے تو لوگ آپؐ کے اطراف سے پراکندہ ہوجاتے۔پس آپؐ انھیں بخش دیں اوران کے لئے (خدا سے) مغفرت طلب کریں، اورمختلف معاملات میں ان کے ساتھ مشورہ کریں، لیکن جب آپؐ کوئی

فیصلہ کرلیں تو اس پر ڈٹ جائیں اور خدا پر توکل کریں کیونکہ خدا توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اسی طرح حاکم اسلامی پختہ فیصلے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی مامور ہے کہ وہ عفو و درگذر کرے اور اپنے رب کی بارگاہ میں لوگوں کے لئے استغفار کرے جبکہ تمام امور اور سارے کاموں میں اس کا حقیقی سہارا فقط خدا ہوتا ہے اور وہ اسے ہی اپنی حقیقی تکیہ گاہ سمجھتا ہے۔

۲۔خدا تعالیٰ سورۂ فصلت کی آیت ۳۴ میں حکم دیتا ہے کہ باہمی کدورت اور دشمنی کو محبت کے پانی کے ساتھ دھوڈالو اور جہاں تک ممکن ہو دوستوں کے ساتھ انتقامی کاروائی سے گریز کرو۔فرمان الٰہی ہے:

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ [1]

''برائی کو اچھائی کے ذریعے دور کرتا کہ تیرے زبردست دشمن بھی تیرے سچے اور پکے دوست بن جائیں۔

لیکن اس کے بعد بلا فاصلہ یہ اضافہ فرماتا ہے: اس درجے تک صرف وہی لوگ پہنچ پاتے ہیں جو صاحبان صبر و استقامت ہیں اور ایمان و تقویٰ کی دولت سے مالا مال افراد ہی اس مرحلے کو حاصل کرسکتے ہیں۔''

نفاذ اسلام کے نظام پر اس قسم کی ثقافت کی حاکمیت جو ثقافت مادی کی ضد ہے، اسلامی نظام کے نفاذ کو ایک خاص قسم کی نورانیت اور صفا و جلا بخشتی ہے اور اسے ایک خاص معنی و مفہوم سے آشنا کرتی ہے۔

۳۔سورۂ کہف کی آیت ۲۸ میں ان لوگوں کے اصرار کے مقابلے میں جو اس بات کے معتقد تھے کہ رسول اکرمؐ کو چاہیے کہ وہ فقیر و نادار افراد کو خود سے دور رکھیں، اگرچہ یہ نادار افراد مخلص اور باایمان ہی کیوں نہ ہوں اور صاحب اثر اور دولت مند افراد سے نزدیک ہوں، صریح طور پر ارشاد فرماتا ہے:

وَاصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَالۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ وَلَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ ۚ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَہٗ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَاتَّبَعَ ہَوٰىہُ وَکَانَ اَمۡرُہٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

''اے رسولؐ! ان لوگوں کے ساتھ رہو جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں اور وہ فقط اسی کی رضا کے طالب ہیں اور دنیا کی زیب و زینت کی خاطر ہرگز انھیں اپنی نظروں سے دور نہ کرو اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کرو جن کے دلوں کو ہم نے (ان کے کرتوتوں کے باعث) اپنی یاد سے غافل کردیا ہے، وہی جو اپنی خواہش نفس کے تابع ہیں اور ان کا کام افراط پر مبنی ہے۔

[1] سورہ فصلت۔ ۳۴

کس قدر فرق ہے اس منطق، جو عشق وایمان کو اس قسم کے (نادار) افراد میں بالاترین قدر و قیمت قرار دیتی اور یہ کہ خدا سے غافل دولت مندوں کو خود سے دور کرو نہ ان لوگوں کو جو فقیر ہیں لیکن مخلص و باایمان، اوران لوگوں کی منطق کے درمیان جو آج پورے دنیا میں علی الاعلان کہتے نظر آتے ہیں کہ قدر و قیمت کا اصلی معیار فقط مال ودولت اور منافع ہیں، (نہ ایمان واخلاص) اور دیگر ہر طرح کی قدر و قیمت کو (مال ودولت اور منافع) پر قربان کرتے ہیں۔

۴۔سورۂ ص کی آیت ۲۶ میں حضرت داوٗدؑ سے قاطعانہ اور جارحانہ انداز میں خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

اے داوٗد! ہم نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ اور نمائندہ مقرر کیا ہے، پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کیونکہ (اگر نفس کی پیروی کروگے تو) یہ تمہیں راہ خدا سے منحرف کر دے گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آیت شریفہ میں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو بطور نمونہ ومثال تنبیہ کررہا ہے کہ وہ شیطان نفس کے وسوسوں پر کڑی نظر رکھے تاکہ وہ (شیطان نفس) پیغمبر (داوٗدؑ) کے جادۂ حق وعدالت سے انحراف کا باعث نہ بنے۔

بنابریں ایک اسلامی حاکم ہمیشہ اس بات کی طرف متوجہ رہتا ہے کہ کہیں وہ اپنی قضاوت اور فیصلے میں حب وبغض اور خواہش نفس کی گرفت میں نہ آجائے اور ایسا نہ ہو کہ کسی بے گناہ کا حق ضائع ہو جائے، کس قدر فرق ہے اس منطق اور ان لوگوں کی منطق کے درمیان جو فقط قاضی کو قانون کے مقابلے میں ذمہ دار جانتے ہیں، قانون بھی ایسا جو ہزار نوع راہ فرار، توجیہات اور تفاسیر کا حامل ہوتا ہے (یعنی قاضی جیسا چاہے فیصلہ کرے چاہے مبنی برحق ہو یا ناحق)۔

۵۔سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵ میں تمام مومنین سے خطاب کر کے ایک اور اہم بنیادی قانون کا تذکرہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ اصول وضوابط ہر قسم کے رابطے پر مقدم ہیں، ارشاد خداوندی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۚ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

''اے ایمان والو! مکمل طور پر عدالت قائم کرنے والے بنو، اور شہادت دو تو خدا کے لئے اگرچہ یہ شہادت خود تمہارے یا تمہارے والدین یا قرابتداروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اگر وہ غنی یا فقیر ہوں تو خدا اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ ان کی حمایت کرے، پس اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو وگرنہ حق سے منحرف ہو جاؤ گے اور اگر حق بات میں تحریف (تبدیلی) یا اس کے اظہار سے اعراض وانکار کروگے تو خدا

تمہارے ہر اس فعل سے باخبر ہے جسے تم انجام دیتے ہو۔''

نتیجہ یہ کہ نہ صرف اولاد، والدین اور بھائی کا رابطہ و رشتہ نفاذ حق اور قیام عدل و انصاف کی راہ میں مانع نہ بنے بلکہ نفاذ حق کی خاطر انسان اپنے ذاتی منافع اور فوائد کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ یہ بات واضح اور ممکن ہے کہ اس قسم کے مسائل کے بارے میں مادی حکومتیں بھی کچھ نہ کچھ کہیں لیکن ان کے پاس نہ صرف حق کو نافذ کرنے کو ضمانت نہیں ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس بات کا درست مفہوم بھی ان کے لئے قابل تصور نہیں اسی دلیل کے پیش نظر ان کی بڑی بڑی شخصیات نے ہمیشہ سے عدل و انصاف اور قیام و نفاذ حق پر اپنے ذاتی منافع و فوائد کو ترجیح دی ہے۔

ایسی صورتحال میں یہاں ضوابط کے مقابلے میں روابط کا پلہ بھاری نظر آتا ہے اور بعض اوقات تو علی الاعلان متضاد عمل اور دوغلا پن واضح طور پر نظر آتا ہے مثلاً دو مشابہ صورتوں میں کہ ایک صورت میں ذاتی منافع ہیں اور دوسری صورت ذاتی منافع سے خالی ہے، ایسی صورتحال میں قوانین آسانی کے ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ بات ثابت اور عیاں ہوجاتی ہے کہ عدل و انصاف کا قیام اور حقوق بشر کی باتیں محض خالی خولی نعرے ہی ہیں اور ان کی عملی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ احادیث میں بھی اسلامی حکومت پر حاکم ثقافت اسلامی کے بارے میں نہایت پر کشش اور دلچسپ نکات نظر آتے ہیں، لیکن ان سب کی شرح و توضیح بہت طولانی ہوجائے گی لیکن پھر بھی یہاں بعض نکات کو اشارتاً ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ جنگ انسانوں کی باہمی عداوت و خشونت کا نقطۂ عروج ہے، بعض اوقات یہ عداوت اور خشونت ان لوگوں کے مقابلے میں ضروری ہوجاتی ہے جو سوائے طاقت کی زبان کے کوئی دوسری زبان نہیں سمجھتے اس کے باوجود اسلام نے اپنی جنگی حکمت عملی میں انسانی مسائل کو باہمی عداوت کی صورت میں بھی ملحوظ رکھا ہے اور سخت ترین اور ضدی دشمنوں کے مقابلے میں میدان جنگ میں بھی اصول اخلاق کی اہمیت اور حرمت کو پیش نظر رکھا اور انھیں لازم قرار دیا ہے۔ جب اسلام کے سپاہی میدان جنگ کی طرف روانہ ہونے لگتے تو رسول اکرمؐ انھیں اپنے پاس بلا کر جنگی احکام کے بارے میں فرماتے تھے، آپؐ کا فرمان کچھ اس طرح کے کلمات پر مشتمل ہوتا تھا:

''سِيرُوا بِسْمِ اللهِ وَ بِاللهِ وَ فِی سَبِيلِ اللهِ وَ عَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللهِ لاتَغُلُّوا، وَ لا تُمَثِّلُوا وَلا تَغْدِرُوا وَلا تَقْتُلُوا شَيْخاً فانِياً، وَ لا اِمْرَاَةً وَ لا تَقْطَعُوا شَجَراً اِلاَّ اَنْ تَضْطَرُّوا اِلَيها، وَ اَيُّما رَجُلٍ مِنْ اَدْنَى الْمُسْلِمِينَ اَوْ اَفْضَلِهِمْ نَظَرَ اِلى رَجُلٍ مِنَ الْمُشْرِكِينَ فَهُوَ جارٌ حَتّى يَسْمَعَ كَلامَ اللهِ فَاِنْ تَبِعَكُمْ فَاَخُوكُمْ فِى الدِّينِ وَ اِنْ اَبى فَاَبْلِغُوهُ مَاْمَنَهُ وَاسْتَعِينُوا بِاللهِ عَلَيْهِ''

''بنام خدا اور اس کی مدد سے اور اسی کی خاطر اور آئین و ملت رسولؐ پر (رہتے ہوئے) روانہ ہوجاؤ۔ خیانت نہ کرنا، میدان جنگ کے مقتولین اور مجروحین کے اعضاء نہ کاٹنا، عہد و پیمان نہ توڑنا، بوڑھوں کو قتل نہ کرنا اور اسی طرح بچوں اور عورتوں کو تہہ تیغ کرنے سے پرہیز کرنا، بغیر ضرورت کے کسی درخت کو نہ کاٹنا اور جب کبھی کوئی

مسلمان چاہے وہ بلند مرتبہ ہو یا پست مرتبہ، مشرکین کے لشکر کے کسی فرد کو جان کی امان دے تو وہ مشرک امان میں ہے تاکہ وہ (مشرک) تمہاری زبان سے کلام خدا کو سنے۔ اگر کلام خدا سن کر وہ اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس صورت میں وہ تمہارا دینی بھائی ہے اور اگر اسلام قبول نہیں کرتا تو اسے اس جگہ پہنچا دو جو اس کے لئے جائے امن ہو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ مسلمان ہو جائے۔"[1]

آنحضرتؐ کا ایک اور فرمان یہ ہے:

"نَهَى رَسُولُ اللهِ اَنْ يُلْقَى السُّمُّ فِى بِلادِ الْمُشْرِكِينَ"

ترجمہ: "رسول اکرمؐ نے مشرکین کے شہروں کو زہر آلود کرنے سے منع فرمایا ہے۔"[2]

اس بناء پر زہریلی گیسوں، زہر آلود ادویات اور کیمیائی اسلحہ کا استعمال ممنوع ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور فرمان جو امام جعفر صادقؑ نے رسول اکرمؐ سے نقل فرمایا ہے اور وہ یہ کہ

"مابَيَّتَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم عَدُوّاً قَطُّ"

ترجمہ: "رسول اکرمؐ نے کبھی دشمن کے لشکر پر شبخون نہیں مارا۔"[3]

مزید ایک اور فرمان جو آنحضرتؐ سے صادر ہوا اور جس میں آپؐ کا خطاب حضرت علیؑ سے ہے، یہ تب کی بات ہے جب حضرت علیؑ عازم یمن تھے، آپؐ نے فرمایا:

"لاتُقاتِلَنَّ اَحداً حَتّٰى تَدْعُوهُ وَ اَيْمُ اللهِ لاَنْ يَهْدِىَ اللهُ عَلى يَدَيْكَ رَجُلاً خَيْرٌ لَكَ مِمّا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَغَرَبَتْ"

ترجمہ: "کسی کے ساتھ جنگ نہ کرو مگر اس وقت جب تم لوگ اس سے پہلے اسے قبول اسلام کی دعوت دے چکے ہو (اور جس قدر ممکن ہو اس (ان لوگوں) کی ہدایت کی خاطر جنگ وجدال سے ہاتھ اٹھائے رکھو) خدا کی قسم اگر خدا تعالیٰ تمہارے ذریعے کسی ایک شخص کو بھی صراط مستقیم کی طرف ہدایت کر دے تو یہ تمہارے لئے ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع وغروب ہوتا ہے۔"[4]

---

[1] فروع کافی، ج۵ص ۲۷، ۲۸، حدیث ۱

[2] فروع کافی، ج۵، ، ۲۸، حدیث ۲

[3] فروع کافی، ج۵، ، ۲۸، (باب وصیۃ رسول اللہ۔۔۔۔۔۔حدیث ۳)

[4] فروع کافی، ج۵، ، ۲۸، حدیث ۴

۲۔ مالیات کی جمع آوری میں اسلامی آداب

زکات اور بیت المال کے دوسرے اموال کی جمع آوری سے متعلق آداب کے بارے میں ہے کہ حضرت علیؑ جب کسی شخص کو زکات کا مال جمع کرنے کے لئے مامور فرماتے تو ایک تفصیلی فرمان اسے تحریر کر کے دیتے، درج ذیل عبارت اسی فرمان کا ایک حصہ ہے:

"اِنْطَلِقْ عَلی تَقْوَی اللهِ وَحْدَهُ لا شَرِیْكَ لَهُ، وَلا تُرَوِّ عَنَّ مُسْلِماً، وَلا تَجْتازَنَّ عَلَیْهِ کارِهاً، وَلا تَأْخُذَنَّ مِنْهُ اَکْثَرَ مِنْ حَقِّ اللهِ فی مالِهِ فَإِذا قَدِمْتَ عَلَی الْحَیِّ فَانْزِلْ بِمائِهِمْ مِنْ غَیْرِ اَنْ تُخالِطَ اَبْیاتَهُمْ، ثُمَّ امْضِ اِلَیْهِمْ بِالسَّکِینَةِ وَالْوَقارِ حَتّی تَقُومَ بَیْنَهُمْ فَتُسَلِّمَ عَلَیْهِمْ وَلا تُخْدِجْ بِالتَّحِیَّةِ لَهُمْ ثُمَّ تَقُولَ:
عِبادَاللهِ! اَرْسَلَنی اِلَیْکُمْ وَلِیُّ اللهِ وَخَلِیْفَتُهُ لاٰخُذَ مِنْکُمْ حَقَّ اللهِ فی اَمْوالِکُمْ فَهَلْ لِلّٰهِ فی اَمْوالِکُمْ مَنْ حَقٍّ فَتُؤَدُّوهُ اِلی وَلِیِّهِ. فَاِنْ قالَ قائِلٌ: لا، فَلا تُراجِعْهُ، وَاِنْ اَنْعَمَ لَكَ مُنْعِمٌ فَانْطَلِقْ مَعَهُ مِنْ غَیْرِ اَنْ تُخِیْفَهُ اَوْ تُوَعِّدَهُ اَوْ تَعَسِّفَه او تُرهقه"

''خداوند واحد کہ جس کا کوئی شریک نہیں اس کے تقوی اور بھروسے پر روانہ ہو جاؤ راستے میں کسی مسلمان کو مت ڈراؤ اور اس کی سرزمین سے ایسی حالت میں مت گذرو کہ وہ تم سے ناراض ہو اس کے اموال میں جو مال زکات ہے اس سے زیادہ اس سے نہ لو، جب تم کسی قبیلے کی آبادی کے قریب پہنچو تو اس آبادی کے اس حصے میں پڑاؤ ڈالو (یعنی قیام کرو) جہاں ان کا پانی کا گھاٹ ہے اور ان کے گھروں میں ہرگز داخل نہ ہو، بعدازاں سکون ووقار کے ساتھ آبادی کے افراد کی طرف جاؤ یہاں تک کہ ان میں پہنچ جاؤ اور انھیں سلام کرو اور ان کے ساتھ اظہار محبت وسلام میں ہرگز کنجوسی نہ کرو اس کے بعد ان سے یوں کہو:
اے بندگان خدا! مجھے ولی خدا اور اس کے خلیفہ نے تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ میں تمہارے اموال میں سے خدا کا حق حاصل کروں، کیا تمہارے اموال میں کوئی حق موجود ہے کہ اسے تم لوگ اس کے نمائندے کے سپرد کرو؟ اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں، تو پھر اس کی طرف دوبارہ رجوع نہ کرو! اور اگر کوئی شخص اثبات میں جواب دے تو اس کے ہمراہ جاؤ لیکن اسے ڈراؤ مت اور کوئی دھمکی وغیرہ نہ دو، اسی طرح اسے کسی مشکل کام کے کرنے کا پابند بھی نہ بناؤ۔''

اسی بیان کو جاری رکھتے ہوئے مزید تاکیدی انداز میں لوگوں کے اموال سے بیت المال کی زکوۃ حاصل کرنے کے عادلانہ

طریقے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مال زکات کے حصول میں لوگوں کے خوب وبد اور پسندیدہ وغیرہ پسندیدہ مال کا لحاظ کیا جائے اور اس ضمن میں ان کے ساتھ نرمی برتی جائے اس قسم کے مسائل میں لوگوں کے ساتھ اس طرح کا بزرگانہ رویہ اپنانا حکومت اسلامی کی بہترین اقدار کا ایک واضح اور روشن نمونہ ہے۔[1]

ممکن ہے کوئی یہ تصور کرے کہ مالیات اسلامی میں اس قسم کا رویہ اپنانا حکومت کے کمزور ہونے کا باعث ہے اور ایسا رویہ اس چیز کے برعکس ہے جس کا ہم آج کل مشاہدہ کرتے ہیں (یعنی ایسا طرز عمل حکومت کے حق میں نہیں ہے) لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس قسم کا دستور اور طرز عمل فقط اسی معاشرے میں نافذ ہوسکتا ہے جس کی تربیت اسلامی تمدن کے مطابق کی گئی ہو اور لوگوں (اہل معاشرہ) میں حقیقی احساس ذمہ داری بھی موجود ہو۔

آج بھی ہم بعض ایسے معاشروں کو جانتے ہیں جن میں ان پر حاکم ثقافت کے باعث اکثر لوگ رضا کارانہ طور پر مالیات (ٹیکس) ادا کرتے ہیں جبکہ کوئی انھیں مجبور بھی نہیں کرتا اور اس سے بہتر مثال خود ہمارے اپنے اسلامی معاشرے میں موجود ہے اور وہ یہ کہ ہزاروں دیندار افراد مراجع تقلید کے پاس آکر اپنے اموال کا حساب کرکے اس کا خمس (پانچواں حصہ) رازداری کے ساتھ ان کے حوالے کر دیتے ہیں یہاں تک کہ چند کلو چینی، چائے اور دیگر چیزوں کو بھی حساب کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتے ہیں بالکل ایسے ہی جس طرح لوگ زکات فطرہ کی ادائیگی کو اپنی شرعی ذمہ داری قرار دیتے ہیں جب اس قسم کی اسلامی ثقافت اور تمدن تمام مالیاتی معاملات پر حاکم ہو تو مذکورہ بالا اعتراض کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

۳۔ ہر چیز میں میانہ روی

بیت المال سے متعلق اموال، جو امانت الٰہی ہیں اور بروز قیامت جن کا سخت حساب ہوگا، کے خرچ میں غیر معمولی سختی اور درست حساب وکتاب تمدن اسلامی کی ایک اور خصوصیت ہے اور اس کا واضح مصداق اور روشن مثال حضرت امیر المؤمنینؑ اور ان کے بھائی حضرت عقیل کے درمیان پیش آنے والا ماجرا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپؑ اپنے بھائی کی ناداری کے باوجود دوسرے مسلمانوں اور اپنے بھائی کے درمیان ذرا سی فوقیت اور امتیاز کے قائل بھی نہ ہوئے یہاں تک کہ آپؑ نے لوہے کی گرم سلاخ کو عقیل کے ہاتھ کے نزدیک کیا اور انھیں اس طرح متنبہ کرکے عذاب آخرت سے ڈرایا، وہ عذاب آخرت جو خلاف انصاف صورت میں لینے اور دینے والے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

اس ضمن میں اسلامی رہنماؤں اور پیشواؤں کی سخت گیری اور دقت کی مثالیں بکثرت موجود ہیں جن کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، جن میں سے ایک جناب امیر المؤمنینؑ کا وہ فرمان ہے جسے آپؑ نے حکومت اسلامی کے مکتوبات لکھنے والوں کے کو دیا اور فرمایا:

"اَدِقُّوا اَقْلَامَکُمْ وَ قَارِبُوا بَیْنَ سُطُورِکُمْ وَ احْذِفُوا عَنِّی فُضُولَکُمْ، وَاقْصُدُوا قَصْدَ

---

[1] نہج البلاغہ، حصہ مکتوبات، مکتوب، ۲۵۔

الْمَعانی، وَاِیّاکُمْ وَالاِکْثارَ، فَاِنَّ اَمْوالَ الْمُسْلِمِینَ لا تَحْمَّلَ الاِضْرارَ":

اپنے قلم کی نوک تیز رکھو (تاکہ اس طرح تم الفاظ کو باریک سے باریک تر لکھ سکو) اور سطروں کے درمیان فاصلے کو کم رکھو اور اضافی اور غیر ضروری مطالب کو حذف کر کے اصل مطلب کی بات کو تحریر کرو اور لفاظی اور غیر مفید الفاظ زیادہ لکھنے سے پرہیز کرو چونکہ مسلمانوں کے اموال اس ضرر ونقصان کو برداشت نہیں کر سکتے۔[1]

امام جعفر صادق - نے اس مطلب کو کلی طور پر یوں بیان فرمایا ہے:

" اِنَّ الْقَصْدَ اَمْر یُحِبُّهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ وَ اِنَّ السَّرَف یُبْغِضُهُ حَتّٰی طَرْحِكَ النَّواةَ فَاِنَّها تَصْلَحُ لِشَیئٍ وَحَتّٰی صَبِّكَ فَضْلَ شَرابِكَ"

میان روی اور صرفہ جوئی ایسا کام ہے جسے خدا تعالیٰ پسند کرتا ہے اور اسراف وفضول خرچی خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے یہاں تک کہ کھجور کی گٹھلی کو بھی پھینک دینا درست نہیں اور وہ اس لئے کہ وہ بھی بہرحال کارآمد ہے یہی نہیں بلکہ پی کر بچے ہوئے پانی کو گرادینا بھی اسراف ہے۔[2]

لہٰذا آج یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ کوئی چیز پھینک دینے کے قابل نہیں ہے یعنی فضول اور ضائع شدہ مصنوعات سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ گندے اور ناپاک پانی کو بھی صاف کر کے اسے زراعت میں استعمال کرتے ہیں جس کے نتیجے میں پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے اس سے مختلف مصنوعات حاصل کرتے ہیں۔ ہم اس مطلب کو صحیفہ سجادیہ میں موجود امام علی بن الحسین - کی ایک دعا کے ایک نہایت پر مغز ومعنی جملے کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ امام علی بن الحسین - بارگاہ خدا میں عرض کرتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَالِهِ وَاحْجُبْنی عَنِ السَّرَف وَالاِزْدِیادِ، وَ قَوِّمْنی بِالْبَذْلِ وَالاِقْتِصادِ، وَ عَلِّمْنی حُسْنَ التَّقْدیرِ، وَاقْبِضْنی بِلُطْفِكَ عَنِ التَّبْذیرِ"

''خداوندا محمدؐ اور ان کی آل پاکؑ پر درود بھیج، اور مجھے اسراف وفضول خرچی سے باز رکھ اور عطا وبخشش اور میانہ روی پر ثابت قدم رکھ اور مجھے حسن تقدیر (زندگی میں درست اندازہ گیری کے آداب سے) مزین فرما، اور اپنے لطف وکرم کے طفیل مجھے تبذیر اور بے جا خرچ سے روکے رکھ۔''[3]

---

[1] خصال، ج ا (باب الخمسہ) علامہ مجلسی نے بھی بحارالانوار میں اس حدیث کو بحار کی جلد ۷۳، صفحہ ۴۹ اور جلد ۱۰۱، صفحہ ۲۷۵ پر خصال سے نقل کیا ہے۔

[2] بحارالانوار، ج ۶۸ ص ۳۴۶، حدیث ۱۰

[3] صحیفہ سجادیہ دعا ۳۰ (دعائہ فی المعونۃ علی قضاء الدین)

۴۔ بزرگی کا معیار فضیلت ہے نہ سن وسال

عتاب بن اسید جو ایک ذہین اور بہادر جوان تھا، رسول اکرمؐ نے اسے مکہ کی حکمرانی کے لئے منتخب فرمایا، آپؐ نے اسے جو فرمان دیا اس میں چند ایسے جملے تحریر فرمائے جو نفاذ حکومت سے متعلق مسائل میں اسلام کی بلند پایہ ثقافت کر بیان کرتے ہیں۔ اس فرمان کا کچھ حصہ ذکر کیا جاتا ہے:

"فَهُوَ لَنا خادِمٌ وَ فِي اللهِ اَخ وَلاَوْلِيائِنا مُوالٍ، وَلِاَعْدائنا مُعادٍ، وَهُوَلَكُمْ سَماء ظَلِيلَة، وَاَرْض زَكِيعَة، وَشمس مُضِيئَة وَ لايَحْتَجَّ مُحْتَجّ مِنْكُمْ فى مُخالَفَتِهِ بِصِغَرِ سِنّه، فَلَيْس الاَكْبَرُ هوَ الاَفْضَلَ، بَلْ الاَفْضَلُ هُوَ الاَكْبَرُ!"

ترجمہ: "وہ ہمارا خدمتگار اور راہ خدا میں ہمارا عزیز بھائی ہے جو ہمارے دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن اور مخالف ہے وہ تمہارے لئے ایک سایہ فگن آسمان اور پرثمر زمین اور چمکتا ہوا سورج ہے، ...... تم لوگوں میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کی کمسنی کے باعث اس سے مخالفت کرو کیونکہ سن رسیدہ افراد ہمیشہ ہی افضل نہیں ہوتے بلکہ وہی شخص باعظمت شمار ہوتا ہے جو افضل ہو!"۔[1]

۵۔ عوام سے شفقت ورأفت کا سلوک

حضرت امیرالمؤمنینؑ کا جناب مالک اشتر کو دیا گیا مشہور ومعروف فرمان جو درحقیقت حکومت کرنے کا بہترین اور اعلیٰ ترین منشور ہے اور گذشت زمان کی کہنگی سے محفوظ اور ہرگز قابل فراموش نہیں اس فرمان میں حضرت امیرؑ مصر کے عام لوگوں کے ساتھ جناب مالک اشتر کو نرمی اور شفقت سے پیش آنے کی یاددہانی کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَ اَشْعِرْ قَلْبِكَ الرَّحْمَةَ لِلرَّعِيَّةِ وَ الْمَحَبَّةَ لَهُمْ وَ الُّطفِ بِهِم، وَ لاتَكُونَنَّ عَلَيْهِمْ سَبُعاً ضارِياً تَغْتَنِمُ اَكْلَهُمْ فَاِنَّهُمْ صِنْفان: اِمّا اَخٌ لَكَ فِي الدِّيْن اَوْ نَظيرٌ لَكَ فى الْخَلْقِ"

"اپنے دل کو اپنی رعایا اور ملت کی نسبت رحم ولطف اور محبت سے بھر لینا اور ان کی نسبت حیوان درندہ ہرگز نہ بننا جو انھیں چٹ کر جانے کو غنیمت خیال کرتا ہو، اس لئے کہ تمہاری رعایا دو گروہوں پر مشتمل ہے یا تمہارے دینی بھائی ہیں یا تمہاری طرح کے انسان!"[2]

---

[1] بحارالانوار، ج۲۱، ص ۱۲۳

[2] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

درحقیقت ان چند مختصر جملوں میں اس ثقافت کی ترجمانی کی گئی ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ برقرار کئے جانے والے روابط پر حاکم ہے۔

٦۔عوام الناس پر بھروسہ اور اعتماد

جناب امیرؑ اس فرمان کے ایک اور حصے میں انھیں (مالک اشتر کو) حکم دیتے ہیں کہ وہ ہر حال اور ہر مسئلے میں معاشرے کے محنت کش عوام پر بھروسہ کریں اور خودغرض اور چند مالدار افراد جن کی حکومت سے توقعات وابستہ ہوتی ہیں، پر ہرگز اعتماد نہ کریں اور ہمیشہ پہلے گروہ (غریب ونادار افراد) کی رضائے خاطر کا احساس کریں نہ کہ امراء اور اہل ثروت افراد کی مرضی کا۔ آپؑ فرماتے ہیں:

" وَلْيَكُنْ اَحَبَّ الاُمُورِ اِلَيْكَ اَوْسَطُها فِي الْحَقِّ وَ اَعَمُّها فِي الْعَدْلِ وَ اَجْمَعُها لِرِضَى الرَّعِيَّةِ، فَاِنَّ سُخْطَ الْعامَّةِ يُجْحِفُ بِرِضَى الْخاصَّةِ، وَ اِنَّ سُخْطَ الْخاصَّةِ يُغْتَفَرُ مَعَ رِضَى الْعامَّةِ، وَلَيْسَ اَحَدٌ مِنَ الرَّعِيَّةِ اَثْقَلُ عَلَى الْوالِي مَؤُونَةً فِي الرَّخاءِ وَ اَقَلُّ مَعُونَةً لَهُ فِي الْبَلاءِ وَ اَكْرَهُ لِلْاِنْصافِ وَ اَسْأَلُ بِالْاِلْحافِ وَ اَقَلُّ شُكْراً عِنْدَ الْاِعْطاءِ وَ اَبْطَأُ عُذْراً عِنْدَ الْمَنْعِ، وَ اَضْعَفُ صَبْراً عِنْدَ مُلِمّاتِ الدَّهْرِ

مِنْ اَهْلِ الْخاصَّةِ، وَ اِنَّما عِمادُ الدِّينِ وَ جِماعُ الْمُسْلِمِينَ وَ الْعُدَّةُ لِلْاَعْداءِ، اَلْعامَّةُ مِنَ الاُمَّةِ، فَلْيَكُنْ صِغْوُكَ لَهُمْ وَ مَيْلُكَ مَعَهُمْ ":

''تمہارے نزدیک محبوب ترین کام وہ ہونے چاہئیں جو حق وعدالت اور عوام کی فلاح اور رضائے خاطر کے مطابق ہوں، چونکہ عوام کا غضب خواص (دولتمندوں) کی اقلیت کی رضائے خاطر اور خوشنودی کو بے اثر بنا دیتا ہے، لیکن خواص کی ناراضگی کی عوام کی رضایت اور خوشنودی کے ذریعے تلافی ممکن ہے (یہ بھی جان لو کہ) رعایا میں سے خواص سے زیادہ، خوشحالی اور صلح کے زمانے میں کوئی ایسا نہیں جو حاکم پر بوجھ بننے والا، مصیبت کے وقت امداد سے کنی کترانے والا، انصاف کو ناپسند کرنے والا، طلب کے وقت پیچھے پڑ جانے والا، بخشش اور عطا پر کم شکر کرنے والا، محروم ہو جانے کی صورت میں مشکل سے عذر سننے والا اور مصائب زمانہ پر بےصبری کا مظاہرہ کرنے والا ہو!

درنتیجہ خواص کے اخراجات اور توقعات عوام کی نسبت کہیں زیادہ جبکہ ان کی خدمات اور امداد بہت کم ہوتی ہیں چونکہ دین اور اجتماع مسلمین کا مضبوط سہارا اور دشمن کے مقابلے میں سامان دفاع یہی عوام ہوتے ہیں۔ لہٰذا تمہاری توجہ کا مرکز انھیں کی ضروریات اور خواہشات کو ہونا چاہیے اسی طرح ضروری ہے کہ تمہارا میلان

بھی ان ہی لوگوں کی طرف ہو۔'' [1]

اسی طرح اس فرمان کے ایک اور حصے میں حکم دیتے ہیں کہ ہمیشہ عیب جو اور حاسد لوگوں کو جن کا کام ہی لوگوں کے عیوب تلاش کرنا ہوتا ہے، اپنے آپ سے دور رکھو! اس ضمن میں آپؑ یوں فرماتے ہیں:

" وَلْيَكُنْ اَبْعَدُ رَعِيَّتِكَ مِنْكَ وَ اَشْنأُهُمْ عِنْدَكَ، اَطْلَبُهُمْ لِمَعايِبِ النّاسِ، فَإِنَّ فِي النّاسِ عُيُوباً اَلْوالِي اَحَقُّ مَنْ سَتَرها، فَلا تَكْشِفَنَّ عَمّا غابَ عَنْكَ مِنْها، فَإِنَّما عَلَيْكَ تَطْهِيرَ ما ظَهَرَ لَكَ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ عَلى ما غابَ عَنْكَ! "

''ان لوگوں کو جو لوگوں کے عیوب کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں انھیں تم سے دور رہنا چاہیے اس لئے کہ لوگوں میں موجود عیوب کی پردہ پوشی کا سب سے زیادہ حقدار ان کا حاکم ہی ہوتا ہے، لوگوں کے مخفی عیوب سے آگاہ ہونے کی ہرگز کوشش نہ کرنا، تمہاری ذمہ داری فقط یہی ہے کہ تم ان کے ظاہر کی اصلاح کرو اور جو کچھ تم سے مخفی ہے خدا تعالیٰ اس کے بارے میں حکم (اور اس کی باز پرس) کرے گا۔ [2]

۷۔ اہل تجربہ و دانش کے ساتھ دائمی مشاورت

دانشوروں اور ہر شعبے کے تجربہ کار افراد کے ساتھ تعاون کرنا اور ان سے مشورہ لینا، ہر حکومتی نظام پر حاکم اسلامی ثقافت کا ایک اور اہم نکتہ ہے۔ جناب مالک اشتر کو دیئے گئے اسی فرمان میں یہ جملات بھی بیان کئے گئے ہیں:

" وَ اَكْثِرْ مُدارَسَةَ الْعُلَماءِ وَ مُناقَشَةَ الْحُكَماءِ فِي تَثْبِيتِ ما صَلَحَ عَلَيْهِ اَمْرُ بِلادِكَ وَ اِقامَةِ ما اسْتَقامَ بِهِ النّاسُ قَبْلَكَ "

ترجمہ: اہل علم و دانش کے ساتھ زیادہ سے زیادہ گفت و شنید کرو اور اہل عقل و حکمت کے ساتھ اپنے شہروں اور ملک کے اصلاحی معاملات کو مستحکم کرنے اور ان چیزوں کے قائم کرنے میں کہ جن کے باعث سابقہ لوگوں کے احوال مضبوط رہے تھے، بات چیت کرتے رہو۔ [3]

اس بیان سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی حاکموں اور فرمانرواؤں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ مشیروں یا مختلف سیاسی اور معاشرتی مسائل کے لئے مشیروں کے مختلف گروہوں کے ساتھ باہمی رابطہ استوار رکھیں اور ان کے ساتھ مشورے کے بغیر اہم

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

[2] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

[3] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

امور کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ کریں۔

۸۔عدالتی نظام (عدلیہ) پر حکم فرما ثقافت

عہد نامہ مالک اشتر میں قضات (قاضی صاحبان اور جج حضرات) کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان سے نہایت اہم نکات ملتے ہیں یقیناً کسی (غیر اسلامی) مکتب میں اس حد تک باریک بینی سے کام نہیں لایا گیا۔ یہ بیان عدالتی نظام پر حاکم تمدن کو واضح اور روشن کرتا ہے۔ حضرت جناب امیر المؤمنینؑ اس ضمن میں یوں فرماتے ہیں:

"ثُمَّ اخْتَرْ لِلْحُكْمِ بَيْنَ النّاسِ اَفْضَلَ رَعِيَّتِكَ فِى نَفْسِكَ مِمَّنْ لا تَضِيقُ بِهِ الأُمُورُ، وَ لا تُمَحِّكُهُ الْخُصُومُ وَلا يَتَمادى فِى الزَّلَّةِ، وَلا يَحْصَرُ مِنَ الْفَىْ ءِ اِلَى الْحَقِّ اِذا عَرَفَهُ، وَلا تُشْرِفُ نَفْسَهُ عَلى طَمَعٍ وَلا يَكْتَفِى بِاَدْنىٰ فَهْمٍ دُونَ اَقْصاهُ، وَ اَوْقَفَهُمْ فِى الشُّبَهاتِ وَ آخَذَهُمْ بِالْحُجَجِ، وَ اَقَلَّهُمْ تَبَرُّماً بِمُراجَعَةِ الْخَصْمِ، وَ اَصْبَرَهُمْ عَلى تَكَشُّفِ الأُمُورِ وَ اَصْرَمَهُمْ عِنْدَ اِتِّضاحِ الْحُكْمِ، مِمَّنْ لايَزْدَهِيهِ اِطْراء، وَلا يَسْتَمِيلُهُ اِغْراء وَ اُولٰئِكَ قَلِيلٌ!"

بعد ازاں لوگوں میں سے افضل اور بہترین شخص کو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے انتخاب کرو (غور فرمائیں کہ یہاں قاضی، جج کے لئے بارہ صفات بیان کی گئی ہیں اور ان صفات کا حامل شخص ہی مثالی قاضی ہے۔ قضاوت کے منصب پر ایسے شخص کو فائز ہونا چاہیے کہ لوگوں کا پے در پے اس کے پاس آنا اس کے رنج وملال اور دل تنگی کا باعث نہ ہو اور منافق افراد سے ملنا اس کے غضب اور بد اخلاقی کا سبب نہ بنے وہ ایسا شخص ہو جو اپنی غلطیاں تسلیم کرنے کی بجائے ان کے درست ہونے پر ڈٹ جانے والا نہ ہو اور جب کسی معاملے میں حق اس پر ظاہر اور آشکارا ہو جائے تو اس کے مطابق فیصلہ صادر کرنا اس کے لئے آسان ہو۔ اس کا دل حرص وطمع (لالچ) سے پاک ہونا چاہیے، اسے معاملہ فہمی میں تھوڑی سی تحقیق کو کافی نہیں قرار دینا چاہیے (بلکہ پوری تحقیق اس کے لئے ضروری ہے)۔ قاضی کو ان افراد میں سے ہونا چاہیے جو شبہات پیش آنے کی صورت میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے بڑھ کر دلیل اور حجت کے تابع ہوتے ہیں۔ شکایت کرنے والوں کے بار بار آنے سے وہ کبیدہ خاطر اور ملول نہیں ہوتا اور حقائق وواقعیات کی تہہ تک پہنچنے میں ہر ایک سے زیادہ صابر ہوتا ہے، لیکن کشف حقیقت ہونے کی صورت میں فیصلہ صادر کرنے اور ٹال مٹول نہیں کرتا، شکایت کرنے والوں کی باہمی خصومت اور ناچاقی کو برطرف کرنے میں ہر ایک سے بڑھ کر قاطع اور اٹل (فیصلہ کرنے والا ہوتا ہے) وہ ان افراد میں سے ہوتا ہے جو تعریف کرنے والوں کی تعریف سے متاثر نہیں ہوتے اور نہ ہی لوگوں کا حد سے زیادہ احترام اسے احترام کرنے والوں کی طرف مائل کرسکتا ہے، لیکن جان لو کہ ان تمام صفات کے حامل افراد بہت ہی کم ہیں۔ (نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳)

عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ

لوگوں کے ساتھ براہ راست رابطہ اور رابطہ بھی ایسا جو واقعی اور حقیقی ہو نہ کہ تکلفات پر مبنی اور ظاہری، ایک اور اہم نکتہ ہے جس کی اساس پر یہ فرمان جاری ہوا ہے۔ اسی فرمان میں حضرت امیرالمؤمنینؑ ثقافت وتمدن اسلامی سے آشنا مالک اشتر کو بعنوان حاکم مصر اس طرح حکم دیتے ہیں:

"وَاجْعَلْ لِذَوِی الْحاجاتِ مِنْكَ قِسماً تُفَرِّغُ لَهُمْ فیه شَخْصَكَ وَ تَجْلِسُ لَهُمْ مَجْلِساً عامّاً فَتَتَواضَعُ فیهِ لِلّٰهِ الَّذی خَلَقَكَ و۔ تُقْعِدَ عَنْهُمْ جُنْدَكَ وَ اَعْوانَكَ مِنْ اَحْراسِكَ وَ شُرَطِكَ حَتّی یُكَلِّمَكَ مُتَكَلِّمُهُمْ غَیْرَ مُتَتَعْتِعٍ فَاِنّی سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ صلی الله علیه وآله وسلم یَقُولُ فی غَیْرِ مَوْطِنٍ: "لَنْ تُقَدَّسَ اُمَّة لا یُؤخَذُ لِلضَّعیفِ فیها حَقُّهُ مِنَ الْقَوِیِّ غَیْرَ مُتَتَعْتِعٍ":

''ضرورت مند افراد کے لئے ایک وقت معین کرو تا کہ بذات خود ان کی ضروریات پوری کرسکو، ان کے لئے ایک عمومی اور اجتماعی نشست کا انتظام کر کے ان کے ساتھ بیٹھو اور وہ خدا جو تمہارا خالق ہے اس کی رضا کی خاطر ان کے ساتھ تواضع وانکساری کے ساتھ پیش آؤ، (اُن کے اوپر گھر کے دروازے کھول دو) اور افراد حکومت، محافظین اور سپاہیوں کو اپنے اطراف سے دور کرو تا کہ ہر کوئی خوف ولکنت کے بغیر تمہیں اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کر سکے۔ کیونکہ میں نے کئی بار رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپؐ فرماتے تھے: ہر وہ ملت جو کمزوروں کے حقوق کو طاقتور افراد سے علی الاعلان نہیں لے پاتی ایسی ملت ہرگز پاک و پاکیزہ نہیں ہوسکتی۔'' [1]

یہ بات تجربے سے بھی ثابت ہے کہ اگر حکمرانوں اور ان کی رعایا کے درمیان براہ راست تعلق اور ربط نہ ہو تو یہ بات حکمرانوں کی ماحول سے ناآگاہی کا سبب بنتی ہے اور عوام بھی اپنے حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں لوگوں کے ساتھ براہ راست رابطہ حکمرانوں اور عوام کے درمیان محبت اور الفت کو روز افزوں ترقی دیتا ہے اور ان کے درمیان محبت کے رشتے کو مضبوط ومحکم بنا تا ہے۔

[1] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

۱۰۔محروم لوگوں کے حال پر بھرپور توجہ

ایک اور اہم نکتہ (جس پر حکومت اسلامی کے پر حاکم ثقافت وتمدن کی بحث کو یہاں ہم ختم کریں گے اگر چہ جن مطالب کوذکر نہیں کیا گیا ان کی تعداد بہت زیادہ ہے) وہ غیر معمولی اہمیت ہے جو ثقافت اسلامی میں معاشرے کے محروم طبقوں کو دی گئی ہے۔ مالک اشتر کو دیئے گئے اس فرمان میں، جب حضرت امیرالمؤمنینؑ اس مقام پر پہنچتے ہیں تو آپؑ کا لہجہ یکدم مکمل طور پر تبدیل ہو جاتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

"ثُمَّ اللهَ اللهَ فِي الطَّبَقَةِ السُّفْلى مِنَ الَّذينَ لا حِيلَةَ لَهُمْ مِنَ الْمَساكينِ وَالْمُحتاجينَ وَ اَهْلِ الْبُؤْسى وَالزَّمْنى فَاِنَّ فى هٰذِهِ الطَّبَقَةِ قانِعاً وَمُعْتَراً وَاحْفَظْ لِلّٰهِ مَا اسْتَحْفَظَكَ مِنَ حَقِّهِ فيهِمْ، وَاجْعَلْ لَهُمْ قِسْماً مِنْ بَيْتِ مالِكَ، وَ قِسْماً مِنْ غَلّاتِ صَوافى الأسلامِ فى كُلِّ بَلَدٍ، فَاِنَّ لَلأَقْصى مِنْهُمْ مِثْلَ الَّذى لِلأدنى، وَكُلّ قَدْاسْتُرعِيتَ حَقَّهُ فَلا يَشْغَلَنَّكَ عَنْهُمْ بَطَر، فَاِنَّكَ لاتُعْذَرُ بِتَضْييعِكَ التّافِهَ، لِاِحْكامِكَ الْكَثيرَ الْمُهِمَّ فَلا تُشْخِصْ هَمأَكَ عَنْهُمْ وَلا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لَهُمْ":

''پھر اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ سے ڈرتے رہو، عوام کے پسماندہ طبقے کے بارے میں جن کا کوئی سہارا اور آسرا نہیں، یہ طبقہ ان لوگوں کا ہے جو فقراء، مساکین، محتاج اور معذور ہیں ان میں سے کچھ تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے والے ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی سوال کے بغیر تم نے مدد کرنی ہے، خدا تعالیٰ نے ان کے بارے میں جو حکم دیا ہے تمہیں چاہیے کہ اس پر عمل کرو، ان کے لئے بیت المال سے ایک حصہ مقرر کرو اور انھیں ایک حصہ ہر شہر کے اس غلے میں سے دو جو اسلامی غنیمت کی زمینوں سے حاصل شدہ ہو۔ دور والوں کا بھی وہی حصہ ہے جو نزدیک والوں کا ان سب کے حقوق کی رعایت کرنا لازم ہے، تم ان سب کے حقوق کی حفاظت کے ذمہ دار بنائے گئے ہو۔ لہٰذا حکومت اور دولت کا نشہ کہیں تمہیں ان سے غافل نہ کر دے اور جان لو کہ وہ بہت سارے اہم کام جنھیں تم انجام دیتے ہو ان کی وجہ سے اگر ان لوگوں کے چھوٹے چھوٹے امور کو نپٹا نہ سکو اور ان پر توجہ نہ دے سکو تو قطعاً تمہارا عذر قابل قبول نہیں، اپنے دل کو ان لوگوں سے ہرگز نہ ہٹاؤ اور انھیں دیکھ کر تمہاری تیوری نہ چڑھ جائے۔''[1]

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

اس گروہ کے بارے میں حضرت امیر المؤمنینؑ کی بے حد و بے نظیر تاکید اسلام کی اجتماعی عدالت اور انسانی حقوق کی حفاظت اور پاسداری کی بہترین علامت ہے، خاص طور پر محروم طبقے کو مرکز توجہ بنانا اسلام ہی کا خاصہ ہے اور اپنے زمانۂ خلافت میں آپؑ کا یہ عمل اس دعویٰ کی بہترین دلیل ہے۔

خلاصہ

مذکورہ بالا بیان سے اسلام کے نظام نفاذ پر حاکم اسلامی ثقافت کے بہت سے گوشوں میں سے صرف ایک گوشہ کو ظاہر کرتا ہے جو اس ثقافت کی کئی جہات میں سے مرکز بحث و تحقیق بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر اس میں غور و فکر کیا جائے تو یہ جہت عوامی اور الٰہی حکومت کے کئی اور گوشوں اور جہات سے پردہ اٹھاتی ہے، اسی طرح اس جہت کے مطالعے سے اس حقیقت کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آج جو حکومت، حکومت اسلامی کے عنوان سے معروف ہے ابھی تک اصلی اور حقیقی اسلامی حکومت سے کافی دور ہے، اگرچہ وہ اسی مقصد اور ہدف (واقعی اسلامی حکومت) کی طرف گامزن ہے۔

انتظامیہ کے سربراہ کے انتخاب کا طریقہ

آج کی دنیا میں انتظامی سربراہ اور دوسرے اعلیٰ سطح کے ذمہ دار افراد کے انتخاب کے کئی ایک طریقے ہیں، کبھی تو انھیں بلاواسطہ اور کبھی بالواسطہ انتخاب کیا جاتا ہے اور کبھی اعلیٰ درجے کے مسؤل انھیں اس ذمہ داری کے لئے منصوب کرتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کی مبارک زندگی میں اس منصب کے لئے تقرری خدا تعالیٰ کی طرف سے تشکیل پاتی نظر آتی ہے اور کبھی اسے خود رسول اکرمؐ انجام دیتے تھے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے رسول اکرمؐ کا اس منصب کے لئے منصوب ومقرر ہونا درج ذیل آیات سے بخوبی واضح ہے۔ مثلاً:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ

یعنی: ''رسول اکرمؐ مومنین کی نسبت ان سے زیادہ ان (کے نفوس) پر حق رکھتے ہیں۔''[۱]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ

یعنی: ''اے ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت اور رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔''[۲]

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝۶۵

یعنی: ''تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک ایمان والے نہیں ہوں گے جب تک تمہیں اپنے اختلافات ونزاعات میں اپنا حَکَم (فیصلہ کرنے والا) قرار نہیں دیتے اور پھر تمہاری داوری اور حکمیت (فیصلے) سے دلی رنجش بھی محسوس نہیں کرتے (یعنی خوشی خوشی تمہارے فیصلے کو قبول کر لیتے ہیں) اور مکمل طور پر سر تسلیم خم کر لیتے ہیں۔''[۳]

''فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ''

یعنی: ''وہ لوگ جو اس (رسول اکرمؐ) کے فرمان کی مخالفت کرتے ہیں، انھیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ وہ

---

[۱] احزاب۔۶

[۲] نساء۔۵۹

[۳] نساء۔۶۵

کسی فتنے یا دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں۔“[1]

واضح ہے کہ اطاعت مطلق، جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں بیان ہوا ہے اور آنحضرتؐ کی اسلامی معاشرے پر حاکم کی حیثیت سے تقرری آپس میں لازم وملزوم ہیں (یعنی اطاعت مطلق حاکمیت کے بغیر ممکن نہیں) قرآن مجید کی بعض دوسری آیات بھی اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں۔ پیشوایان معصوم اور ائمہ ھدیٰ علیھم السلام کے بارے میں بھی شیعی عقیدہ یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعۂ رسول اکرمؐ منتخب اور منصوب کئے گئے ہیں۔

سورۂ مائدہ کی آیت

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ..." (مائدہ/٦٧)

جو واقعۂ غدیر کے بارے میں نازل ہوئی اور ہم نے تفسیر نمونہ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور متعدد روایات جو تمام اسلامی مذاہب کے طرق سے منقول ہیں اور جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کو بحیثیت خلیفہ وجانشین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معین ومنصوب کرنے کے بارے میں نازل ہوئی (اس کی شرح وتوضیح پیام قرآن کی جلد نہم میں ذکر کی گئی ہے)۔

اسی طرح رسول اکرمؐ سے ان کے بارہ خلفاء کے بارے میں منقول روایات اور وہ روایات جو ائمہ معصومین - سے وارد ہوئی ہیں (یعنی وہ روایات جن میں ہر امام نے اپنے بعد والے امام کا تعارف کرایا ہے)، اور اس کی وضاحت بھی پیام قرآن جلد نہم میں ہو چکی ہے سب اس دعویٰ کی واضح دلیل ہیں اور انھیں یہاں دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

یہ سب کچھ رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومین - سے متعلق ہے لیکن وہ لوگ جن کا تعلق اس زمانے کے بعد سے ہے ان کا تقرر ممکن ہے کہ ولی فقیہ یا مجتہد جامع الشرائط کی صوابدید پر ہو چونکہ ولایت فقیہ کی بحث کے مطابق، کہ بعد ازاں اس کی طرف اشارہ کیا جائے گا، ائمہ معصومینؑ کے جانشین صالح اور ضروری شرائط کے حامل فقہاء ہیں، البتہ حاکم شرع اور فقیہ جامع الشرائط اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ وہ ملت اسلامیہ سے متعلق تمام سیاسی اور اجتماعی مسائل میں (اُمت اسلام کی) مصلحت کو پیش نظر رکھیں اور ملت اسلامیہ کی مصلحت بلاشک وتردید اس چیز میں ہے کہ نظام حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کو عوام کی شرکت ومشورت اور ان کی رائے کے ذریعے منتخب ہونا چاہیے تاکہ وہ ایک دوسرے کا نہایت دوستانہ انداز میں ہاتھ بٹا سکیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب عوام انھیں بالواسطہ یا بلاواسطہ منتخب کرنے میں شریک ہوں، بالخصوص جیسا کہ ہمارے زمانے میں عوام کی حکومتوں میں شرکت تمام یا اکثر معاشروں کی تقریباً مشترکہ ثقافت ہے۔

بنابریں سب سے پہلے اس اہم منصب کی صلاحیت رکھنے والے افراد کا تعارف عوام سے کراتے ہیں دیندار وصالح اہل نظر افراد ان کی تصدیق کرتے ہیں جن میں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی لازمی شرائط پائی جاتی ہیں اور پھر اس کے بعد ایک صحیح وسالم انتخابی لائحہ عمل کے مطابق لوگ ایک بہتر امیدوار کے چناؤ کے لئے ووٹ ڈالتے ہیں اور یقینی طور پر وہی شخص منتخب ہوتا ہے جسے عوام کی

[1] نور، ٦٣۔ امرہمیں ضمیر بعض مفسرین کی رائے میں رسول اکرمؐ کی طرف لوٹتی ہے جبکہ بعض دوسرے مفسرین کی رائے میں ضمیر کا مرجع خدا تعالیٰ ہے لیکن پہلا معنی آیت کے مضمون کے زیادہ مناسب ہے تفسیر المیزان میں بھی یہی پہلا معنی مراد لیا گیا ہے۔ المیز ان ج ١٥ ص ١٦٧

حمایت حاصل ہوتی ہے اور چونکہ اسے عوامی مدد اور حمایت حاصل ہوتی ہے۔

لہٰذا یہی شخص اس منصب پر فائز ہونے کی بہتر صلاحیت رکھتا ہے۔اس کے بعد اس کی حکومت کے نافذ العمل کی توثیق فقیہ جامع الشرائط کرتا ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ مراتب امام معصومؑ، رسول اکرمؐ اور منصوبین الٰہی تک بلکہ درواقع خدا تعالیٰ کے اذن ورضا تک جا پہنچتا ہے چونکہ فقیہ جامع الشرائط دراصل امام معصومؑ کا نائب ہوتا ہے)۔

بلاشک وتردید ایسا شخص جسے عوام کی محکم حمایت حاصل ہوتی ہے اور جس کے حق میں اکثر لوگوں کی آراء (ووٹ) ہوتی ہے یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا انتخاب لوگوں کی مصلحت کے مطابق ہے، لہٰذا ولی فقیہ جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے کی مصلحتوں کی رعایت کرے، ایسے شخص کی حکومت کے نافذ العمل ہونے کی مخالفت نہیں کرتا۔

نتیجہ یہ کہ اسلامی حکومت جس کا آغاز اللہ تعالیٰ سے لوگوں کی طرف ہوتا ہے اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ مکمل طور پر ایک وقتی عوامی حکومت کے معیار کے مطابق ہو، ایک عام عوامی (جمہوری) حکومت اور اسلامی جمہوری حکومت کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ حکومت اسلامی کو چلانے والے امیدواروں کو اسلام وایمان اور تقویٰ وامانت کے زیور سے مزین ہونا چاہیے جبکہ اس کے برعکس غیر اسلامی نظام حکومت کو چلانے والوں میں اس قسم کی شرائط نہیں ہوتیں اور یہی وہ اہم فرق ہے جو اسلامی اور الٰہی حکومتوں کو غیر اسلامی اور مادی حکومتوں سے جدا کرتا ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ دونوں قسموں کی حکومتیں بظاہر جمہوری اور عوامی حکومتیں ہوں۔

مذکورہ بیان نظام حکومت چلانے والے اصلی اور اعلیٰ ترین مسؤل اور ذمہ دار شخص کے بارے میں تھا، حالانکہ اس درجے کے بعد کے مسؤلین کے حق میں بھی یہ بات ممکن ہے کہ ان کا انتخاب بھی عوام کی بالواسطہ یا بلاواسطہ شرکت سے انجام پائے، مثلاً یہ کہ وزراء بھی لوگوں کے ووٹ کے ذریعے منتخب کئے جائیں، یا یہ کہ وزراء کا مجلس شورائے اسلامی (اسمبلی) میں موجود عوامی نمائندوں کے ذریعے انتخاب عمل میں لایا جائے۔

دونوں صورتوں میں ان کے انتخاب میں عوام شریک ہیں، پھر اس مرحلے میں بھی ایمان، تقویٰ اور دیانتداری کی شرائط کو مدنظر رکھنا لازمی ہے، انھیں اس لئے منتخب کیا جاتا ہے کہ وہ اسلامی ثقافت انسانی فضائل معاشرتی عدالت اور احکام اسلامی کو نافذ کرنے کی ذمہ داری کو پورا کریں۔ چونکہ جو ہستی بخش ذات سے وجود حاصل نہیں کرتا وہ دوسروں کو کیسے خلعتِ وجود سے آراستہ کر سکتا ہے۔

رکن سوم: اسلامی حکومت کا عدالتی نظام

انسانی معاشرے میں اختلافات اور تنازعات کے حل وفصل کے لئے زمانۂ قدیم سے قضاوت رائج رہی ہے، یہاں تک کہ صحرا نشین بدو بھی اپنے اختلافات کو حل کرانے کے لئے قبیلے کے سردار، یا اس کے رشتہ داروں یا فیصلے کے لئے منصوب شخص کی طرف رجوع کرتے تھے، درحقیقت ہم مسئلہ قضاوت کی تاریخ کو ضبط کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم فقط اتنا کہہ سکتے ہیں کہ انسانی معاشرہ اور مسئلہ قضاوت دونوں کی عمر ایک ہے۔

اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ انسان طبعاً طور پر اجتماعی زندگی کا حامل ہے اور بلاشبہ یہ زندگی اپنی تمام خصوصیات کے ہمراہ باہمی ٹکراؤ اور تزاحم کا میدان بھی ہے بالفاظ دیگر یہ اجتماعی اور سماجی زندگی اگرچہ انسانی معاشرے کے لئے منافع اور برکات کا سرچشمہ اور تمام مادی ومعنوی جہات میں ترقی اور پیشرفت کا باعث ہے لیکن بہرحال یہ زندگی مشکلات اور منفی نقاط کی بھی حامل ہے اور وہ (نقاط منفی) ایسے اختلافات اور تنازعات ہیں جو ہمیشہ لوگوں کے حقوق کے اثبات اور ظلم وتجاوز کو ختم کرنے کے متقاضی ہوتے ہیں اگر اس قسم کے اختلافات کا درست فیصلہ نہ ہو پائے تو یہ انسانی معاشرہ کو تباہی وبربادی اور مار دھاڑ کے میدان اور سرچشمہ فساد میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنا بھی لازم ہے کہ یہ اختلافات ونزاع جو کبھی دو یا چند افراد کے درمیان اور کبھی دو قبیلوں یا دو ملکوں کے درمیان ظہور پذیر ہوتا ہے، (اس کشمکش کے لئے) لازم نہیں کہ ہمیشہ اس کا سرچشمہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا، خود غرضی اور خواہش نفس ہی ہو، بلکہ اگر ہم فرض کریں کہ کوئی ایسا معاشرہ ظہور پذیر ہو جائے جو ''مدینۂ فاضلہ'' کا مکمل نمونہ ہو اور تمام افراد معاشرہ ایمان، تقویٰ، اخلاق اور تمدن انسانی کے اعتبار سے بلند ترین سطح پر ہوں۔ اس کے باوجود تشخیص وفہم، میں فرق غلط فہمی اور وضع شدہ قوانین اور اجتماعی ومعاشرتی حقوق کی جزئیات سے عدم آگاہی ممکن ہے کہ افراد کے واقعی حقوق کی تشخیص کے لئے اختلاف اور کشمکش کا سبب بن جائے۔

اس بناء پر عدالتی نظام انسانی معاشروں کی نہایت اہم ضرورت ہے، اگرچہ وہ معاشرے تمدنی اور فکری اعتبار سے ادنیٰ یا اعلیٰ سطح پر ہی کیوں نہ ہوں، عدالتی نظام کے بغیر ان کے لئے زندگی گذارنا ممکن نہیں۔ واضح بات ہے کہ انسانی معاشروں کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ عدالتی نظام بھی وسعت اور پیچیدگی اختیار کرتا چلا جاتا ہے، چونکہ کہ بیشتر اور نزدیک تر روابط کی وجہ سے ان معاشروں میں نہ صرف تصادم وتزاحم کی مقدار (کمیت) اور تعداد میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی تزاحم اور تصادم بے حد پیچیدہ اور مشکل ہو جاتے ہیں اور اگر عدالتی نظام ان معاشروں کے ساتھ قدم ملا کر آگے نہ بڑھے تو اس صورت میں معاشرتی نظام خطرناک کشمکش کے باعث دن بدن تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جائے گا۔

مختصر یہ کہ اجتماعی وعدالت کو عام کرنے ظلم وفساد کو روکنے اور اختلافات وتنازعات کو ختم کرنے، قوانین کے صحیح نفاذ اور اسی طرح انتظامیہ پر کڑی نظر رکھنے اور مختلف درجوں کے ذمہ دار افراد کو اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لئے ایک ایسے طاقتور اور مؤثر عدالتی نظام کا وجود ناگزیر ہے جو پوری قوت کے ساتھ قوانین کو نافذ کرے۔ اسی دلیل کی بناء پر آیت شریفہ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ [1]

کے مضمون کی رو سے دین ہی انسانوں کی حقیقی زندگی ہے، اسلام نے اس مسئلے کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اس مسئلے کی اصل وفرع کے لئے بکثرت قوانین وضع کئے ہیں۔

اس اشارہ کے ساتھ ہی ہم دوبارہ قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں؛ قرآن کی متعدد آیات میں اس موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے بعض کو یہاں پر بیان کیا جاتا ہے:

1- ایک مقام پر اللہ تعالیٰ رسول اکرمؐ سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿١٠٥﴾

''بے شک ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے تا کہ خدا نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور ایسے لوگوں میں سے نہ ہونا جو خیانت کاروں کی حمایت کرتے ہیں۔'' [2]

2- ایک اور جگہ غیر مسلموں کے درمیان قضاوت اور فیصلے کے بارے میں بھی خدا تعالیٰ رسول اکرمؐ کو یہی حکم دیتا اور یوں فرماتا ہے:

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿٤٢﴾

''اور اگر ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو وہ عدالت پر مبنی ہونا چاہیے بے شک خدا صاحبان عدالت وانصاف کو پسند کرتا ہے۔'' [3]

3- ایک اور مقام پر تمام اہل ایمان کو مخاطب کر کے انھیں بھی یہی حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿٥٨﴾ [4]

''خداوند متعال تم لوگوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے صاحبان کو پہنچا دو اور جب کبھی لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدالت کے ساتھ، خدا تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے بے شک خدا تعالیٰ سننے اور

---

[1] سورہ انفال، ۲۴

[2] سورہ نساء۔ ۱۰۵

[3] سورہ مائدہ۔ ۴۲

[4] سورہ نساء۔ ۸۵

دیکھنے والا ہے۔''

4-دوسری طرف سے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو رسول اکرمؐ کے عادلانہ فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا حکم دیتا ہے اور انھیں یہ تاکید کرتا ہے کہ وہ اس فیصلے سے نہ فقط ظاہری طور پر بلکہ اپنے باطن میں بھی کسی رنج وملال کو راہ نہ دیں اور حق وعدالت اگر چہ تلخ اور ان کے خلاف ہو، کو دل وجان سے قبول کریں، خدا تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴿٦٥﴾

''نہیں، تمہارے رب کی قسم یہ لوگ اہل ایمان نہیں ہو سکتے مگر یہ کہ تمہیں اپنے اختلافات میں فیصلہ کرنے والا بنائیں اور بعد ازاں تمہارے فیصلے سے اپنے دل میں رنج وملال کا احساس نہ کریں اور مکمل طور پر سر تسلیم خم کر لیں۔''[1]

5-اس ضمن میں اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿٥١﴾

''ان اہل ایمان کا قول، جنھیں خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دی جاتی ہے تاکہ رسولؐ ان کے درمیان فیصلہ کریں، فقط یہی ہوتا ہے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں اور فی الواقع کامیاب ہیں۔''[2]

6-قرآن مجید نے حق پر مبنی گواہی اور شہادت دینے پر کہ یہ سچی گواہی حق وعدالت کے نہایت ضروری مقدمات میں سے ہے، بہت تاکید کی ہے اور تمام اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴿٨﴾

''اے صاحبان ایمان! ہمیشہ خدا تعالیٰ کی خاطر قیام کرنے والے بنو اور حق وعدالت کے مطابق گواہی دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی جماعت کے ساتھ تمہاری دشمنی تمہیں گناہ اور عدالت کو ترک کرنے کی طرف کھینچ لے،

---

[1] سورہ نساء۔۶۵

[2] سورہ نور،۵۱

عدالت کو بروئے کار لاؤ کیونکہ یہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے اور خدا کی نافرمانی سے اجتناب اور پرہیز کرو کیونکہ خدا تعالیٰ تمہارے ہر اس کام سے آگاہ ہے جسے تم انجام دیتے ہو۔"[1]

اس بناء پر معاشرہ اسلامی میں کوئی چیز حق وعدالت کو پامال نہیں کرسکتی، تمام شہادتوں اور گواہیوں کو عادلانہ ہونا چاہیے، چاہے ان کا تعلق دوست سے ہو یا دشمن سے، اسی طرح قضاوت اور فیصلے بھی عدالت وانصاف کے مطابق انجام پانے چائیں اور رشتہ داروں اور غیروں میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے (یعنی عدالت میں اپنوں کو غیروں پر کسی قسم کی ترجیح نہیں دینی چاہیے)۔

---

[1] سورہ مائدہ۔۸

قضاوت اور فیصلہ کرنے کا حق کس کو حاصل ہے؟

اشارہ

جیسا کہ حکومت اور حاکمیت کی بازگشت ''توحید افعالی'' جس میں مسلمہ اصل (قاعدے) کی طرف ہوتی ہے اسی طرح (قضاوت کا حق) بھی انہی لوگوں کے لئے ثابت ہے، جو اس کی طرف سے اس کے مجاز ہیں۔توحید افعالی کے مطابق: تمام امور (کاموں) کی برگشت خدا کی طرف ہے اور توحید خالقیت یہ کہتی ہے کہ اس جہان میں تمام چیزوں کا سرچشمہ خدا تعالیٰ ہے اور توحید حاکمیت، جو توحید خالقیت کا ایک شعبہ ہے، یہ کہتی نظر آتی ہے کہ حکومت کرنے کا حق فقط خدا کے لئے مخصوص ہے اور یہی چیز اس بات کا باعث بنتی ہے کہ حکومت خدا میں قضاوت اور فیصلہ کرنے کا حق بھی فقط خدا اور ان لوگوں کے لئے ثابت ہے جو اس کی طرف سے اس (قضاوت) کے مجاز ہیں۔

دوسری طرف سے توحید اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ فقط خدا ہی کا فرمان اور وہ لوگ جن کے فرمان کی بازگشت خدا کی طرف ہے، قابل اطاعت ہے، اس بناء پر وہی عدالتی فیصلے قابل قبول ہیں جو خدا کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اگر ہم اس نظر سے انسانی معاشرے کو ملاحظہ کریں تو قضاوت اور فیصلے کا مبداء اور سرچشمہ بہت حد تک واضح ہو جائے گا اور پھر اس سرچشمہ کی تشخیص و تعیین کے لئے ہمیں کسی پریشانی اور سرگردانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور وہ چونکہ ہماری نظر اس نقطے پر ہونی چاہیے جو تمام موجودات کے وجود کا سرچشمہ ہے، ہمارا وجود اور ہماری تخلیق بھی اسی کی طرف سے ہے اور ہر جگہ اسی کی فرمان روائی ہے۔

اسی بناء پر ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہماری عدالتیں اور عدالتی نظام اسی کے فرمان کے تابع ہوں، ہمارے عدالتی نظام کے تمام فرمان اپنی مشروعیت اور جواز کو اسی (خدا تعالیٰ) سے کسب کریں تا کہ وہ خدائی رنگ میں رنگ جائیں۔اس اشارے کے بعد ہم دوبارہ قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تا کہ اس بات کا سراغ لگایا جا سکے کہ قضاوت اور فیصلہ کرنے کا معاملہ فقط خدا تعالیٰ کے لئے خاص اور اسی کی ذات میں منحصر ہے۔

۱۔سورۂ انعام کی آیت ۵۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ۝۵۷

یعنی: ''فیصلہ کرنا اور فرمان صادر کرنا فقط خدا تعالیٰ کا کام ہے وہی ہے جو حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور وہی (حق و باطل کو ایک دوسرے سے) بہترین جدا کرنے والا ہے۔''

یہی جملہ ''إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ'' اپنے بعد کے کلمات کے بغیر سورۂ یوسف آیت ۴۰ میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

البتہ جو کچھ سورۂ یوسف میں ذکر ہوا ہے، ممکن ہے کہ وہ ایک وسیع تر مفہوم کا حامل ہو اور اس کے دائرے میں قضاوت و حکومت

دونوں داخل ہوں لیکن مذکورہ بالا آیت میں جو کچھ ذکر ہوا ہے اس کی اپنے بعد والے کلمات کی وجہ سے خصومت اور نزاع کو ختم کرنے کے باعث دلالت زیادہ تر قضاوت پر ہی ہے۔ طبرسی، مجمع البیان اور فخر رازی تفسیر کبیر میں کئی دوسرے مفسرین کی طرح اسی مفہوم یعنی قضاوت پر دلالت کے حق میں ہیں۔[1]

۲۔ سورۂ مائدہ کی آیات ۴۴، ۴۵ اور ۴۷ میں فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝۴۴ ...فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝۴۵ ...فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۴۷

یعنی: ''وہ لوگ جو کچھ خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق حکم (فیصلہ) نہیں کرتے، کافر ہیں......ظالم ہیں......فاسق ہیں!''

کافر اس لئے ہیں کہ توحید کے راستے (توحید حاکمیت) سے خارج ہو گئے ہیں اور ظالم اس وجہ سے ہیں کہ اپنے آپ اور دوسروں پر ستم ڈھاتے ہیں، چونکہ وہ احکام الٰہی کی مصلحتوں سے محروم رہتے ہیں اور جاہلانہ احکام کے گرداب (بھنور) میں ڈوب جاتے ہیں اور فاسق اس لئے ہیں کہ دائرہ اطاعت خدا سے نکل چکے ہیں اور حد اطاعت سے خارج ہونا ہی فسق ہے۔

البتہ ان آیات کا ایک وسیع مفہوم ہے جس کی بناء پر احکام الٰہی کے فتاویٰ قضاوت اور مسئلہ حاکمیت سب ان کے دائرے میں داخل ہیں اور ضروری ہے کہ یہ تینوں ابعاد اور جہات حکم خدا اور جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، کے ساتھ مطابقت اور موافقت رکھتی ہوں۔ (غور فرمائیں)

۳۔ سورۂ نساء کی آیت ۶۰ میں قرآن مجید ہر غیر الٰہی حکم وقضاوت کو طاغوت (شیطان) کا حکم اور غیر الٰہی حکم وقضاوت کے درپے ہونے کو راہ شیطان پر چلنے کے مترادف قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا۝۶۰

یعنی: ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان آسمانی کتابوں پر ایمان لائے ہیں جو تم پر اور تم سے سابق (انبیاء) پر نازل کی گئی ہیں جبکہ حال یہ ہے کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ قضاوت اور فیصلہ کرانے کے لئے حکام باطل اور طاغوت (شیطان) کی طرف رجوع کریں؟!''

۴۔ قرآن ان تمام احکام وقضاوت کو جو غیر الٰہی مبداء اور سرچشمے سے موجزن ہوں احکام جاہلیت کے ساتھ موسوم کرتا ہے اور ان

---

[1] مجمع البیان، ج ۳، ص ۱۰۳، تفسیر کبیر فخر رازی، ج ۱۳، ص ۷

لوگوں کے مقابلے میں جو غیر الٰہی احکام کے خواہاں ہوتے تھے (مثلاً یہودیوں کا ایک گروہ جو باہمی تنازعے کا تصفیہ کرانے کے لئے رسول اکرمؐ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتا اور آپؐ سے یہ توقع رکھتا تھا کہ آپؐ ان کی خواہش کے مطابق فیصلہ صادر فرمائیں)، قرآن یوں فرماتا ہے:

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۝

یعنی: ''(اے رسولؐ) کیا وہ تم سے زمانۂ جاہلیت کے حکم و قضاوت کو چاہتے ہیں اور باایمان افراد کے لئے خدا تعالیٰ سے بہتر کون حکم کرنے والا ہے''[1]

۵۔ایک اور مقام پر رسول اکرمؐ کو یاددہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ

یعنی ''تو کیا میں غیر خدا کو قضاوت اور حکم کے لئے طلب کروں، جبکہ خدا ہی نے اس آسمانی کتاب کو نازل فرمایا ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے؟!''[2]

۶۔ایک اور مقام پر پوری صراحت کے ساتھ تمام اختلافات کو خدا کے حکم و قضاوت کے ذریعے حل کرنے کا فرمان صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ

یعنی جس چیز کے بارے میں تم لوگ اختلاف کا شکار ہو جاؤ تو اس کا فیصلہ اللہ کے پاس ہے۔[3]

مذکورہ اور غیر مذکورہ آیات سے مجموعی طور پر یہ مطلب واضح ہوجاتا ہے کہ قرآنی نقطۂ نظر سے قاضی، حاکم اور فیصلہ کرنے والا خدا اور وہ لوگ ہیں جو اس کی طرف سے فیصلہ کرنے اور قضاوت کے مجاز ہیں اس کے علاوہ ہر فیصلہ، فیصلۂ جاہلیت اور شیطانی قضاوت ہے! اسی وجہ سے حکومت اسلامی میں قضات کے سلسلۂ مراتب کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے اذن اور فرمان پر جا کر ختم ہو اور ان (قضاۃ) کی قضاوت کا شرعی ہونا اللہ تعالیٰ کے فرمان سے ثابت ہو، مثلاً رسول اکرمؐ نے یہ منصب خدا سے حاصل کیا اور ائمہ معصومینؑ خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ رسول اکرمؐ اس منصب کے لئے منتخب و معین کئے گئے ہیں اسی طرح قضات اسلامی اپنے عمل (قضاوت) کی مشروعیت کو ائمہ اطہارؑ سے حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۂ مومن کی آیت ۲۰ میں اس مطلب کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ؕ

یعنی: ''خدا تعالیٰ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور لوگ جنہیں خدا کی بجائے معبود کے طور پر پکارتے ہیں وہ کسی

---

[1] سورہ مائدہ۔۵۰

[2] سورہ انعام۔۱۱۴

[3] سورہ شوریٰ۔۱۰

قسم کی (قابل قبول) قضاوت نہیں رکھتے۔''

اس بناء پر فقط خدا تعالیٰ اور اس کے اولیاء (رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ) کی قضاوت اور فیصلہ ہی قابل قبول ہے، اس کے برعکس شرک آلود فیصلے قبولیت کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ یہ مطلب ابواب قضا کی احادیث میں زیادہ واضح طور پر بیان ہوا ہے۔

ان میں سے بعض کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ امام جعفر صادق ؑ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"اِتَّقُوا الْحُكُومَةَ فَاِنَّ الْحُكُومَةَ اِنَّما هِىَ لِلاِمامِ العالم بِالْقَضاءِ اَلْعادِلِ فِى الْمُسْلِمِينَ، لنَبِىٍّ او وَصِىِّ نَبِىٍّ"

''قضاوت سے پرہیز کرو کیونکہ قضاوت اور فیصلہ اصول قضاوت سے آگاہ اور مسلمانوں کے درمیان عادل امام کے لئے ثابت ہے (یعنی) رسولؐ یا وصی رسولؐ کے لئے ثابت ہے۔''[۱]

۲۔ امام جعفر صادق ؑ کی ایک معروف حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ نے قاضی شریح سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:

"يا شُرَيْحُ قَدْ جَلَسْتَ مَجْلِساً لا يَجْلِسُهُ اِلاّ نَبِىٌّ، اَوْ وَصِىُّ نَبِىٍّ اَوْ شَقِىٌّ!"

''اے شریح! تو اس مقام پر بیٹھا ہے جس پر سوائے نبی، وصی یا شقی (بدبخت) کے کوئی اور نہیں بیٹھتا۔''[۲]

۳۔ امام جعفر صادق ؑ سے ایک اور حدیث میں مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"وَالْحُكْمُ لا يَصِحُّ اِلاّ بِاِذْنٍ مِنَ اللهِ وَبُرْهانِهِ"

وہی فیصلہ اور قضاوت درست ہے جو خدا کے اذن، اجازت اور اس کی برہان (دلیل) سے ہو[۳]

نتیجہ یہ کہ جو دلائل عقلی توحید افعالی اور توحید حاکمیت و مالکیت پر دلالت کرتے ہیں وہی قضاوت کو اذن الٰہی سے مشروط قرار دیتے ہیں اور آیات قرآنی اور اس سلسلے میں واردشدہ احادیث و روایات بھی (قضاوت کے لئے اذن خدا کو شرط قرار دیتی ہیں) اور یہ جو کہتے ہیں کہ مجتہد جامع الشرائط (ولی فقیہ) کے لئے تینوں منصب فتویٰ دینا، قضاوت کرنا اور ولایت ثابت ہیں اس سے اسی مطلب کی عکاسی ہوتی ہے۔ اب ہم اسلام میں قاضی کی صفات، آداب قضاوت اور اسلامی اور مغربی قضاوت کے درمیان بنیادی فرق کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہیں تاکہ یہ بحث مکمل ہو سکے۔

---

[۱] وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ابواب صفات القاضی، باب ۳، حدیث ۳۔

[۲] وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ابواب صفات القاضی، باب ۳، حدیث ۳۔

[۳] مصباح الشریعۃ، ص ۴۱ (اس کتاب کا معتبر ہونا علماء کی نظر میں اختلافی ہے چونکہ اب تک اس کے مولف کی درست شناخت نہیں ہو سکی۔

صفات قاضی

اسلامی منابع اور فقہی کتب میں قاضی کے لئے نہایت سخت شرائط بیان کی گئی ہیں ایسی شرائط جو کسی اور مکتب و مذہب میں نہیں ملتیں اگرچہ علماء اسلام اور شیعہ وسنی فقہاء کے درمیان ان شرائط کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ چونکہ یہ کتاب فقہ استدلالی پر نہیں لکھی گئی لہٰذا ہم فقط اُن ہی شرائط کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے جو سب فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہیں اور بعد ازاں وہ اختلافی شرائط کو ذکر کریں گے اور ایک گروہ ان کے شرط ہونے اور دوسرا گروہ ان کی عدم شرطیت (شرط نہ ہونے) کا قائل ہے اور ان شرائط کے قاضی کی ذات میں موجود ہونے کو اس کے کمالات میں سے شمار کرتا ہے' کی طرف ایک سرسری سا اشارہ کریں گے۔

البتہ جو کچھ ہمارے فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہیں اور ماہر فقیہ صاحب جواہرؒ کے الفاظ میں "لاخِلافَ اَجِدُہ فی شَیْءٍ مِنْہا" یعنی: ''ان شرائط میں میرے خیال کے مطابق کوئی اختلاف نہیں''، اور جنھیں مرحوم شہید ثانیؒ نے اتفاقی اور اجماعی شرائط قرار دیا ہے، وہ سات ہیں:

۱۔ بلوغ' اس شرط کی بناء پر نابالغ بچے کا قاضی ہونا ممنوع ہے اگرچہ وہ علم وآگاہی اور تقویٰ کی اعلیٰ منزل پر فائز ہی کیوں نہ ہو چونکہ نابالغ افراد کی کوئی شرعی ذمہ داری نہیں ہوتی اور وہ شرعی قوانین کے دائرے سے خارج ہوتے ہیں لہٰذا اسی دلیل کی وجہ سے ان کی قضاوت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ کمال عقل' اس شرط کی روسے دیوانہ اور ناقص العقل افراد چونکہ روحانی طور پر غیر معتدل مزاج کے حامل ہوتے ہیں اس لئے مسند قضاوت پر بیٹھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اس کی دلیل کسی بیان وتوضیح کی محتاج نہیں۔

۳۔ اسلام وایمان' اس شرط کی روسے جو شخص مسلمان نہ ہو اور مکتب اہل بیتؑ پر اعتقاد بھی نہ رکھتا ہو، اس کی قضاوت قابل قبول نہیں اس کی وجہ بھی واضح ہے۔

۴۔ عدالت' یعنی تقویٰ سے بالاتر مرتبہ جس کے باعث وہ گناہان کبیرہ کے ارتکاب اور گناہان صغیرہ پر اصرار سے باز رہے، یقینی طور پر جو شخص تقویٰ کے اس مرتبے کا حامل نہ ہو اس سے درست قضاوت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

۵۔ علم وآگاہی' قوانین الٰہی جو لوگوں کے حقوق سے متعلق ہوں اور حدود ودیات وقصاص اور معاملات اور اسی طرح اسلامی قضاوت سے آگاہی قاضی کے لئے نہایت ضروری ہے وہ شخص جس میں یہ شرط (اجتہاد مطلق یا جزوی اجتہاد) نہ پائی جاتی ہو یعنی وہ مجتہد نہیں لیکن تمام حقوقی مسائل وغیرہ سے آگاہ ہے تو کیا ایسے شخص کی قضاوت نافذ (قابل قبول) ہوگی یا نہیں؟ یہ مسئلہ علماء وفقہاء کے درمیان اختلافی ہے۔

اگرچہ فقہاء کے درمیان مشہور اور معتبر اجتہاد ہی ہے، یہاں تک کہ بعض کے نزدیک قاضی کا شہر کے فقہاء کی نسبت اعلم ہونا بھی

ضروری شرط ہے لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ بہرحال اگر مجتہدین مطلق بقدر کافی موجود نہ ہوں تو پھر سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ان لوگوں سے استفادہ کیا جائے جو مجتہد نہیں، لیکن مجتہد تقلید کے نتیجے میں تمام مسائل سے آگاہ ہیں۔

۶۔ پیدائشی طہارت یعنی حلال زادہ ہونا، کیونکہ ناجائز فرزند اگر چہ خود کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا، مگر وہ معاشرۂ اسلامی میں مقبول نہیں ہوسکتا اور اس کی قضاوت کا بھی یہی حال ہے بلا شک و تردید قاضی ایسا شخص ہو جسے سب قبول کریں اور اُس کی بات بھی مانیں۔ اس کے علاوہ جو شخص حلال زادہ نہ ہو اُس پر گناہ اور گمراہی کا زیادہ احتمال پایا جاتا ہے۔ (غور فرمائیں)۔

۷۔ ذکوریت، علماء اسلام کے درمیان مشہور یہی ہے کہ قاضی کا مرد ہونا ضروری ہے اگر چہ بعض فقہاء اہل سنت جیسے ابوحنیفہ اس حکم میں متردد یا مخالف ہیں۔[1]

واضح اور روشن ہے کہ خواتین پر جذبات و احساس کا غلبہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں وہ قضاوت جیسے سخت امور کی ذمہ دار نہیں لے سکتیں۔ علاوہ بر ایں یہ موضوع علماء شیعہ کے ہاں اجماعی اور اتفاقی ہے (کہ عورت قاضی نہیں ہوسکتی)۔ اس باب میں تین اور شرائط بھی ہیں جو علماء کے درمیان اختلافی ہیں:

۸۔ حریت، اس بناء پر قاضی کو آزاد ہونا چاہیے اور غلام اس منصب پر فائز نہیں ہوسکتا، لیکن بہت سارے علماء کے نزدیک یہ شرط ناقابل قبول ہے۔

۹۔ نابینا نہ ہونا۔ ۱۰۔ بہرا نہ ہونا۔

درحقیقت ان آخری تین شرائط کی کوئی دلیل موجود نہیں، بنا بر ایں قضاوت کی صلاحیت کے لئے آزاد و غلام کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا (خوش بختی سے غلامی کا موضوع ہمارے زمانے میں کلی طور پر مفقود ہے)، جہاں تک بینائی اور شنوائی (سماعت) کا تعلق ہے تو اس ضمن میں کہا جاسکتا ہے کہ اگر قضاوت کا ایسے موضوعات سے تعلق ہو جس میں قاضی کو دیکھنے یا سننے کی ضرورت نہ ہو مثلاً قاضی نابینا ہے لیکن کانوں کے ذریعے ساری گفتگو سن کر درست قضاوت کر سکتا ہے یا بہرا ہے لیکن آنکھوں سے کیس کی فائل پڑھ کر درست فیصلہ کر سکتا ہے تو اس صورتحال میں اس کی قضاوت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

اگر چہ غالباً ایک نابینا اور بہرا شخص سارے امور میں قضاوت کی صلاحیت نہیں رکھتا، بنا بر ایں مقدمہ واجب کے عنوان سے ان دونوں شرائط کی رعایت غالباً لازم ہے۔ مذکورہ بالا بیان کے مطابق کہ سات شرائط کا ہونا لازم اور تین آخری شرائط وصفات کا ہونا لازم نہیں، درحقیقت بصورت اشارہ تھا اور ان کی تفصیلی شرح کے لئے فقۂ استدلالی میں لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔[2]

---

[1] ابوحنیفہ سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ اموال میں عورت کی قضاوت کو قبول کرتے ہیں لیکن طبری کے قول کے مطابق وہ مطلق طور پر عورت کی قضاوت کے قائل ہیں (بدایۃ المجتہد، ج ۲ ص ۴۶۰، کتاب الاقضیہ)

[2] اس بارے میں قارئین جواہر کی جلد ۴۰ صفحہ ۱۲۔ ۲۳۔ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

شرائط کمال

مذکورہ بالا دس صفات وشرائط کے علاوہ روایات اسلامی میں قاضی کے لئے بعض دوسری شرائط وصفات کا اعتبار بھی کیا گیا ہے، جنھیں شرائط کمال کے طور پر جاننا چاہیے۔عہد نامہ مالک اشتر میں شرائط واجب کے ساتھ ساتھ ان شرائط کمال کے ایک اہم حصے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ان کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:

۱۔فضلیت، قاضی کا تمام لوگوں یا (اہل شہر) سے افضل ہونا:

(ثُمَّ اخْتَرْلِلْحُكْمِ بَيْنَ النّاسِ اَفْضَلَ رَعِيَّتِكَ فِى نَفْسِكَ)

۲۔صاحب حوصلہ اور باہمت ہونا:(مِمَّن لاتَضيقُ بِهِ الأُمورُ)۔

۳۔ وسعت قلبی:(وَلاتُمَحِّكُهُ الْخُصُومُ)۔

۴۔ ضدی اور ہٹ دھرم نہ ہونا:(وَلايَتَمادىٰ فِى الزَّلَّةِ)۔

۵۔حق کے سامنے سرتسلیم خم کرنے والا ہونا:(وَلايَحْصَرُ مِنَ الْفَيْئِ اِلَى الْحَقِّ اِذاعَرَفَهُ)۔

۶۔ لالچی اور حریص نہ ہونا:(وَلاتُشْرِفُ نَفْسُهُ عَلىٰ طَمَعٍ)۔

۷۔ سطحی تحقیق پر قناعت کرنے والا نہ ہونا:(وَلايَكْتَفِى بِاَدْنىٰ فَهْمٍ دُونَ اَقْصاهُ)۔

۸۔ شبہات پیش آنے کی صورت میں سب سے زیادہ محتاط ہونا:(وَاَوْقَفَهُمْ فِى الشُّبُهاتِ)۔

۹۔ دلیل کے مطابق عمل کرنے کا سختی سے پابند ہونا:(وَاَخَذَهُمْ بِالْحُجَجِ)۔

۱۰۔شکایات کرنے والوں کے بار بار رجوع کرنے سے رنجیدہ اور خستہ نہ ہونا:(وَاَقَلَّهُمْ تَبَرُّماً بِمُراجَعَةِ الْخَصْمِ)۔

۱۱۔حقائق کے انکشاف میں سب سے زیادہ صابر ہونا:(وَاَصْبَرَهُمْ عَلىٰ تَكَشُّفِ الأُمورِ)۔

۱۲۔ حق کے آشکارا ہونے پر قاطعانہ طور پر فیصلہ سنانا:(وَاَصْرَمَهُمْ عِنْدَاِتِّضاحِ الْحُكْمِ)۔

۱۳۔چاپلوسوں کی چاپلوسی سے فریب نہ کھانا اور مداحوں کی تعریف وتمجید سے وہ ان کی طرف مائل نہ ہو:

(مِمَّنْ لايَزْدَهِيهِ اِطْراءٌ وَلايَسْتَميلُهُ اِغْراءٌ)۔

۱۴۔بیت المال کو قاضی کے اخراجات کا کفیل بیت المال کو ہونا چاہیے اور اسے بیت المال سے اس قدر پیسہ ملنا چاہیے کہ جس کے باعث وہ کسی کا محتاج نہ رہے اور اس کی نظر لوگوں کے ہاتھوں اور جیب پر نہ ہو:

(وَافْسَحْ لَهُ فِى الْبَذْلِ مايُزيلُ عِلَّتَهُ وَتَقِلُّ مَعَهُ حاجَتُهُ اِلَى النّاسِ)۔[1]

علاوہ ازیں روایات اسلامی میں کچھ اور احکام بھی قاضی کے لئے ثابت ہیں۔انھیں بھی شرائط کمال میں سے شمار کرنا چاہیے،

[1] نہج البلاغہ، عہد نامہ مالک اشتر۔

جن (احکام) کی تفصیل یہ ہے کہ وہ لوگوں کی طرف سے کھانے کی دعوت کو قبول نہ کرے۔ تحفے قبول نہ کرے، سودا سلف خریدنے کے لئے بذات خود بازار جانے سے اجتناب کرے، کسی جھگڑے کے طرفین میں سے کسی کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت نہ دے اور چاہیے کہ وہ ان تمام ایسے امور سے اجتناب کرے جن سے یہ خوف ہو کہ ان امور کے باعث لوگ اسے متاثر کر کے اس کے زاویہ سوچ کو تبدیل کر دیں اور اسے اپنی طرف متوجہ کر لیں جس کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر خلاف حق قضاوت پر مجبور ہو جائے۔

قرآن اور قاضی کی صفات

قرآن مجید میں اگرچہ قاضی کی صفات وشرائط ایک علیحدہ اور تفصیلی صورت میں بیان نہیں ہوئیں، لیکن بعض تعبیرات اور آیات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں مذکورہ بالا صفات میں سے چند اہم صفات کو جمع کر دیا گیا ہے۔

۱۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر خواہش نفس کی پیروی کو عادلانہ فیصلے کی راہ میں رکاوٹ اور حق سے انحراف وروگردانی کا سبب شمار کیا گیا ہے۔ فرمان خدا تعالیٰ ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ

یعنی: ''اے ایمان والو! مکمل طور پر عدالت قائم کرنے والے بنو، اور شہادت دو تو خدا کے لئے اگرچہ یہ شہادت خود تمہارے یا تمہارے والدین یا قرابتداروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اگر وہ غنی یا فقیر ہوں تو خدا اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ ان کی حمایت کرے، پس اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو وگرنہ حق سے منحرف ہو جاؤ گے۔'' [1]

۲۔ یہی مطلب حضرت داؤدؑ کی قضاوت اور حکومت کے واقعات میں ایک دوسری شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت داؤدؑ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ

یعنی: ''اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین پر اپنا جانشین اور نمائندہ مقرر کیا ہے، پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ قضاوت (فیصلہ) کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کیونکہ یہ تمہیں خدا کی

---

[1] سورہ نساء۔ ۱۳۵

راہ سے بھٹکا دے گی۔''[۱]

درنتیجہ قرآن، ام المفاسد یعنی خواہش نفس کی پیروی سے پرہیز کو قضاوت اور شہادت کی حقیقی شرائط میں سے ایک شرط شمار کرتا ہے اور اس کا نقطۂ مقابل تقویٰ کی وہ عالی ترین سطح ہے جو حق و عدالت کی راہ سے ہر قسم کے انحراف کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ یہاں تک کہ والدین و فرزند کے تعلق یا رشتہ داری جو ایک اہم اور بہت قوی رشتہ اور تعلق ہے وہ بھی تقویٰ کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔

۳۔ایک اور مقام پر ''ما انزل الله'' (جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے) کے مطابق قضاوت کو ایمان و عدالت کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ا[۲]

اور قرآن میں اللہ تعالیٰ رسول اکرمؐ کو تاکید کرتا ہے کہ تمہاری قضاوت خدا کے حکم کے مطابق ہونی چاہیے اس ضمن میں قرآن یوں گویا ہے:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ [۳]

واضح ہے کہ ''ما انزل الله'' کے مطابق فیصلہ کرنا اسی وقت ممکن ہے جب احکام الٰہی کے بارے میں کافی آگاہی ہو۔

۴۔ایک اور مقام پر رسول اکرمؐ کو متنبہ کر کے فرماتا ہے (تاکہ دوسرے لوگ اپنا حساب خود کر لیں کہ وہ کتنے پانیوں میں ہیں) کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ (اے رسولؐ) لوگوں کے ذاتی میلانات اور خود غرضی پر مبنی ان کے وسوسے عدالت کے مطابق تمہاری قضاوت کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں:

وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ ؕ

یعنی: ''اور لوگوں کے درمیان جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، کے مطابق فیصلے کرو اور ان کی خواہشات نفس اور ہوس کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ خدا نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے، اس کے بعض احکام سے کہیں وہ تمہیں منحرف نہ کر دیں۔''[۴]

۵۔اسی طرح خدا تعالیٰ قرآن مجید میں یہ تنبیہ بھی کرتا ہے کہ جس طرح دوستی کو عدالت پر مبنی قضاوت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے اسی طرح ضروری ہے کہ دشمنی اور خصومت میں بھی حق و عدالت کی راہ سے انحراف کا سبب نہ بنیں پس فیصلہ کرنا اور شہادت دینا حق و عدالت کے مطابق ہو، چاہے ان کا تعلق دوست سے ہو یا دشمن سے سورۂ مائدہ کی آٹھویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

---

[۱] سورہ ص۔۲۶

[۲] سورہ مائدہ۔ ۴۴،۴۵،۴۷۔

[۳] سورہ نساء ۱۰۵

[۴] سورہ مائدہ۔۴۹

"وَلاَيَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى"

یعنی: ''کسی جماعت کے ساتھ تمہاری دشمنی اس بات کا سبب نہ بنے کہ تم عدالت کو ترک اور گناہ کا ارتکاب کرو، عدالت (کے ساتھ قضاوت) کرو کیونکہ یہ پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے۔''

نتیجہ

مذکورہ بالا آیات، روایات اور بزرگ فقہاء کے فتاویٰ میں قاضی کی ضروری صفات اور اسی طرح اس کی صفات کمال سے متعلق جو کچھ نقل ہوا ہے اس سے بخوبی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اس مسئلے پر بہت زیادہ توجہ دی ہے اور بڑی باریک بینی سے عادلانہ قضاوت کے مسئلے کا تعاقب کیا ہے اور اپنے مکتب کی پیروی کرنے والوں کو عادلانہ قضاوت کے مسئلے کا اس قدر پابند قرار دیا ہے کہ قاضی کو حق وانصاف کی راہ سے ذرا سے انحراف کی بھی اجازت نہیں یہاں تک کہ بعض مسائل، پر بھی توجہ دی ہے اور خبردار کیا ہے۔ جو چند واسطوں سے ممکن ہے قاضی پر اثر انداز ہوں اور اسے جادۂ حق وعدالت سے منحرف کردیں۔

اگر آداب قضاوت پر مشتمل فصل کے بعد آنے والے صفحات میں ذکر کی جائے گی مطالب ان شرائط میں اضافہ کریں تو اسلام کا اس مسئلے کو غیر معمولی اہمیت دینا زیادہ واضح ہو جاتا ہے یہاں تک کہ دوسرے مکاتب کے عدالت خواہی کے نعروں کا رنگ اس کے مقابلے میں پھیکا نظر آتا ہے۔

اسلام میں قضاوت کے آداب

اہم مسئلہ یہ ہے کہ ادیان الٰہی ایک مضبوط اخلاقی پشت پناہ قضاوت فیصلہ سازی اور وہ اصول جو فیصلہ سازی اور عدالتی تنظیم پر حاکم ہیں، کی بدولت مادی مکاتب سے بہت آگے ہیں بلکہ ان دونوں (ادیان الٰہی اور مکاتب مادی) کا آپس میں موازنہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان احکام میں بے پناہ لطافت اور باریک بینی نظر آتی ہے اور اگرچہ ان میں سے بعض احکام زمانہ گذشتہ سے تعلق رکھتے ہیں اور شاید آج کل قابل استفادہ نہ ہوں لیکن اصولی نقطۂ نظر سے عدالتی مسائل کی نسبت فائدہ بخش ہیں۔ یہاں ہم مرحوم محققؒ نے ''شرائع'' میں آداب القضاء کی بحث میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اور درحقیقت یہی احادیث اور کلمات فقہاء کا نچوڑ ہے، اسی کو بیان کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ محققؒ فرماتے ہیں: ''مستحب ہے کہ قاضی ان امور کی رعایت کرے اور ان کا لحاظ رکھے۔''

۱۔ اسے چاہیے کہ وہ اس علاقے کے لوگوں کے بارے میں جن پر اسے بحیثیت قاضی مقرر کیا گیا ہے، پوری پوری تحقیق کرے (ان لوگوں کے رہن سہن سے آگاہی حاصل کرے اور ان کے اخلاقی اور اقتصادی حالات سے آشنا ہو، علاقے کے علماء صالح افراد اور حتیٰ کہ سابقہ قاضیوں کے ساتھ بھی شناسائی پیدا کرے، تاکہ اسے اپنے فرض کی ادائیگی میں کافی بصیرت حاصل ہو، چونکہ اس علاقے کے احوال اور رسم و رواج سے آگاہی عادلانہ قضاوت کے مسئلے میں کافی مؤثر ہوتی ہے)۔

۲۔ جب اپنی تقرری کے مقام پر پہنچے تو اپنی رہائش (اور مرکز قضاوت) کو شہر کے وسط میں قرار دے تاکہ سب شکایت کرنے والے مساوی طور پر اس تک پہنچ سکیں!

۳۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اپنی آمد کی منادی اور اعلان کروائے تاکہ سب مظلومین باخبر ہو جائیں۔

۴۔ عدالت کھلے اور آشکارا مقام پر قائم ہونی چاہیے تاکہ سب آسانی کے ساتھ اس تک دسترسی پیدا کر سکیں (نہ کہ بند دروازوں کے پیچھے اور پولیس کے محاصرے میں)۔

۵۔ شہر میں داخل ہونے کے ساتھ ہی لوگوں کی تمام اسناد و مدارک اور فائلوں کو سابق قاضی سے وصول کرے اور اسی طرح اس سے اس کے پاس رکھی ہوئی لوگوں کی امانتوں کو بھی اپنے قبضے میں لے (اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ بہت سے لوگ اپنی قیمتی اشیاء کو بطور امانت قاضی کے پاس رکھ دیتے تھے، اسی طرح وہ اموال بھی قاضی کے پاس بطور امانت ہوتے تھے جن کی کیفیت نزاعی اور اختلافی ہوتی تھی)۔

۶۔ اگر محل عدالت (فیصلہ گاہ) مسجد ہو تو قاضی کو چاہیے کہ مسجد میں داخل ہوتے ہی تحیت مسجد کی نماز پڑھے۔ اس کے بعد قبلے کی طرف پشت کر کے بیٹھ جائے تاکہ مدعی اور صاحب شکایت لوگوں کا رخ قبلے کی طرف ہو (اور وہ محسوس کریں کہ وہ بارگاہ الٰہی کے روبرو ہیں)

۷۔ اسے (قاضی کو) چاہیے کہ قید خانے میں موجود قیدیوں کے بارے میں مکمل تحقیق کرے اور ان قیدیوں کو آزاد کر دے جن کے زندان میں رہنے کی کوئی خاص وجہ نہیں، اور اگر کوئی معقول وجہ ہو تو شکایت کرنے والے کو بلا کر مقدمے کا دوبارہ جائزہ لے، اسی طرح

یتیموں کے سرپرست، حاکم کے امین اور یتیموں کے مال کے محافظ افراد کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کرے، اور اگر ان میں کچھ نا اہل افراد ہوں تو جلد از جلد انھیں برطرف کر کے صالح افراد کو ان امور پر مامور کرے۔

۸۔ عدالت گاہ میں علماء و دانشور افراد کی ایک جماعت کو بھی مدعو کرے تاکہ وہ لوگ اس کی قضاوت پر نظر رکھیں اور اس سے کوئی غلطی سرزد ہونے کی صورت میں وہ اسے آگاہ کریں۔

۹۔ بذات خود قاضی کو خرید و فروخت کے لئے بازار نہیں جانا چاہیے (تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ رعایتی انداز میں پیش آئیں جس کے نتیجے میں وہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان سے متاثر ہو جائے)۔

۱۰۔ عدالت گاہ میں ضروری ہے کہ اس کا چہرہ ایسا نہ ہو جس پر بل پڑے ہوں اور اس سخت رویے کی وجہ سے لوگ اپنا مافی الضمیر وضاحت کے ساتھ پیش نہ کر سکیں، اسی طرح اس کا چہرہ اتنا نرم اور ملائم بھی نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اس کے باعث گستاخ اور جسور ہو جائیں اور ''مدعی یہ گمان کرنے لگیں کہ یہ تو حلوا ہے۔''

۱۱۔ قاضی، شہادت دینے والوں کے درمیان ترجیح کا قائل نہ ہو (شاہد آشنا اور غیر آشنا اور رشتہ دار اور اجنبی کو یکساں قرار دے، جب شہادت دینے کی تمام شرائط ان میں موجود ہوں)۔

۱۲۔ ہر ہفتے کی فائلوں کو جمع کر کے ان کا ایک منظم انداز میں ریکارڈ رکھے اسی طرح ہر ماہ اور ایک ہر سال کی فائلوں کو ضبط تاریخ کے ساتھ بھی منظم کر کے حفاظت سے ریکارڈ روم کے سپرد کر دے (یا ان کی تنظیم و ترتیب کے بارے میں ضروری احکام صادر کرے)۔ اسی طرح یہ عظیم فقیہ قاضی کی ذمہ داریوں اور جن امور کی اسے رعایت کرنی چاہیے کے بارے میں یوں فرماتے ہیں: حاکم (قاضی) کی سات ذمہ داریاں ہیں:

ا۔ قاضی پر واجب ہے کہ وہ جھگڑے اور تنازعے کے فریقین کے درمیان، سلام کرنے، بیٹھنے، ان کی طرف دیکھنے اور ان کی بات سننے، اور قضاوت میں عدالت کے سلسلے میں مساوات اور برابری کو بروئے کار لائے۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ فریقین میں سے کسی ایک کو احترام کے ساتھ سلام کرتا یا اس کے سلام کا جواب دیتا ہے تو دوسرے فریق کے ساتھ بھی اس کا سلوک ایسا ہی ہونا چاہیے اور قضاوت کے مسئلے میں کسی فریق کا اعلیٰ مقام کسی طرح اس پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے اور اگر وہ کسی ایک فریق کو چند لحظے توجہ سے دیکھتا ہے تو دوسرے کو بھی اسی انداز میں دیکھے اور اگر ایک فریق کی باتوں کو توجہ سے سنتا ہے تو دوسرے فریق کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی ہونا چاہیے، مختصر یہ کہ کمرۂ عدالت میں فریقین کے جزئی احترام و آداب میں مکمل مساوات ہونی چاہیے تاکہ بخوبی کلی انحرافات کی روک تھام کی جا سکے)۔

۲۔ قاضی کے لئے ضروری ہے کہ وہ تنازعے کے فریقین میں سے کسی فریق کو کسی ایسی بات کی تلقین نہ کرے جو دوسرے کے ضرر اور زیان کا باعث بن سکتی ہو۔

۳۔ اگر فریقین (دونوں فریق) خاموش ہو جائیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک کو بات کرنے کا اشارہ نہ کرے، بلکہ اس صورتحال میں بہتر یہی ہے کہ وہ دونوں کو مخاطب کر کے کہے: ''آپ دونوں جو کہنا چاہتے ہیں کہیں'' یا یہ کہے کہ مدعی اپنی شکایت پیش کرے اور اس کی وضاحت کرے۔

۴۔ جب بھی جھگڑے کا حل واضح طور پر سامنے آجائے اسے چاہیے کہ جلد از جلد فیصلہ سنائے اور مستحب یہ ہے کہ اس سے قبل ان کو آپس میں صلح کرنے کی ترغیب دے، اگر فریقین صلح پر آمادہ نہیں ہوتے تو پھر اپنا فیصلہ صادر کرے۔

۵۔ جب کبھی شکایات ترتیب کے ساتھ پیش کی گئی ہوں، ضروری ہے کہ باری کی رعایت کی جائے اور باہمی نزاع کرنے والوں کے معاشرتی مقام کی وجہ سے ان کے مقدمے کو پہلے نہ نپٹایا جائے اور ترتیب واضح نہ ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کی جانی چاہیے۔

۶۔ اگر مدعی علیہ دعویٰ کے ضمن میں کوئی اور دعویٰ پیش کرے تو قاضی کو چاہیے کہ وہ اس کی بات پر توجہ نہ دے جب تک کہ پہلے نزاع اور دعویٰ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔

۷۔ جب بھی فریقین میں سے کوئی ایک دعویٰ پیش کرنے میں پہل کرے اور قاضی کو اسے دوسرے پر ترجیح دینی چاہیے۔[1] ہم اس بات کو دہراتے ہیں کہ ان مسائل کے بارے میں جامع اور استدلالی بحث و تحقیق کے لئے حدیث کے معروف منابع (کتابوں) کی طرف رجوع ضروری ہے۔ جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ صرف کتابوں میں بیان شدہ مطالب کا نچوڑ اور مختصر خلاصہ ہے اور اس سے مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ہم بتا سکیں کہ اسلام کے عدالتی نظام پر حاکم ثقافت، کسی قسم کی ثقافت ہے اور اس کے اور دوسرے مکاتب پر حاکم ثقافت کے درمیان کیا فرق ہے۔ یہ نکتہ بھی اہم اور قابل ذکر ہے جس میں قاضی کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ غیظ و غضب کی حالت میں مسند قضاوت پر نہ بیٹھے۔[2]

اسی طرح قاضی کو بھوک، پیاس اور نیند کی حالت میں کمرۂ عدالت میں حاضر ہونے سے گریز کرنا چاہیے (کیونکہ ممکن ہے کہ یہ امور اس کی قضاوت پر اثر انداز ہوں اور وہ غلط فیصلہ صادر کر بیٹھے)۔[3]

خلاصہ کلام یہ کہ قاضی کو چاہیے کہ وہ متوجہ رہے کہ کوئی کلی و جزئی موضوع اسے حق و عدالت کی راہ سے منحرف کر کے باطل کی طرف کھینچ کر نہ لے جا سکے۔

اسلامی قضات کو تنبیہ

لوگوں کے درمیان اہل لوگوں کی قضاوت اور فیصلہ کرنا واجب کفائی بلکہ بعض صورتوں میں واجب عینی و شخصی ہے اور یہ کام بذات خود اہم عبادات میں سے شمار ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود قاضی کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کام (قضاوت) میں بے حد احتیاط کرے۔ رسول اکرمؐ کی ایک معروف حدیث ہے:

"لِسانُ الْقاضی بَیْنَ جَمْرَتَیْنِ مِنْ نارٍ، حَتّٰی یَقْضی بَیْنَ النّاسِ فَاِمّا اِلَی الْجَنَّةِ وَاِمّا اِلَی النّارِ"

---

[1] جواہر الکلام، ج ۴۰، ص ۱۳۹ تا ۱۴۹۔

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۱۵۶۔

[3] کنز العمال، ج ۶، ص ۱۰۳، حدیث ۱۵۰۴۰۔ لمعہ، کتاب القضاء۔

یعنی: ''قاضی کی زبان آگ کے دوشعلوں کے درمیان (رہتی) ہے جب تک اس کی قضاوت اختتام پذیر نہیں ہوتی (پھر اس کے بعد) وہ یا تو بہشت کا راہی ہوتا ہے یا جہنم کا۔''[۱]

ایک اور حدیث جو امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

"اَلْقُضاةُ اَرْبَعَة، ثَلاثَة فی النّارِ وَواحِدٌ فِی الْجَنَّةِ، رَجُل قَضی بِجَورٍ وَهُوَیَعْلَمُ فَهُوَفِی النّارِ، وَرَجُل قَضی بِجَورٍ وَهُوَ لایَعْلَمُ فَهُوَفِی النّارِ، وَرَجُل قَضی بِالْحَقِّ وَهُوَلایَعْلَمُ فَهُوَفِی النّارِ، وَرَجُل قَضی بِالْحَقِّ وَهُوَیَعْلَمُ فَهُوَفِی الْجَنَّةِ"

''قاضیوں کے چار گروہ ہیں، جن میں سے تین اہل جہنم اور ایک اہل جنت میں سے ہے، وہ قاضی جو جان بوجھ کر ناحق اور ظلم پر مبنی فیصلے کرتا ہے۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور جو ناحق فیصلہ کرتا ہے لیکن جان بوجھ کر نہیں وہ بھی اہل جہنم میں سے ہے اور جو حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے لیکن اس کا یہ فیصلہ لاعلمی اور ناآگاہی کے باعث اس سے صادر ہوتا ہے ایسا قاضی بھی جہنمی ہے اور حق وعدالت کے مطابق اور علم وآگاہی کے ساتھ فیصلے کرنے والا ہی اہل جنت میں سے ہے۔[۲]

درنتیجہ، قاضی کی قضاوت اگر چہ حق وعدالت کے مطابق ہو لیکن وہ آگاہی اور علم کے بغیر اگر اس نتیجہ پہ پہنچے یا دوسرے لفظوں میں حق کے مطابق اس کے فیصلے کی رسائی اتفاقاً ہو تو ایسے شخص سے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں باز پرس ہوگی اس کے باوجود کہ اس کے فیصلے کی وجہ سے حق، حقدار کو مل جاتا ہے۔ یہ مطلب قضاوت کے مسئلے میں اسلام کی نہایت درجے کی تاکید اور اہمیت کی عکاسی کرتا ہے۔

مادی مکاتب فکر اور اسلامی قضاوت میں فرق

آج کل کی دنیا میں عدالتی نظام بہت وسیع اور زرق وبرق کے حامل ہیں، لیکن اگر ان کے فیصلہ جات کا اسلامی عدالتی نظام اور فیصلوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان کا کم حیثیت اور کم قیمت ہونا عیاں ہوجاتا ہے۔ خاص طور پر مذکورہ ذیل فرق قابل غور ہیں:

۱۔ اسلام میں قاضی کا مسائل واحکام میں صاحب نظر ہونا ضروری ہے اور فقط قانونی مواد سے اس کی آگاہی کافی نہیں بلکہ ان مسائل واحکام کے اصول ومبانی کو ازروئے اجتہاد جاننا اس کے لئے لازم ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسئلہ قضاء میں اجتہاد شرط ہے جبکہ آج کی دنیا میں فقط مواد قانونی سے آگاہی کافی سمجھی جاتی ہے ان دونوں نقطۂ ہای نظر کے درمیان فرق واضح ہے۔

واضح تر الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ ان احکام سے آگاہی، جو مثلاً ''تحریر الوسیلۃ'' میں بیان کئے گئے ہیں، ممکن ہے کہ تقلیدی یا

---

[۱] وسائل الشیعہ، ج۱۸، ص۱۵۷، باب ۲، از ابواب آداب القاضی۔

[۲] وسائل الشیعہ، ج۱۸، ص۱۱، حدیث ۶۔

اجتہادی طریقہ سے ہو اگر چہ قاضی کی ذمہ داری بہرحال یہ ہے کہ وہ ان احکام اور ان مسائل کے درمیان مطابقت قائم کرے جن کا تعلق دعویٰ سے ہے اور اس (مطابقت) کا مقصد یہ ہے کہ صاحب حق کو غیر صاحب حق سے جدا کیا جائے۔

لیکن تقلیدی طور پر "تحریر الوسیلۃ" سے آگاہ ہونے اور اجتہادی طریقے سے آگاہ ہونے کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے کیوں کہ اجتہادی طور پر آگاہی کے لئے ضروری ہے کہ مجتہد، ان تحریر شدہ احکام کے اصول کا قرآن، سنت، اجماع اور عقل کی روشنی میں سراغ لگائے (یعنی مثلاً کتاب تحریر الوسیلۃ میں درج شدہ احکام کی جانچ پڑتال کے لئے حدیث اور فقہ کی بڑی بڑی کتابوں کو کھنگالے اور فقہاء و محدثین کی آراء سے آگاہی حاصل کرے) اسلام اجتہادی طریقے کی تاکید کرتا ہے۔

۲۔ آج دنیا کے عدالتی نظام میں قاضی پر، قضاوت و عدالت کے دائرے میں ہی اعتماد کرنا کافی سمجھا جاتا ہے، لیکن اسلام میں اتنی مقدار پر اکتفا کرنا کافی نہیں، بلکہ قاضی کو ہر جہت سے پاک ہونا چاہیے، چونکہ عدالت کا مطلب ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرنا ہے، چاہے وہ مسائل قضاوت کے دائرے میں ہوں یا نہ ہوں۔ واضح ہے کہ وہ شخص جو ہر حال میں گناہ سے پرہیز کرتا ہو اور جو کسی مخصوص دائرے میں پرہیزگار رہو، ان دونوں کے درمیان بہت فرق ہے، لہٰذا دوسرے شخص میں پہلے شخص کی نسبت لغزش اور خطا کا احتمال زیادہ ہے۔

۳۔ آج دنیوی عدالتی نظام کے مطابق قاضی، اگر چہ لاعلمی کی صورت میں حق پر مبنی قضاوت کرے، ذمہ دار نہیں لیکن جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں اشارہ کیا گیا ہے، ایسا قاضی اسلامی نقطۂ نظر سے خدا کی بارگاہ میں جوابدہ ہے بلکہ حق کے مطابق فیصلے کے ساتھ ساتھ اس کے حق ہونے کی آگاہی بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ (غور فرمائیں)

۴۔ اسلام کے عدالتی نظام میں رشوت لینا نہ صرف گناہ کبیرہ ہے بلکہ بعض روایات کے مطابق کفر و شرک کی سرحد ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"اَمَّا الرَّشَاءُ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ الْكُفْرُ بِاللّٰهِ"[1]

اسلام میں قاضی کے لئے تحفہ قبول کرنا بھی ممنوع ہے (البتہ یہ وہ تحفہ ہے جو قاضی کو اس کے منصب کی وجہ سے دیا جاتا ہے خواہ وہ قضاوت سے پہلے ہو یا بعد میں) اشعث بن قیس اور اس کا رات کے وقت حضرت علیؑ کے گھر تحفے کے طور پر حلوا لے کر آنے کا واقعہ مشہور ہے، جب آپؑ نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: تحفہ اور ہدیہ ہے جو آپؑ کی خدمت میں لایا ہوں! یہ سن کر آپؑ سخت غضبناک ہوئے اور اسے مخاطب کر کے فرمایا:

"هَبَلَتْكَ الْهَبُولُ اَعَنْ دِيْنِ اللّٰهِ اَتَيْتَنِي لِتَخْدَعَنِي؟!"

ترجمہ: " وہ ماں جس کا بچہ مر گیا ہو تجھ پر روئے کیا تو دین خدا کی آڑ میں میرے پاس آیا ہے تا کہ مجھے

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۸ص ۱۶۳، باب تحریم الرشوہ، حدیث ۸۔

فریب دے سکے؟! (بظاہر تو نے اس حلوے کو تحفے کا نام دیا ہے جو درحقیقت رشوت ہے)۔''[1]

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں رشوت لینے اور دینے والا اور اسی طرح ان دو کے درمیان واسطہ بننے والا سب ذمہ دار اور ملعون ہیں، رسول اکرمؐ کی ایک حدیث ہے:

"لَعَنَ اللّٰهُ" "الرّاشِي" وِ "الْمُرْتَشِي" "وَالرّائِشَ الَّذِي بَيْنَهُمَا"[2]

قرآن مجید کی بھی بعض آیات میں کئی بار رشوت خوری کے مسئلے کی طرف اشارہ کر کے اس کی مذمت کی گئی ہے۔ ان آیات میں سے ایک سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۸ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

"وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ"

یہ آیت جس میں تمام دنیا کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ ''ایک دوسرے کے اموال کو آپس میں بذریعہ باطل اور ناحق مت کھاؤ اور بذریعہ گناہ لوگوں کے مال کا حصہ ہڑپ کرنے کے لئے اس کا ایک حصہ بطور رشوت قضات کو نہ دو حالانکہ تم جانتے ہو کہ (یہ عمل گناہ ہے)۔

فخر رازی نے اس مقام پر ایک دلچسپ تعبیر ذکر کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''اِدْلاء'' کا مادہ ''دَلْو'' ہے اور ''دَلْو'' اس ظرف کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کنویں سے پانی کھینچ کر نکالا جاتا ہے اور رشوہ کا مادہ بھی رشاء ہے جس کا معنی رسی ہے پس جس طرح پانی سے بھرے ہوئے ڈول کو رسی کے ذریعے اوپر کھینچتے ہیں، رشوت دینے والے بھی لوگوں کے مال کو رشوت کے ذریعے اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ جی ہاں! ''وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ'' سے تعبیر کرنا اس موضوع کی طرف ایک لطیف اشارہ اور تشبیہ ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۴۴ سے بھی استفادہ ہوتا ہے کہ علماء یہود اپنے مخصوص منافع کی خاطر احکام الٰہی کو تبدیل کر دیتے تھے اس مسئلے کی سخت مذمت کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

وَلَا تَشْتَرُوا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ط وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

''میری آیات تھوڑی سی قیمت کے بدلے مت فروخت کرو اور وہ لوگ جو خدا کے نازل کردہ احکام پر عمل نہیں کرتے، کافر ہیں!''

ان آیات سے بخوبی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قضاوت اور حکم پہلے درجے میں خدا کے لئے ثابت ہے اور اس کے بعد وہ جس کو مصلحت سمجھے، منتقل کر دے دوسرے الفاظ میں خدا کے علاوہ دوسرے لوگ اپنے احکام وقضاوت کا جواز خدا ہی سے حاصل کرتے ہیں اور توحید افعالی اور (توحید) حاکمیت بھی یہی تقاضا ہے۔ (غور فرمائیں)

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۴۔

[2] میزان الحکمۃ، ج ۴، ص ۱۴۵۔

اسلامی حدود وتعزیرات

اسلامی عدالتی نظام کے موضوع پر بحث کے ذیل میں ضروری ہے کہ مسئلہ حدود وتعزیرات کی طرف بھی ایک سرسری اشارہ ہونا چاہیے (البتہ اس کی وسیع بحث کے لئے ایک علیحدہ کتاب یا کئی کتابیں تحریر کرنے کی ضرورت ہے) یہ بحث درحقیقت اسلام میں عدالت کے مسئلے کی تکمیل کنندہ بحث ہے کیونکہ قاضی کی ذمہ داری، اثبات حقوق اور حدود کو جاری کرنا ہے تاکہ وہ تجاوز کرنے والوں کو ان کی پہلی جگہ پر لا بٹھائے اور منحرف اور طرح طرح کی آلودگیوں سے آلودہ افراد کو تنبیہ کرے۔ یہاں چند موضوعات قابل توجہ ہیں۔

ا۔ اسلام میں حدود وتعزیرات کا فلسفہ

اس میں شک نہیں کہ احکام الٰہی اس وجہ سے وضع کئے گئے ہیں کہ لوگوں کو عدل وانصاف اور امن وامان کی راہ کی طرف ہدایت کی جائے تاکہ افراد انسان کسب فضائل، نفی رذائل اور سیر الی اللہ اور قرب الٰہی کے باعث اپنی تخلیق کے اعلیٰ مقصد تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اور چونکہ احکام الٰہی بطور تنہا تمام نفوس پر اثر انداز نہیں ہوتے لہٰذا بشارت کے ہمراہ انذار (ڈرانے) کا عمل بھی ضروری ہے تاکہ یہ انذار لوگوں کی حرکت اور انجام عمل کا باعث بن سکے۔

چونکہ اخروی بشارتیں اور انذار، بعض لوگوں کو بُرے اعمال سے روکنے اور انفرادی ومعاشرتی ذمہ داریاں انجام دینے پر اکسانے کے لئے کافی نہیں لہٰذا ان لوگوں کے لئے جو حدود الٰہی سے تجاوز کرتے اور حق وعدالت کو پامال کرتے ہیں، دنیوی سزا کا ہونا لازم ہے، تاکہ یہ دنیوی سزائیں ان لوگوں کے لئے جو تربیت دینی اور بقدر کافی تقویٰ الٰہی سے محروم ہوتے ہیں، احکام کو جاری اور نافذ کرنے کا ضامن ثابت ہوں۔

بے شک وشبہ نظام اسلامی اور غیر اسلامی ومادی نظاموں کے درمیان اس لحاظ سے فرق ہے چونکہ دنیوی اور مادی نظاموں میں دنیوی اور مادی سزاؤں کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں جو ان کو لاگو کرنے کی ضمانت دے (یعنی اگر کوئی شخص اس جرم کا ارتکاب کرے گا تو اسے یہ سزا ملے گی، پس مادی اور دنیوی سزا قانون کے نفاذ اور اسے جاری کرنے کی واحد ضامن، لہٰذا ہر وہ حکم اور قانون جس میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کے لئے کوئی سزا نہ ہو، ان کی نظر میں حکم اور قانون شمار نہیں ہوتا بلکہ اسے فقط ایک اخلاقی تاکید کا نام دیتے ہیں۔

جبکہ اسلامی اور دینی نظام میں قلبی اعتقادات، معنوی معاہدے (جن کی پابندی لازم ہے) قیامت میں اللہ کی عظیم عدالت میں پیش ہونے پر ایمان اور یہ عقیدہ کہ دنیا میں ہر انسان کے عمل کا خدا نگران ہے، وہ اہم محرکات ہیں جو قوانین اسلامی کے نفاذ کے اہم اور قوی ضامن ہیں لیکن چونکہ یہ الٰہی محرکات بطور تنہا سارے انسانوں پر اثر انداز نہیں ہوتے لہٰذا مذکورہ اعتقادی ضمانت کے ساتھ ساتھ مادی ضمانت اور دنیوی سزاؤں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ شارع مقدس نے مجرموں کو سزا دینے اور ان پر شرعی حد جاری کرنے کو بے حد اہمیت دی

ہے۔کئی روایات میں وارد ہوا ہے:

"حَدٌّ يُقامُ فِي الاَرْضِ اَزْ کی مِنْ مَطَرِ اَرْبَعِينَ لَيْلَةً وَاَيّامِها"

"زمین پر جاری کی جانے والی ایک شرعی حد چالیس روز وشب کی بارش سے زیادہ ثمر بخش اور مفید ہے!"

یہ حدیث رسول اکرمؐ، امام باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے بھی نقل کی گئی ہے اور بعض متون میں "اَزْ کی" کی بجائے "اَفْضَل" یا "اَنْفَع" کے کلمات استعمال ہوئے ہیں۔[1]

آیت شریفہ "...يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (سورۂ روم/۱۹) کی تفسیر میں امام موسیٰ کاظمؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"لَيْسَ يُحييها بِالْقَطرِ وَلٰكِنْ يَبْعَثُ اللهُ رِجالاً فَيُحْيونَ الْعَدْلَ فَتُحْيَى الاَرْضُ لِاِحياءِ الْعَدلِ، ثُمَّ قالَ: "وَلاِقامَةُ الْحَدِّ فيهِ اَنْفَعُ فِي الاَرْضِ مِنَ الْقَطرِ اَرْبَعينَ صَباحاً"

"خدا زمین کو فقط بارش کے ذریعے زندہ نہیں کرتا بلکہ وہ کچھ افراد کو مبعوث کرتا ہے جو عدالت وانصاف کو زندہ کرتے ہیں، اس کے بعد زمین، عدالت کے زندہ ہونے کے باعث زندہ ہو جاتی ہے اس کے بعد امامؑ مزید فرماتے ہیں: یقیناً عدالت قائم کرنے کے لئے ایک حد کو جاری کرنا زمین پر چالیس دن تک برسنے والی بارش سے کہیں زیادہ نفع بخش ہے!"[2]

ایک حد کو جاری کرنا کیوں کر چالیس روز وشب کی بارش سے زیادہ نفع بخش، افضل اور ازکی (پاکیزہ تر) نہ ہو جبکہ معاشرے کی سلامتی، اس کا امن وامان اور اس کی برقراری وثبات ہر خیر وبرکت کی اصل واساس ہے، اس لئے کہ پر برکت بارشوں، نعمتوں کی فراوانی اور اقتصادی فوائد ومنافع کا حصول امن وامان کے بغیر ممکن نہیں اور معاشرتی امن وامان، اثبات حقوق اور حدود کو جاری کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ امن وامان کے مفقود ہونے کی صورت میں لوگ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں اور ظلم وفساد پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

جس کی وجہ سے شہر ویران اور بندگان خدا کمزور سے کمزور تر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے کعبے کی بنیاد رکھی (یا اس کی تجدید کی) اور اس سرزمین کے بارے میں خدا سے چند تقاضے کئے جن میں سے ایک تقاضا یا دعا مکہ کے امن وامان کے بارے میں تھی، آپؑ نے عرض کی:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

---

[1] وسائل، ج۱۸، باب ۱، از ابواب مقدمات حدود، حدیث ۲، ۳، اور ۴۔

[2] وسائل، ج۱۸، باب ۱، از ابواب مقدمات حدود، حدیث ۳

''اے میرے رب! اس سرزمین کو شہر امن قرار دے اور اس کے رہنے والوں کو جو خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھیں، طرح طرح کے پھلوں سے رزق عطا کر۔''[۱]

اس طرح حضرت ابراہیم ؑ نے امن وامان کو انواع واقسام کے رزق سے پہلے خدا کی بارگاہ سے طلب کیا، کیونکہ آپؑ جانتے تھے کہ امن وامان کی نعمت کے بغیر دوسرے عطیات ربانی سے استفادہ ممکن نہیں۔

۲۔حد وتعزیر کا مطلب

''حدود''؛ حد کی جمع ہے جس کا لغت میں معنی ہے ''منع''۔شرعی سزاؤں میں سے بعض کو''حدود'' کے ساتھ موسوم کرنا اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگوں کو مجرمانہ افعال سے منع کرنے کا سبب بنتی ہیں، لیکن فقہاء کے الفاظ میں یہ ایک شرعی اصطلاح کی حیثیت سے ایک مخصوص سزا کے معنی میں ہے کہ جو بعض گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے مکلف افراد پر جاری کی جاتی ہیں۔رہی بات ''تعزیر'' کی تو لغت میں یہ لفظ ''تأدیب'' اور کبھی ''بزرگ شمار کرنے، مدد کرنے اور منع کرنے'' کے معانی میں بھی استعمال ہوا ہے اور اصطلاح فقہاء میں اس سے مراد وہ سزا یا اہانت (توہین) ہے کہ شریعت میں اس کی کوئی خاص مقدار معین نہیں کی گئی اور یہ قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ جرم کی حیثیت، اور مجرم کی قوت برداشت کو پیش نظر رکھ کر اسے تعزیر کرے۔

اس بناء پر ''حد'' اور ''تعزیر'' کے درمیان فرق کو صرف ایک جملے میں بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ ''حد'' ایک معین اور ثابت سزا ہے لیکن تعزیر کی مقدار غالباً معین نہیں ہوتی اور ہم نے جو ''غالباً'' کہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چند موارد میں روایات کی رو سے تعزیرات معین ہیں جن کی شرح وتفصیل کتاب الحدود میں بیان کی گئی ہے اگرچہ اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے کہ ان موارد میں مقدار تعزیر کا معین ہونا قطعی ہے یا بیان مقدار مثال ومصداق کے طور پر ہے۔[۲]

۳۔حدود اسلامی کی تعداد

اسلام میں گناہ کبیرہ کے بارے میں دس حدود بیان کی گئی ہیں کہ جن میں سے چار مقدمات کو قرآن مجید میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے جبکہ بقیہ (حدود) کا سنت سے استفادہ ہوتا ہے۔

(۱) حدّ زنا

سورۂ نور کی آیت ۲ میں مذکور ہے:

---

[۱] سورہ بقرہ۔۱۲۶

[۲] قواعد شہید، ج۲، ص۱۴۲

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

''زنا کار مرد و عورت میں سے ہر ایک کو سو تازیانے مارے جائیں اور اگر تم خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتے ہو تو ان کی نسبت تمہاری جھوٹی محبت اور الفت حکم الٰہی جاری کرنے میں مانع نہیں ہونی چاہیے! (علاوہ ازیں) ضروری ہے کہ مؤمنین کی ایک تعداد ان دونوں کی سزا کا مشاہدہ کرے!''

اس آیت میں زنا کار عورت اور مرد کی حدّ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگر چہ بعض مستثنیٰ صورتوں اور جزئیات جیسے شادی شدہ عورت اور مرد کا زنا اور محرم عورت کے ساتھ زنا اور اس طرح کی اور باتیں آیت شریفہ میں مذکور نہیں بلکہ یہ ساری تفصیلات سنت اور روایات سے معلوم ہوتی ہیں۔

(۲) چوری کی حدّ

سورۂ مائدہ کی آیت ۳۸ میں مذکور ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

''چور مرد اور عورت کا ہاتھ ان کے اس بدعمل (چوری) کی وجہ سے خدا کی طرف سے سزا کے طور پر قطع کر دیا جائے اور خدا عزیز و حکیم ہے۔''

اس معاملے میں بھی چور کا ہاتھ کاٹنے سے متعلق بعض مستثنیٰ صورتیں موجود ہیں جن کا ذکر سنت اور روایات میں موجود ہے اور معلوم ہے کہ قرآن کی روش یہ ہے کہ وہ اصولی مسائل کو بیان کرتا اور ان کی تفصیل کو سنت کے حوالے کر دیتا ہے۔

(۳) حدّ قذف

ان لوگوں کی سزا سے متعلق، جو پاکدامن افراد کی طرف پاکدامنی کے منافی عمل کو منسوب کرتے ہیں (یعنی ان پر تہمت لگاتے ہیں) سورۂ نور کی آیت ۴ میں یہ فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴﴾

یعنی: ''وہ لوگ جو پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر اپنے مدعا (دعویٰ) پر چار گواہ نہیں لاتے، انھیں اسی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں اور ان کی شہادت ہرگز قبول نہ کی جائے، یہی لوگ تو فاسق ہیں!'

یہ سخت سزا جو تہمت لگانے والے افراد (جو پاکدامن افراد کی طرف پاکدامنی کے منافی عمل کی نسبت دیتے ہیں) کے لئے اس وجہ سے بیان کی گئی ہے کہ ایسی کڑی اور سخت سزائیں ہی معاشرے کی پاکیزگی اور انسان کی عزت واحترام کی حفاظت کرسکتی ہیں اسی طرح ان سزاؤں ہی کی وجہ سے فواحش اور فساد کے پھیلنے کا راستہ روکا جاسکتا ہے، اس مسئلے کی شرائط خصوصیات اور مستثنیٰ صورتوں کو بھی احادیث وروایات میں بیان کیا گیا ہے۔

(۴) حدّ محارب

قرآن مجید میں ان لوگوں کے لئے جو معاشرے کے امن میں خلل ڈالتے اور وہ لوگ جو لوگوں کے جان ومال اور ناموس پر مسلح انداز میں حملہ کرتے ہیں بہت سخت سزائیں بیان کی گئی ہیں جن کی وجہ سے اہل شر افراد کے شر سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳ میں ارشاد خدا تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيۡنَ يُحَارِبُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَسۡعَوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ يُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ يُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ يُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ‌ؕ ذٰلِكَ لَهُمۡ خِزۡىٌ فِى الدُّنۡيَا‌ وَلَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۝۳۳

''وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جنگ کرتے اور (دھمکی اور اسلحہ کے ساتھ) لوگوں کے جان ومال اور ناموس پر حملہ کرتے ہیں، ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کیا جائے یا سولی پر لٹکایا جائے یا ان کے دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں اور بایاں پاؤں یا اس کے برعکس کاٹ دیا جائے یا انھیں ان کی سرزمین سے جلاوطن کردیا جائے، یہ رسوائی ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ایک عظیم عذاب ان کے لئے تیار کیا گیا ہے!''

جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں اشارہ کیا گیا ہے، محارب سے مراد وہ شخص ہے جو اسلحہ کے ساتھ لوگوں کو دھمکا کر ان کی جان یا مال اور ناموس پر حملہ کرے، یہ حملہ بصورت راہزنی یا شہروں کے اندر چاقو وغیرہ کے ذریعے لوگوں کے جان ومال اور ناموس پر حملے کی صورت میں ہوسکتا۔ایسے راہزنوں اور چاقو استعمال کرنے والوں کی یہی سزا ہے۔قابل توجہ بات یہ ہے کہ لوگوں کے جان واموال اور عزت وناموس پر حملہ کرنے والوں کو خدا اور رسولؐ سے جنگ کرنے والے قرار دیا گیا ہے اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اسلام نے معاشرہ کے امن وامان، آزادی اور حقوق انسانی کی رعایت کی زبردست اور غیر معمولی تاکید کی ہے۔آیا یہ چار اقسام کی سزائیں (اسلحے کے ذریعے قتل، سولی پر لٹکانا،

انگلیاں اور پاؤں کاٹنا) بصورت اختیاری ہیں یعنی قاضی ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرسکتا ہے؟ یا بصورت معین ہیں یعنی ان میں سے ہر ایک مخصوص جرم کے متناسب اور اس کے مقابلے میں ہے۔اس ترتیب سے کہ:

وہ محاربین جنھوں نے بے گناہ لوگوں کو قتل کیا ہے، کی سزا قتل ہے اور وہ جنھوں نے لوگوں پر حملہ کرکے ان کے اموال لوٹے ہیں ان کی سزا انگلیاں کاٹنا ہے۔قتل اور لوٹ مار دونوں میں ملوث ہونے کی صورت میں سزا قتل ہے اور لوگوں کی عبرت کی خاطر وہ سولی پر لٹکائے جائیں گے اور وہ (محاربین) جنھوں نے لوگوں کو ڈرانے کے لئے ان پر اسلحہ تانا ہو اور قتل وغیرہ کا ارتکاب نہ کیا ہو تو ان کی سزا جلاوطنی ہے۔ اس بارے میں فقہاء کے درمیان مفصل بحث وگفتگو ہے جس کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جاسکتی؛اس سے متعلق تفصیلی گفتگو کے لئے کتب فقہی کی (کتاب حدود، بحث ''حدّمحارب'') کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔) نیز کتب تفسیر خاص طور پر تفسیر نمونہ اس سلسلے میں مفید ومعاون ثابت ہوسکتی ہے۔[1]

ان چار حدود کا تذکرہ آیات قرآنی میں کیا گیا ہے مگر وہ چھ حدود جن کا ذکر فقط سنت (احادیث) میں ہوا ہے، ان کا بیان درج ذیل ہے:

(۵) حدّ مرتد

مرتد سے مراد ایسا شخص ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اس سے پلٹ جائے اور اسلام سے اپنی علیحدگی کا اعلان کرے؛ایسے فرد کے لئے اسلام میں سخت سزا تجویز کی گئی ہے۔اس سزا کی حکمت اور فلسفے کے بارے میں ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔قرآن مجید میں ان کی شدید مذمت اور ان کے لئے خدا تعالیٰ کے عذاب عظیم ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور سزا دینے کی کیفیت ذکر نہیں کی گئی۔سورۂ نحل کی آیت ۱۰۶ میں ارشاد فرماتا ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

ترجمہ:''وہ لوگ جو اسلام وایمان لانے کے بعد کافر ہوگئے،سوائے ان لوگوں کے جن پر دباؤ ڈالا گیا (اور انھوں نے ظاہری طور پر اسلام سے جدائی کا اظہار کیا) حالانکہ ان کے دل ایمان سے مطمئن ہیں اور! جن لوگوں نے اپنے سینے کو کفر کی قبولیت کے لئے وسیع کرلیا ہے ایسے لوگوں پر خدا کا غضب اور ایک عظیم عذاب ان کے انتظار میں ہے۔''

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ

---

[1] تفسیر نمونہ، ج۴،ص۳۶۰، ذیل آیت مورد بحث۔

الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾

''خدا تعالیٰ اس قوم کی جس نے ایمان اور رسول خداؐ کی حقانیت کی گواہی دینے اور اپنے پاس روشن دلیلیں آ جانے کے بعد بھی کفر اختیار کیا، کیسے ہدایت کرسکتا ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ خدا فرشتوں اور سب لوگوں کی ان پرلعنت ہے۔''[۱]

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ آیات قرآن میں مرتد کی حد کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں، لیکن دردناک اور شدید عذاب جوان کے لئے ثابت ہے اجمالی طور پر دنیا کی سخت سزا کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ مرتد اگر فطری ہو (یعنی اس کا نطفہ اس حال میں ٹھہرا ہو کہ اس کے ماں باپ یا کم از کم ان میں سے ایک مسلمان ہو) تو اس کی سزا قتل ہے اور اس کا توبہ کرنا بھی قبول نہیں (بشرطیکہ وہ مرد ہو) اور اگر مرتد ملی ہو یعنی غیر مسلم ماں باپ سے پیدا ہوا ہو تو سب سے پہلے اس کے سامنے توبہ کرنے کی تجویز پیش کی جائے گی۔ پس اگر وہ توبہ کرلیتا ہے تو اس کے لئے کوئی سزا نہیں، بصورت دیگر (یعنی توبہ نہ کرنے کی صورت میں) اس کی حدّ قتل ہے۔

وہ لوگ جن کا حکم مرتد کا سا ہے ایسے لوگ ہیں جو نعوذ باللہ رسول اکرمؐ کو گالی دیں۔ آنحضرتؐ کے بارے میں ناشائستہ الفاظ استعمال کریں اور آپؐ کی توہین کے مرتکب ہوں، اسی طرح آئمہ معصومینؑ اور جناب فاطمہ زہراء × کے بارے میں بھی ایسے ناشائستہ افعال کا مرتکب بھی مرتد کے حکم میں آتا ہے۔ درحقیقت یہ فعل ارتداد (مرتد ہونے) کے اسباب میں سے ایک سبب ہے لہٰذا اسے بصورت حد علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اگرچہ بعض فقہاء نے کتاب حدود میں اس مسئلے کو مستقل اور جداگانہ طور پر بیان کیا ہے۔ منابع اسلامی میں چند خاص روایات بھی موجود ہیں جو ایسے (ناشائستہ افعال کے مرتکب) افراد کا خون مباح قرار دیتی ہیں۔[۲]

مرتد کے بارے میں اس قدر سختی کیوں؟

اسلام ان لوگوں کے بارے میں کوئی سخت گیری نہیں کرتا جو ابھی تک مشرف باسلام نہیں ہوئے بلکہ انھیں منطقی طریقے اور مسلسل تبلیغ کے ذریعے اسلام کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اگر وہ دعوت اسلام قبول نہیں کرتے اور ذمیوں کی شرائط کے مطابق مسلمانوں کے ساتھ صلح وصفائی کے ساتھ رہنا پسند کریں تو اسلام نہ صرف یہ کہ انھیں امان دیتا ہے بلکہ ان کی جان و مال اور جائز منافع کی حفاظت کی بھی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

لیکن ان لوگوں کے بارے میں اسلام کا رویہ نہایت سخت ہے جو اسلام قبول کر لینے کے بعد اس سے پھر جاتے ہیں کیونکہ ان کا یہ عمل معاشرۂ اسلامی کی بنیادوں کو متزلزل کردینے کا سبب بنتا اور حکومت اسلامی کے خلاف ایک قسم کی بغاوت شمار ہوتی ہے اور غالباً یہ عمل ان

---

[۱] سورۂ آل عمران/۸۶/۸۷

[۲] وسائل، ج۱۸، ص۴۵۸، کتاب الحدود، باب۲۵، حدیث۱ تا۴ اور باب۲۷، ص۴۶۱، حدیث۱ تا۶۔

کی بدنیتی کا عکاس ہوتا ہے۔

لہٰذا جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے کہ ایسا (مرتد) شخص جس کے والدین اس کے نطفے کے انعقاد کے وقت مسلمان ہوں اور سادہ تر الفاظ میں مسلمان زادہ ہو اور اسلام سے پھر جائے اور اس پھر جانے کو علانیہ ظاہر کرے اور عدالت اسلامی میں اس کا اسلام سے برگشتہ ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو ایسی صورت میں اسلام اس کا خون مباح قرار دیتا ہے پس اس کے اموال اس کے مسلمان ورثاء کے درمیان تقسیم ہو جاتے ہیں اور اس کی زوجہ اس سے جدا ہو جاتی ہے اور بظاہر اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی یعنی یہ تینوں احکام اس کے بارے میں بہرحال جاری ہوں گے لیکن اگر وہ واقعاً نادم اور پشیمان ہو جاتا ہے تو اس صورت میں اس کی توبہ خدا کی بارگاہ میں قابل قبول ہوگی (البتہ اگر مجرم عورت ہو تو اس کی توبہ بہرحال قبول کی جائے گی اور اس کے بارے میں قتل کا حکم صادر نہیں ہوگا) اور اگر وہ پشیمان نہ ہو لیکن ظاہری طور پر اپنے ارتداد کے بارے میں کوئی گفتگو بھی نہ کرے تو کسی کو اس سے کوئی غرض نہیں (اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا)۔

اگر اسلام سے پھر جانے والا شخص مسلمان زادہ نہ ہو تو اس صورت میں اسے توبہ کرنے کا پابند کیا جائے گا، توبہ کر لینے کی صورت میں اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور وہ تمام سزاؤں سے بری ہو جائے گا اور توبہ نہ کرنے کی صورت میں اس پر حد جاری ہوگی (ان تمام صورتوں میں اس کی ظاہری توبہ کافی ہے اور ہم اس بات پر مامور نہیں کہ اس کے باطن کا بھی کھوج لگائیں) مرتد فطری کا سیاسی حکم ان لوگوں کی نظر میں جو اس کے مضمون اور حکمت سے آگاہ نہیں، ممکن ہے کہ ایک قسم کی خشونت اور سختی ہو اور اپنے عقیدے کو دوسروں پر مسلط کرنے اور اسے آزادی سے محروم کرنے کے مترادف ہو۔

لیکن اگر ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ یہ احکام فقط ان لوگوں کے لئے ثابت ہیں جو اپنے ان فاسد اور باطل عقائد کا برملا اظہار کرتے اور ان کی تبلیغ کا مشن اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور اس طرح حکومت اسلامی کے خلاف قیام کرتے ہیں اس کے برعکس یہ احکام ان لوگوں کے لئے نہیں ہیں جو اپنے فاسد عقائد کو اپنے باطن میں چھپائے رکھتے ہیں اور ان کا اظہار نہیں کرتے، تو اس صورت میں واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سختی بلاوجہ نہیں اور آزادی فکر کے بھی منافی نہیں اور اس کے مشابہ قوانین، شرق و غرب کے کئی ایک ممالک میں مختلف صورتوں میں موجود ہیں جن کے باعث حکومت ان کے خلاف قیام کرنے والے افراد کا خون مباح قرار دیتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسلام قبول کرنا عقل و منطق کے مطابق ہونا چاہیے۔ خاص طور پر وہ شخص جو مسلمان ماں باپ سے پیدا ہوا اور ایک اسلامی ماحول میں پروان چڑھا ہو، ایسے شخص کی نسبت بہت بعید نظر آتا ہے کہ اسلام اور اس کے احکامات اس کے لئے معین و واضح نہ ہوں، اسی طرح اس کا اسلام سے برگشتہ ہونا ایک سازش اور خیانت ہے نہ یہ کہ ہم اس کے ارتداد کو اس کی غلطی اور حقیقت سے ناآشنائی قرار دیں لہٰذا ایسا شخص اس قسم کی سزا کا بالکل مستحق ہے۔ قرآن مجید سورۂ آل عمران کی آیت ۷۲ اور ۷۳ میں ایک گروہ کے بارے میں فرماتا ہے کہ اس (گروہ) نے ایک منصوبہ بندی سے سازش کے تحت پہلے قبول اسلام کا اظہار کیا، بعدازاں جب اسے اسلام میں کوئی قابل ذکر چیز نظر نہ آئی تو اس (گروہ) نے اسلام کو چھوڑ کر اس سے دوری اختیار کی، مقصد اس کا یہ تھا کہ اس طریقے سے اہل ایمان کے ایمان کو متزلزل کیا جائے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۷۲ میں ہے:

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ

یہودیوں کے ایک گروہ نے کہا: (جائیں اور ظاہری طور پر) جو کچھ اہل ایمان پر نازل کیا گیا ہے، دن کے آغاز میں اس پر ایمان لائیں اور دن کے ختم ہونے پر کافر ہو جائیں (اور پہلی حالت کی طرف پلٹ جائیں، اس لئے کہ لوگ تمہیں اہل کتاب اور آسمانی بشارتوں سے آگاہ سمجھتے ہیں اور یہ کام انھیں (اہل ایمان کو) متزلزل کرنے کے لئے کافی ہے)۔

مختصر یہ کہ:

اولاً: مرتد فطری کی توبہ کا حکم ان افراد کے ساتھ مختص ہے جو مرد اور مسلمان زادہ ہوں اور آغاز سے ہی اسلام قبول کر لیں اور بعد ازاں اس سے پھر جائیں لیکن جو شخص اسلام کو آغاز بلوغت سے قبول نہیں کرتا، اس کے لئے مرتد کا حکم ثابت نہیں۔

ثانیاً: وہ لوگ جو تحقیق میں مشغول ہوں ان کے لئے بھی یہ حکم ثابت نہیں یہاں تک کہ اگر وہ اپنی تحقیق کے نتیجے میں اسلام کی بجائے کسی دوسرے آئین (دین) کی طرف مائل ہو جائیں، بشرطیکہ اسلام کے خلاف بات نہ کریں، تو ایسے لوگ بھی ان سزاؤں کے مستحق نہیں۔

ثالثاً: جب کبھی مرتدین سے چشم پوشی کرتے ہوئے ان کے مقابلے میں خاموشی اختیار کی جائے تو اس بات کا خوف رہتا ہے کہ ان کے بعض گروہ (صدر اسلام میں موجود یہودیوں کی طرح) مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال پھیلائیں گے اور لوگوں کے عقائد کی بربادی اور حکومت اسلامی کے خلاف قیام کی خاطر اپنے ارتداد کے اظہار کو وسیلہ بنائیں گے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایک عظیم افراتفری اور بحرانی صورتحال کا اسلامی معاشرے میں داخل ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ تخریبی سرگرمیاں عام طور پر بہت جلدی اپنا اثر دکھاتی ہیں، اسلام نے ایسے عمل (مرتد ہونے) کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور اس کے مقابلے میں بے حد سخت رد عمل ظاہر کیا ہے۔

(۶) شراب پینے کی حدّ

قرآن مجید کی کئی آیات میں شراب خوری کے گناہ ہونے اور اس کی برائی کے غیر معمولی ہونے کی بحث کی ہے، لیکن حدّ شراب کو بیان نہیں کیا گیا، لیکن احادیث میں اس کی حدّ اسی تازیانے بیان کی گئی ہے۔ برید بن معاویہؒ کی امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"اِنَّ فی کِتابِ عَلِیٍّ یُضْرَبُ شارِبُ الْخَمْرِ ثَمانِینَ وَ شارِبُ النَّبیذِ ثَمانِینَ"

"وہ کتاب جو امیر المؤمنینؑ کی تحریر اور رسول اکرمؐ کے املا کا نتیجہ ہے، اس میں تحریر ہے کہ جو کوئی شراب

پیئے اسی طرح جوشخص نبیذ پیئے دونوں کواسّی اسّی (۸۰) تازیانے مارے جائیں۔''[1]

(خمر؛ شراب انگور جبکہ نبیذ؛ کھجور سے تیارہ کردہ شراب کو کہتے ہیں اور کبھی نبیذ یا دونوں کو ایک وسیع ترمعنی میں استعمال کیا جاتا ہے)۔بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ شراب خور کی سزا اسی تازیانے اس لئے مقرر کی گئی ہے کہ جب کوئی شراب پیتا ہے تو مست ہوجاتا ہے اوراس حال میں وہ ناروا باتیں کرتا اورلوگوں کی ناموس پر تہمتیں لگاتا ہے۔اسی وجہ سے حدّ قذف (تہمت) اس پر جاری کی جاتی ہے۔[2]

(۷) حدّ اغلام

قرآن مجید میں اس عمل کی برائی اوراس کے ایک عظیم گناہ ہونے کوقوم لوط سے متعلق قصے میں بیان کیا گیا ہے اوربعض مفسرین کی رائے میں سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۶ میں اجمالی طور پراس کی حدّ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشادربانی ہے:

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿١٦﴾

''اور وہ لوگ جونہایت برے کام (لواط) کوانجام دیتے ہیں انھیں اذیت دی جائے اوراگرتوبہ کرکے اپنی اصلاح کریں توان سے اعراض اوردرگزرکیا جائے،اس لئے کہ خداتوبہ قبول کرنے والامہربان ہے۔''

البتہ یہ مطلب اس صورت میں ہے جب ''الَّذَانِ'' سے مراد دومرد اور ''يَأتيانِها'' میں ضمیر ''ھا'' سے لواط کی طرف اشارہ ہو،حالانکہ یہ ضمیر کلمہ فحشاء کی طرف پلٹتی ہے جواس سے پہلے والی آیت میں ذکرہوا ہے اور جوزنا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔بہرحال اغلام اورہم جنس پرستی کی حدّ روایات اسلامی کے مطابق قتل ہے،بشرطیکہ دخول ہوا ہو اوردخول نہ ہونے کی صورت میں سزا تازیانے ہیں۔اور اس بارے میں ائمہ معصومینؑ سے متعددروایات نقل کی گئی ہیں۔[3]

(۸) حدّ مساحقہ

مساحقہ یعنی عورتوں کی آپس میں ہم جنسی پرستی، کی بھی اسلام میں شدید حدّ ہے اورمشہورقول کے مطابق یہ حدّ سوتازیانے ہے اور عورت کے شادی شدہ اورغیرشادی شدہ ہونے میں کوئی فرق نہیں۔ائمہ طاہرینؑ سے منقول کئی روایات میں یہ مطلب بیان ہوا ہے۔[4]

---

[1] مرآت العقول، ج ۲۳، ص ۳۳۰، حدیث ۴

[2] مرآت العقول، ج ۲۳، ص ۳۳۱، حدیث ۷

[3] وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۴۱۶ اورصفحات بعدی، ابواب حد اللواط

[4] وسائل الشیعہ ج ۱۸، ص ۴۲۴، ابواب حد السحق والقیادہ

قرآن مجید میں واضح طور پر یہ مطلب نظر نہیں آتا، لیکن بعض مفسرین کی رائے میں سورۂ نساء کی آیت ۱۵ میں اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾

''تمہاری عورتوں میں سے جو (عورتیں) منافی عفت عمل کا ارتکاب کریں تو ان کے بارے میں چار افراد کو گواہی دینے کے لئے طلب کرو اگر وہ (ان کے خلاف) گواہی دے دیتے ہیں تو ان عورتوں کو اپنے گھروں میں بند کردو، یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا یہ کہ خدا تعالیٰ ان کے لئے کوئی راہ قرار دے۔''

لیکن اکثر مفسرین کی نظر میں اس آیت کا اشارہ زنا کی طرف ہے اس سے پہلے کہ سورۂ نور میں تازیانوں کا حکم نازل ہو، اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں موجود قرائن وشواہد اسی دوسرے قول کی تائید کرتے ہیں۔

(۹) قیادت (دلّالی) کی حدّ

قیادت کا مطلب ہے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان واسطہ بننا تاکہ اس واسطے کی وجہ سے وہ منافی عفت اعمال کا ارتکاب کریں۔ قیادت بھی ان افعال میں سے ایک ہے جن کی اسلام میں ایک معین حدّ مقرر کی گئی ہے (اگرچہ یہ حد قرآن میں مذکور نہیں) اور قول مشہور کے مطابق اس کی حدّ ۷۵ تازیانے ہیں جو زنا کی حد کی تین چوتھائی ہے۔[۱]

(۱۰) حدّ ساحر

قرآن مجید میں جادو کی مذمت واضح طور پر نظر آتی ہے، موسیٰ اور فرعون کے واقعات میں، حضرت موسیٰ کی زبان سے فرمایا گیا ہے:

"وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُوْنَ"

یعنی: ''جادوگر ہرگز کامیاب نہیں ہوں گے۔''[۲]

ہاروت اور ماروت دو فرشتوں کے قصے میں بھی جادو کی مذمت عیاں ہے، ان آیات میں سحر کو کفر کی حد میں داخل قرار

---

[۱] کتاب جواہر، ج ۴۱، ص ۴۰۰، اور کتاب وسائل، ابواب حد السحقو القیادہ، باب ۵، ص ۱۸، ص ۴۲۹

[۲] سورہ یونس۔ ۷۷

دیا گیا ہے،[1]

لیکن قرآن میں جادوگر کی حدّ کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا،البتہ روایات میں جادوگر کی حدّ قتل بیان کی گئی ہے۔[2]

اس بارے میں کہ یہ حدّ کسی قید و شرط کے بغیر ثابت ہے یا یہ کہ حدّ ان لوگوں کے لئے ثابت ہے جو جادو کو جائز سمجھ کر انجام دیتے ہیں یا بالفاظ دیگر مرتد ہو جاتے ہیں؟ اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف نظر ہے۔اسی طرح علماء کے درمیان اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ سحر و جادو کی حقیقت کیا ہے؟ کیا جادو کی کوئی حقیقت بھی ہے یا یہ محض ایک قسم کا تخیلاتی فعل ہے یا اس کا کچھ حصہ حقیقت اور کچھ تخیل پر مبنی ہے؟ فقہی کتب میں ان امور کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔[3]

وہ چیز جس پر توجہ ضروری ہے وہ یہ کہ جادوگروں کے بارے میں اسلام کی غیر معمولی سختی ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ وہ لوگ انبیاءؑ کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے تھے، بالکل ویسے ہی جیسے فرعون کے جادوگروں کے قصے میں بیان ہوا ہے اور کبھی وہ سادہ لوح افراد کو فریب دے کر انھیں انبیاءؑ کے معجزوں کو تسلیم کرنے سے روکتے تھے اور یہ ایک ایسا عظیم گناہ ہے جو بڑی سے بڑی سزا کا متقاضی ہے۔

مذکورہ بالا بیان اسلام میں حدود الٰہی کی فہرست پر مشتمل ہے جس کو بیان کرنے کا مقصد معاشرے کو پاک کرنا اور لوگوں کے درمیان بے امنی، فساد اور برائیوں کے پھیلاؤ کی راہ کو روکنا اور مسدود کرنا ہے۔لیکن ان کے علاوہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے، اسلام میں کچھ سزائیں بھی موجود ہیں جنھیں فقہاء "تعزیرات" کا نام دیتے ہیں (جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تعزیر کا مطلب منع کرنا، ادب سکھانا، تعظیم و احترام اور مدد کرنا ہے اور یہ سارے مطالب تعزیر بمعنی سزا میں جمع ہیں کیونکہ تعزیر مجرم کو جرم و گناہ سے منع کرتی اور ادب سکھاتی ہے اور مستقبل میں اس کے احترام و اکرام کا باعث بن کر خواہش نفس اور شیطان پر غالب آنے میں اس کی مددگار ہوتی ہے)۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ تعزیرات سے مراد وہ سزائیں ہیں جو اسے گناہوں کے مقابلے میں ہوتی ہیں جن کے بارے میں کوئی خاص "حدّ" مقرر نہ کی گئی ہو۔اس کی توضیح یہ ہے کہ ہر قانون اپنے نفاذ کی لازمی ضمانت چاہتا ہے یعنی اسے ایک ایسی پشت پناہی کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے نفاذ (جاری ہونے) کی محرک اور باعث بن سکے اور اگر قانون کو نافذ کرنے کے لئے کوئی سہارا اور پشت پناہ موجود نہ ہو تو ایسا قانون فقط ایک اخلاقی تاکید میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کسی عمل کی بجا آوری یا اس سے اجتناب میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔

بالکل درست ہے کہ محرکات الٰہی اور ثواب و عذاب بروز قیامت اہل ایمان کے لئے بہترین محرک اور ترغیب ہیں، لیکن اسلام فقط الٰہی و اخروی محرکات پر قناعت نہیں کرتا، اگر چہ انھیں بے حد قدر و قیمت کا حامل قرار دیتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دنیوی اور مادی محرکات کا بھی ان میں اضافہ کرتا ہے تاکہ وہ ضعیف الایمان افراد جن پر محرکات الٰہی و اخروی کم اثر انداز ہوتے ہیں کم از کم دنیوی سزاؤں کے خوف سے قوانین و حدود الٰہی کی حفاظت اور پاسداری کی کوشش کریں (تاکہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ معاشرہ فاسد و مفسد اور بے ایمان

---

[1] سورہ بقرہ۔ ۱۰۲

[2] وسائل، ج۱۸، ص۵۷۶

[3] یہ موضوع کبھی ماسب محرمہ کی بحث "تحریم سحر" کے عنوان سے زیر بحث لا گیا ہے اور کبھی کتاب حدود میں حد ساحر (جادوگر) کی بحث میں بیان ہوا ہے۔

وضعیف الایمان لوگوں کے کھیل کا میدان نہ (جولانگاہ) بن جائے۔

اور چونکہ گناہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور ان کا ارتکاب کرنے والے ان سے آگاہی، عمر اور سابقۂ گناہ اور اسی طرح زمان ومکان اور سزاؤں کو برداشت کرنے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا ان تمام گناہوں کی سزا، جن کی شریعت اسلام میں کوئی خاص حد معین نہیں کی گئی، کی مقدار اور کیفیت کو قاضی کی صوابدید اور تشخیص پر چھوڑ دیا گیا ہے تا کہ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ حالات کا ہر جہت سے بغور جائزہ لے کر مجرم کے لئے صحیح ومناسب سزا تجویز کر سکے۔

درحقیقت اسلامی سزائیں سوائے چند محدود مقامات کے کہ جنھیں حدود کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، سبھی تغیر پذیر ہیں اور مجرم کے حالات اور گناہ کی کمیت (مقدار) اور کیفیت کا (ان سزاؤں کے متغیر ہونے میں) میں ایک خاص اثر ہے لہٰذا سزا کو معین کرنا قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے۔

☆☆☆☆☆

اسلامی تعزیرات کے چند اہم موضوعات

۱۔ یکسانیت

اگر چہ باب تعزیرات میں سزاؤں کی تعیین و تشخیص میں قاضی حضرات کا آزاد ہونا ایک واضح نقطۂ قوت ہے جو انھیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ مجرموں کی سزائیں نہایت احتیاط کے ساتھ تجویز کریں، لیکن بعض اوقات یہ مسئلہ اس بات کا باعث بنتا ہے کہ قاضی حضرات مختلف علاقوں میں ایک ہی جرم کی مختلف سزائیں تجویز کریں (ماضی میں یہ بات کوئی مشکل پیدا نہیں کرتی تھی کیونکہ عملی طور پر تمام علاقے ایک دوسرے سے جدا تھے) لیکن آج مواصلات اور قریبی روابط کی بدولت یقیناً مشکل پیدا ہو سکتی ہے۔

اس بات کے پیش نظر قضات اور دوسرے ماہرین کو مل بیٹھ کر تعزیرات کی حدود معین کرنے میں کوئی مانع اور خرابی نہیں البتہ نہ ایک معین صورت میں بلکہ زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم قید، جرمانہ اور اسلامی سزاؤں وغیرہ کو مدنظر رکھ کر ان پر گفتگو کریں تاکہ وحدت رویہ (ایک سا سلوک) حاصل ہو سکے۔ یہ بات اسلامی قوانین کے عین مطابق ہے اور ہمارے زمانے میں کم از کم (بطور ثانوی عنوانات) ان کی مشروعیت اور جواز سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ تعزیر کوڑوں ہی کی سزا میں منحصر نہیں

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ تعزیر کا ایک وسیع معنی ہے جس کی رو سے منع و تادیب بھی اس کے دائرے میں آتے ہیں اور شرع اسلام اور اصطلاح فقہاء میں اس معنی کی تبدیلی پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ (یعنی تعزیر حقیقت شرعیہ یا حقیقت متشرعہ کی حامل نہیں) اسی طرح اصطلاح فقہاء میں بھی یہ کلمہ سابقہ معنی کو چھوڑ کر کسی نئے معنی میں استعمال نہیں ہوا اگر چہ بہت سارے فقہاء نے روایات کی پیروی میں غالباً اس کے ایک خاص مصداق یعنی ضرب و تازیانے بھروسہ کیا ہے۔

لیکن اس معروف مصداق کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم تعزیر کے مفہوم سے تازیانے اور کوڑے ہی سمجھیں؛ اگر چہ بعض افراد کو یہ توہم ہوا ہے کہ ان کی نظر میں تعزیر ضرب اور کوڑوں کے ساتھ مساوی ہے البتہ فقہاء کی عبارات اور روایات کی بیشتر تحقیق سے یہ توہم اور تصور باطل ہو جاتا ہے۔

مرحوم علامہ حلی قدس سرہ اپنی کتاب ''تحریر'' میں کہتے ہیں: تعزیر ہر اس جرم و گناہ کے لئے ثابت ہے جس سے متعلق کوئی ''حدّ'' بیان نہ کی گئی ہو۔ علامہ مزید کہتے ہیں:

"وَهُوَ يَكُونُ بِالضَّرْبِ وَالْحَبْسِ وَالتَّوْبِيخِ مِنْ غَيْرِ قَطْعٍ وَلا جَرْحٍ وَلا اَخْذِ مالٍ"

یعنی: تعزیر کبھی ضرب، قید یا ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے، عضو کاٹے، زخمی کئے اور مال لئے بغیر متحقق ہوتی

ہے۔[۱]

کتاب "اَلْفِقْهُ عَلَى الْمَذاهِبِ الاَرْبَعَة" میں ابن قیم کے کلام کونقل کرنے اور یہ کہ اس (ابن قیم) کی عبارت کی بظاہر دلالت اس بات پر ہے کہ حاکم (قاضی) جس بات کو مصلحت پر مبنی جانے، خواہ وہ زندان (جیل) ہو یا ضرب (تازیانے) اس کے مطابق مجرموں کو تعزیر کرسکتا ہے؛ کے بعد (صاحب کتاب) کہتے ہیں:

"وَبِالْجُمْلَةِ فَاِنَّ التَّعْزِيرَ بَاب واسِع يُمْكِنُ لِلْحاكِمِ اَنْ يَقْضى بِهِ عَلَى كُلِّ الْجَرائِمِ الَّتى لَمْ يَضِعِ الشّارِعُ لَها حَدّاً اَوْ كَفّارَةً عَلَى اَنْ يَضَعَ الْعُقُوبَةَ الْمُناسِبَةَ لِكُلِّ بَيْئَةً وَ لِكُلِّ جَرِيْمَةً مِنَ سَجْنٍ اَوضَرْبٍ اَوْ نَفْيٍ اَوْ تَوْبيخ اَوْ غَيرِ ذٰلِك"

یعنی: خلاصہ یہ کہ تعزیر کا باب وسیع ہے اور وہ حاکم وقاضی کو اجازت دیتی ہے کہ وہ ان تمام جرائم جن کے بارے میں شارع نے کوئی حد و کفارہ مقرر نہیں کیا، ایک مناسب سزا تجویز کرے جو ہر معاشرے اور ہر گناہ سے مناسبت رکھتی ہو، چاہے یہ سزا قید، ضرب یا صرف ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ پر مشتمل ہو۔[۲]

(غور فرمائیں)

یہ تھا فقہاء خاصہ (شیعہ) اور فقہاء عامہ (اہل سنت) کی آراء کا خلاصہ۔ اس سے قطع نظر فقہ کے مختلف ابواب میں جو بکثرت روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تعزیر کا مفہوم ومصداق دونوں نہایت وسیع ہیں اور اگر اس کا تذکرہ کیا جائے تو معاملہ کافی طولانی ہو جائے گا۔ تفصیل کے خواہش مند افراد ہماری کتاب "حدود و تعزیرات" کی ابحاث تعزیر کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مختلف ابواب فقہ میں وارد شدہ احادیث، عبارات فقہاء اور لغت کی کتب سے مجموعی طور پر بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حاکم اسلامی (قاضی) نوع تعزیر کے انتخاب میں آزاد ہے اور درج ذیل مقامات سب کے سب تعزیرات (پر مشتمل) ہیں البتہ تعزیر کا انتخاب، مجرم کی حالت، معاشرتی ماحول، گناہ کی مقدار کیفیت اور دیگر جہات کو سامنے رکھ کر عمل میں آنا چاہیے:

i- مختلف صورتوں میں ضرب (مارنا)۔

ii- مختلف اور متفاوت کیفیت وکمیت کے مطابق مجرم کو قید کرنا۔

iii- جرمانہ؛ یعنی مال کی ایک خاص مقدار کو مجرم سے وصول کرنا، یا اسے ایک خاص مدت کے لئے قید (بند) کر دینا (جس طرح ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والی گاڑیوں کو متوقف کیا جاتا ہے)۔

iv- سب کے سامنے یا تنہائی میں مجرم کی سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔

---

[۱] تحریر، ج۲، ص۲۳۹

[۲] الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج۵، ص۴۰۰

v- مختصر یا طولانی مدت کے لئے کسی اور مقام کی طرف اسے جلا وطن کرنا۔ اسی طرح اُسے مجرموں کے ساتھ معاملہ کرنے سے اوران کے پاس اس کی آمد ورفت کوروکنا۔

vi- مجرم کو پابند قرار دینا کہ وہ اپنے ملک یا شہر یا گھر سے باہر نہیں جا سکتا۔

vii-مدت معین اور ایک خاص عرصے کے لئے اسے کاروبار کرنے سے ممنوع قرار دینا۔

viii-بعض عہدوں اور معاشرتی حقوق سے مجرم کو محروم قرار دینا۔

ix-ذرائع ابلاغ کے ذریعے محدود یا وسیع پیانے پر اسے معاشرے سے متعارف کرانا (تاکہ سب اس کے جرم سے آگاہ ہو جائیں)۔

x- مجرم کو بعض اعزازات اور خصوصیات سے محروم قرار دینا مثلاً مجرم اگر روحانی ہے تو لباس روحانیت زیب تن کرنے کو اس کے لئے ممنوع قرار دینا۔

اس طرح کے کچھ اور امور جو مجرم کو دوبارہ جرم کی طرف متوجہ ہونے سے باز رکھنے والے ہوں اور ایسے امور جن سے دوسرے بھی اس سے عبرت حاصل کریں اور اس جیسے افعال کی انجام دہی سے پرہیز کریں۔

۳۔تعزیرات میں حاکم کے اختیار کا مطلب

قاضی کے اختیار کی مقدار کے بارے میں فقہاء کے درمیان لمبی چوڑی بحث ہے،لیکن سب (فقہاء) اس بات پر متفق ہیں کہ تعزیر کو بہر حال حدّ سے کمتر ہونا چاہیے البتہ تعزیر کو کون سی حدّ کی نسبت کمتر ہونا چاہیے؟ حدّ زنا یا کمترین حدود کی نسبت کمتر ہو؟ یا تعزیر گناہ کے مطابق ہو؟ اس بارے میں بھی فقہاء کا آپس میں اختلاف ہے اور اس کی تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

یہاں جس چیز کو ذکر کرنا لازم ہے وہ یہ ہے کہ قاضی کے تعزیر کی مقدار و کمیت اور کیفیت کو انتخاب کرنے میں تخییر و اختیار سے مراد یہ نہیں کہ کے شخصی اور ذاتی میلانات و رجانات کا اس مسئلے (یعنی تعزیر) میں عمل دخل ہو بلکہ (اس اختیار سے) مراد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوں (بلکہ کھلے ہوں) تاکہ وہ مجرم اور اس کی سزا کے درمیان ہر سمت سے تناسب کو پیش نظر رکھ سکے، درحقیقت قاضی بظاہر بااختیار ہے لیکن حقیقت میں نہیں، اس لئے کہ وہ ہر جرم کی ایک خاص سزا تجویز کرتا ہے۔ اس معنی میں کہ اگر جرم اور اس کی سزا ایک ماہ قید کی متقاضی ہو یا بیس تازیانے مجرم کے جرم کے متناسب ہوں تو قاضی ایک تازیانہ بھی کم یا زیادہ نہیں کر سکتا، یا ایک دن زیادہ یا کم قیدی کو جیل میں نہیں رکھ سکتا اور جرمانے کی صورت میں ایک روپیہ بھی کم یا زیادہ وصول نہیں کر سکتا۔ (غور فرمائیں)

۴۔قرآن مجید میں ذکر تعزیرات

قرآن مجید میں تعزیر کے بعض نمونے نظر آتے ہیں جو اسلام کے اس حکم کلی کا مصداق شمار ہوتے ہیں۔

الف: جنگ تبوک میں شرکت سے گریز کرنے والوں کی داستان

توضیح یہ کہ: سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۸ میں ارشاد ہے:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

''خدا تعالیٰ نے ان تین افراد کو بخش دیا (جنھوں نے جنگ تبوک میں شرکت نہ کی اور مدینہ ہی میں ٹکے رہے اور جن سے مسلمانوں نے قطع تعلق کرلیا) اس حد تک کہ زمین اپنی تمام وسعتوں سمیت ان پر تنگ ہو گئی! یہاں تک کہ وہ ان کے درمیان اپنے لئے کوئی جگہ نہ پاتے تھے! اب ایسی حالت میں انھوں نے جان لیا کہ عذاب خدا سے پناہ گاہ فقط خدا ہی ہے۔ اس کے بعد خدا نے اپنی رحمت کو ان کے شامل حال فرمایا تا کہ وہ توبہ کریں، خدا تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔''

اس آیت شریفہ میں بطور اشارہ اور تفاسیر و روایات میں تفصیلاً بیان ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ نے جنگ تبوک میں شرکت نہ کرنے والے ان تین افراد کے لئے ایک عجیب تعزیر انجام دی، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے رسول اکرمؐ کے فرمان کو کوئی اہمیت نہ دی اور بلا جواز جنگ میں شرکت نہ کی۔ یہ تین افراد بعض روایات کے صریح بیان کے مطابق کعب بن مالک، مرارۃ بن ربیع اور ھلال بن امیہ تھے۔ اگر چہ ان افراد کا تعلق منافقین سے نہ تھا لیکن سستی اور سہل انگاری کے باعث انھوں نے جنگ تبوک میں شرکت سے گریز کیا، مگر جلد ہی وہ اپنے عظیم گناہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور دل میں ندامت اور پشیمانی محسوس کی۔

جب رسول اکرمؐ میدان تبوک سے واپس آئے تو یہ تینوں افراد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور لگے عذر خواہی اور معذرت کرنے، لیکن رسول اکرمؐ نے ان کے ساتھ کوئی بات نہ کی اور مسلمانوں کو بھی ان کے ساتھ بات چیت نہ کرنے کا حکم دیا، جس کے نتیجے میں لوگوں نے ان کے پاس آنے جانے کا سلسلہ منقطع کرلیا یہاں تک کہ ان کی عورتیں اور بچے رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ آپؐ کی اجازت کے ساتھ ان سے علیحدگی اختیار کریں، رسول اکرمؐ نے مکمل طور پر جدائی کی اجازت نہ دی، لیکن انھیں حکم دیا کہ وہ ان (افراد) سے نزدیک نہ ہوں۔

اس وقت وہ ایک عجیب قسم کی اجتماعی اور معاشرتی گھیراؤ میں گھر گئے اور زمین اپنی بے پناہ وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی، یہاں تک کہ اس ذلت وخواری سے نجات حاصل کرنے کے لئے مدینہ کو ترک کرنے اور ارد گرد کے پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ان کے عزیز ورشتہ دار ان کے لئے کھانا پانی لاتے لیکن ان کے ساتھ ذرا سی بات بھی نہ کرتے! ان میں سے ایک نے بقیہ دونوں افراد کو مخاطب کر کے کہا: اب جبکہ تمام لوگوں نے ہم سے قطع تعلق کرلیا ہے، پس تیار ہو جاؤ کہ ہم بھی ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں شاید اس طرح خدا

ہماری توبہ قبول کرلے! اس تجویز پر عمل کیا گیا اور آخر کار پچاس روز تک خدا کی بارگاہ میں گریہ وزاری کے نتیجے میں خدا تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرلی اور مذکورہ بالا آیت شریفہ نازل ہوئی۔[1]

اس تاریخی واقعے میں تھوڑے سے غور وفکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ درحقیقت یہ ایک اہم تعزیر تھی جو ایک معنوی زندان (قید خانے)، تحقیر وتذلیل اور معاشرے سے وقتی طور پر جلا وطنی وغیرہ پر مشتمل تھی اس کا مجرموں کے ساتھ ساتھ دوسرے مسلمانوں پر بھی ایک عجیب اثر ہوا اور اس کے باعث اس قسم کے گناہوں کے ارتکاب کی مستقبل میں کوئی گنجائش نہ رہی۔ یہ داستان اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ تعزیر ایک عام اور عمومی مفہوم ہے اور فقط کوڑے اور تازیانے کے ساتھ ہی خاص نہیں اور (یہ داستان) اس بات کی بھی گواہ ہے کہ تعزیرات کی بعض اقسام اپنے اثر انداز ہونے میں تازیانوں سے کہیں زیادہ سخت اور معاشرے میں نہی عن المنکر کا قوی سبب بنتی ہیں۔

ب: ثعلبہ کا قصہ

ایک دوسرے مقام پر انصار کے ایک شخص (ثعلبہ بن حاطب) کے بارے میں سورۂ توبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۸ تک نازل ہوئی ہیں:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۝ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۝

ان میں سے بعض نے خدا کے ساتھ یہ عہد و پیمان کیا کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے فضل سے روزی دی تو ہم یقینا صدقہ دیں گے اور صالحین وشاکرین میں سے ہوں گے لیکن جب خدا تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تو انھوں نے کنجوسی کی اور خدا کے حکم سے روگردانی اور اس کی خلاف ورزی کی۔ خدا نے اس کو اپنی ملاقات کے دن تک ان کے دلوں میں برقرار کر دیا۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے حکم خدا کی خلاف ورزی کی اور جھوٹ کہا، کیا انھیں معلوم نہیں کہ خدا ان کے اسرار اور سرگوشیوں سے آگاہ ہے اور خدا تعالیٰ ہر قسم کے غیب سے بھی آگاہ ہے؟!

بہت سارے مفسرین کی رائے میں یہ آیت انصار کے ایک شخص ثعلبہ بن حاطب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ایک فقیر اور نادار شخص تھا اور پابندی کے ساتھ مسجد میں حاضر ہوتا اور رسول اکرمؐ سے اپنے لئے دعا کی درخواست کرتا تا کہ خدا اسے بہت زیادہ مال سے

[1] مجمع البیان اور تفسیر ابوالفتوح رازی، آیت موضوع بحث کے ذیل میں اور سفینۃ البحار باتلخیص۔

مالا مال کردے۔ رسول اکرمؐ نے اس کی پیہم خواہش کے جواب میں فرمایا:

"قَلیل تُؤَدّی شُکرَہُ خَیرٌ مِنْ کَثیرٍ لا تُطِیقَہُ"

''وہ تھوڑی سی نعمت جس کا تم حق ادا کر سکو اس زیادہ نعمت سے بہتر ہے جس کا تم حق ادا نہ کر سکو''

لیکن وہ اپنے اصرار سے باز نہ آیا اور قسم کھا کر کہا کہ اگر خدا تعالیٰ اسے مال و دولت عطا کر دے تو وہ اس کے تمام حقوق کو ادا کرے گا، ناچار رسول اکرمؐ نے اس کے حق میں دعا کر دی۔

تھوڑی ہی مدت میں اس کا ایک نہایت مالدار چچازاد مر گیا اور وراثت میں کافی دولت اس کے ہاتھ لگی، اس کی دولت وثروت میں آئے دن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بھیڑ بکریوں کے بہت سارے گلوں کا بھی مالک ہو گیا، لیکن جب رسول اکرمؐ نے زکوٰۃ جمع کرنے والے مامور کو اس کے پاس زکوٰۃ لینے کی غرض سے بھیجا تو اس کم ظرف ندیدے نے نہ صرف حق الٰہی کی ادائیگی سے انکار کیا بلکہ خود زکوٰۃ کے شرعی (اور حکم شارع ہونے) پر بھی اعتراض کیا اور اسے اہل کتاب سے لئے جانے والے جزیہ کے ساتھ مشابہ چیز قرار دیا (اس طرح رسول اکرمؐ کی طرف زکوٰۃ پر مامور شخص) خالی ہاتھ واپس آیا اور مذکورہ بالا آیات اس کی کنجوسی کی مذمت اور عہد شکنی کے بارے میں نازل ہوئیں!

ان آیات کا نزول بذات خود اس کے بارے میں ایک شدید تعزیر ثابت ہوئی اس لئے کہ اس (نزول آیات) سے اس کی بدعملی اور بدبختی سب پر عیاں ہو گئی۔

ایک روایت کے مطابق وہ (ثعلبہ) اپنے معاشرتی خسارے کو دور کرنے اور سابقہ حیثیت کو بحال کرنے کے لئے رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے مال کی زکوٰۃ دینا چاہی تو آپؐ نے اس سے زکوٰۃ قبول نہ کی! رسول اکرمؐ کے دنیا سے رخصت فرمانے کے بعد وہ مال زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے خلیفہ اول کے پاس آیا تو خلیفہ نے بھی زکوٰۃ قبول نہ کی! پھر خلیفہ دوم اور خلیفہ سوم نے بھی قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا: چونکہ رسول اکرمؐ نے تمہاری زکوٰۃ قبول نہیں کی لہٰذا ہم بھی قبول نہیں کرتے اور یہ شخص خلافت عثمان کے دوران دنیا سے چل بسا۔[1]

اگرچہ مذکورہ بالا آیات میں مسئلہ تعزیر کی کوئی تصریحی وضاحت موجود نہیں لیکن آیات میں اس کے عمل کی مذمت اور لوگوں کا اس سے آگاہ ہونا اور رسول اکرمؐ اور خلفاء کا اس کے ایسا سلوک کرنا، تعزیر کا ایک واضح مصداق (مثال) ہے۔ اس مسئلے نے خود اس پر اور ساتھ دوسروں پر گہرا اثر ڈالا اور یہی تعزیر سے مطلوب بھی ہے کہ وہ (تعزیر) مجرموں کو جرم سے باز رکھے، چاہے وہ (تعزیر) معنوی سزا پر مشتمل ہو یا مادی سزا پر۔

ج: آیت ایذاء

جیسا کہ سابقہ بیانات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے ان مردوں اور عورتوں کو (جو شادی شدہ نہ ہوں) زنا

---

[1] اس روایت کے پہلے حصے کو اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے جبکہ اس کا آخری حصہ تفسیر فخر رازی، ج ۱۶ ص ۱۳۸، اور تفسیر ابوالفتوح رازی ج ۶ ص ۴۷ پر آیا ہے

کے ارتکاب کی وجہ سے سزا دینے کا حکم دیا اور فرمایا ہے:

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ ..." [۱]

اگر یہاں "ایذاء" (اذیت دینے) سے مراد وہی حدّ شرعی ہے جس کی طرف آیت شریفہ میں ارشاد ہوا ہے: "اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي ..." (سورۂ نور ر ۲) تو اس صورت میں اس کا تعزیرات کی بحث کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن اگر ہم اس بات کے قائل ہوں کہ ایذاء سے مراد وہ مطلق سزا ہے جس کی حد وحدود معین نہیں کی گئیں اور اس کا تعلق حد زنا کے نازل ہونے سے قبل کے عرصے سے ہے جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے تو اس صورت میں یہ (ایذاء) تعزیرات میں سے شمار ہوگی، اس لئے کہ یہ ایک غیر معین سزا ہے جس کا تعلق حد زنا کی تعیین وتشریع سے قبل کے زنا کار افراد سے ہے۔

مرحوم طبرسی نے بھی تفسیر مجمع البیان میں اس جملے "فَاٰذُوْهُمَا" (ان دونوں کو اذیت دو) کے دو معنی بیان کئے ہیں جو دونوں تعزیرات کے مطابق ہیں پہلا یہ کہ (ایذاء) سے مراد زبان سے سرزنش کرنا اور جوتے مارنا اور دوسرا یہ کہ اس سے مراد صرف زبانی سرزنش ہے۔ [۲]

د: آیت نشوز

ناشزہ (نافرمان) عورتوں (بیویوں) کے بارے میں بھی ایک حکم قرآن میں دکھائی دیتا ہے کہ وہ بھی تعزیرات کے مصادیق میں سے ایک مصداق اور ان کی مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔ اگر چہ اس مقام پر شوہروں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ احتیاط کا لحاظ رکھ کر اس حکم کو جاری (نافذ) کریں۔ قرآن اس ضمن میں یہ فرماتا ہے:

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ، [۳]

یعنی: "وہ عورتیں جن کی نافرمانی اور سرکشی ومخالفت کا تمھیں خوف ہو انھیں وعظ ونصیحت کے ذریعے سمجھاؤ اور (اگر یہ وعظ ونصیحت ان پر اثر نہ کرے) تو بستر میں ان سے دوری اختیار کرو اور اگر یہ بھی موثر نہ ہو اور شدت وسختی کے بغیر بات نہ بنے تو انھیں تنبیہ کرو پس اگر تمہاری پیروی کریں تو ان پر ظلم وتعدی نہ کرو۔"

ناشزہ عورتوں سے مراد وہ عورتیں ہیں جو وظیفہ زوجیت انجام دینے سے انکار اور روگردانی کریں اور مختلف غیر مناسب علامات ان میں ظاہر ہوں۔ [۴]

---

[۱] سورہ نساء ۱۶

[۲] مجمع البیان، ج ۳، ص ۲۱

[۳] سورہ نساء ۳۴

[۴] نشوز کا مادہ نشز ہے اور یہ وزن کا ہم وزن ہے نشوز کا لغوی معنی ہے بلند زمین اور جب زوجین (میاں بیوی) کے متعلق استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد ازدواجی تعلقات سے سرکشی ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت شریفہ میں اس قسم کی عورتوں کے بارے میں تین قسم کی تعزیر کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔سب سے پہلے وعظ ونصیحت سے (ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تمام مقامات پر وعظ ونصیحت تعزیرات کے مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے اس لئے کہ جرم وخطا سے باز رکھنے کا ایک موثر عامل ہے) دوسری قسم ان سے علیحدگی اور تیسری بدنی سزا ہے اور ان تینوں مراحل میں سے ہر مرحلہ اس صورت میں وقوع پذیر ہوگا جب اس سے پہلا مرحلہ غیر مؤثر واقع ہوا۔

اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر مرد حضرات مخالفت، نشوز اور سرکشی کا مظاہرہ کریں تو کیا وہ بھی اس قسم کی سزا کا سامنا کریں گے؟ اس کے جواب میں ہم کہیں گے جی ہاں! لیکن مردوں کو اس قسم کی سزا دینا عورتوں کی ذمہ داری نہیں لہٰذا یہ سزا حاکم شرع (قاضی) کے سپرد کی گئی ہے وہی اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ خلاف ورزی کرنے والے مردوں کو مختلف طریقوں سے بشمول تنبیہ بدنی اگر لازم ہو، اپنے وظائف کو انجام دینے اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے پر آمادہ کرے۔(غور فرمائیں)

اس مرد کی داستان معروف ہے جس کا اپنی بیوی کے ساتھ رویہ نہایت سخت تھا اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر کسی صورت میں تیار نہیں ہوتا تھا، حضرت علی - نے اسے نہایت شدت کے ساتھ یہاں تک کہ تلوار کے ذریعے دھمکا کر حق کو تسلیم کرنے پر آمادہ کیا۔یہیں سے اس سوال کا جواب جو اس آیت کو پیش کرتے وقت بہت سوں کے ذہنوں میں پیدا ہوسکتا ہے، واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام مردوں کو یہ اجازت دے کہ وہ عورتوں کو تنبیہ بدنی کر سکیں (یعنی جسمانی سزا دینے کے مجاز ہیں) حالانکہ یہ عمل احترام انسان کے خلاف ہے، خاص طور پر وہ انسان جو اس کا (کی) شریک زندگی ہے؟ اس لئے کہ:

اوّلاً: جسمانی سزا یا تنبیہ بدن سے مراد یہ نہیں کہ مرد کوڑا اٹھائے اور عورت کو اتنا مارے کہ اس کی ہڈی پسلی ایک کردے، یا اس کے منہ پر اس طرح طمانچے مارے جس سے اس کا چہرا نیلا پڑ جائے، کیونکہ ان میں سے کوئی صورت بھی شرع اسلام میں نہ صرف یہ کہ جائز نہیں بلکہ اس سے دیت بھی واجب ہوجاتی ہے۔تنبیہ بدنی سے مراد ایسی تنبیہ ہے جو نرم انداز میں ہو نہ زخم کا باعث بنے اور نہ چہرے کو سرخ وسیاہ یا نیلا کردے، یہاں تک کہ بعض مفسرین نے آیت شریفہ کی توضیح میں کہا ہے مار ایسی ہو جیسے مسواک کی لکڑی سے ہاتھوں پر مارا جائے یا تنبیہ اس طرح کی ہو جو اسے تھوڑا سا دکھ پہونچائے لیکن اس ضرب (مار) کو سخت اور زخم کا سبب نہیں بننا چاہیے۔

ثانیاً: اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ عورتوں کی چار قسمیں ہیں: بعض عورتیں باایمان اور صالح ہوتی ہیں جو اپنی ذاتی لیاقت اور تربیت کے نتیجے میں اپنے خاندانی ماحول کی ذمہ داریوں سے مکمل طور پر آگاہ ہوتی ہیں انھیں اپنے شوہروں کی نظر میں مکمل طور پر قابل عزت واحترام ہونا چاہیے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

یعنی: ان کے ساتھ شائستہ طور پر معاشرت کرو اور حسن سلوک سے پیش آؤ" [1]

---

[1] سورہ نساء۔۱۹

کا حکم ایسی ہی عورتوں کے لئے ہے۔ بعض دوسری عورتیں اپنی خاندانی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی کرتی اور شوہر کے لئے درد سر کا باعث بنتی ہیں لیکن اس کی کوتاہیاں بہت سخت قسم کی نہیں لہٰذا وعظ و نصیحت کے باعث اپنی غلطی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ اور خوف خدا اور اپنے تقویٰ کے باعث راہ حق کی طرف پلٹنے میں تاخیر نہیں کرتیں؛ آیت مذکورہ بالا میں جملہ "فَعِظُوهُنَّ" درحقیقت انھیں کے لئے ہے۔

تیسری قسم کی عورتیں وہ ہیں جن کا نشوز اور نافرمانی زیادہ گہری اور عمیق ہوتی ہے، یہ عورتیں شوہر کی بے توجہی اور ناراضگی کی وجہ سے اپنی غلطی کا احساس کر لیتی ہیں اور اپنی روحانی لطافت کی وجہ سے شوہر کے خفیف قسم کے ردعمل کے نتیجے میں ان کی روح متاثر ہوتی ہے اور جلد ہی وہ صلح صفائی کو اپنا لیتی ہیں اور مذکورہ بالا آیت میں موجود یہ جملہ "وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ" گویا انھیں کے بارے میں ہے۔

فقط چوتھی قسم کی عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو شوہروں کے مقابلے میں سرکشی اور اپنی ذمہ داریوں کو پامال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں قانون شکنی کی راہ پر ہٹ دھرمی سے گامزن ہوتی ہیں اس قدر تقویٰ کی حامل بھی نہیں ہوتیں جو انھیں ایسے افعال کی انجام دہی سے روک سکے ان سے جدائی اور بے توجہی بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی اور انھیں راہ راست پر لانے کے لئے سوائے شدت و سختی کے کوئی چیز باقی نہیں بچتی۔

فقط یہی وہ مقام ہے جس میں اسلام نے شوہر کو بدنی تنبیہ اور ضرب کے ذریعے تعزیر کی اجازت دی ہے۔ اور یہ ایک ایسا عمل ہے جو شرقی وغربی (مشرقی اور مغربی) معاشروں میں موجود ہے یہاں تک کہ اعتراض کرنے والے بھی اس قسم کے حالات میں ایسے عمل سے استفادہ کرتے ہیں اور مذکورہ شرائط کی موجودگی میں ایسا سلوک کچھ عجیب بھی نہیں اور یہ کسی طرح بھی انسانی کرامت وعزت کے منافی نہیں۔

ثالثاً: یہ موضوع فقط عورتوں ہی کی ذات میں منحصر نہیں (ان ہی کے ساتھ خاص نہیں) بلکہ اگر مرد حضرات بھی اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کریں تو انھیں بھی ان چار مراحل کا سامنا کرنا پڑے گا یعنی پہلے پہل ضروری ہے کہ انھیں وعظ و نصیحت کی جائے (نصیحت کے کارگر نہ ہونے کی صورت میں) معنوی تعزیرات جیسے معاشرے میں ان سے بے توجہی اور بے اعتنائی برت کر انھیں غیر حقیقت پسندانہ روش سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے اور اگر یہ سب کچھ کارگر واقع نہ ہو تو لازم ہے کہ انھیں ضرب وغیرہ کے ذریعے سزا دے کر راہ راست پر لایا جائے، البتہ چونکہ یہ عمل عام طور پر عورتوں کے بس سے باہر ہوتا ہے اور مردوں کا عورتوں پر تسلط اس عمل کی بجا آوری میں رکاوٹ بنتا ہے۔

لہٰذا (حاکم شرع) کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے سرکش اور مجرمانہ روش کے حامل مردوں کو ان کی ذمہ داری سے آشنا کرے۔

مذکورہ بالا تین نکات کے پیش نظر ہم گمان نہیں کرتے کہ کوئی صاحب انصاف انسان اس فرمان پر اعتراض کرتے ہوئے اسے انسانی عزت و وقار کے منافی سمجھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان تین احکام کے فوراً بعد بلا فاصلہ قرآن یہ ارشاد فرماتا ہے:

"فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا"

یعنی: اگر وہ (عورتیں) اطاعت کریں اور راہ راست کی طرف واپس آ جائیں تو ان پر ظلم و تعدی نہ کرو۔

اسلام میں زندان کے احکام

اشارہ

جیسا کہ اس سے قبل تعریزات کی بحث میں ذکر کیا گیا ہے؛ ''زندان'' جرائم کی روک تھام کے لئے انجام دی جانے والی تعزیرات کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، علاوہ ازیں بسا اوقات ملزموں کو فرار سے روکنے اور مقروض لوگوں پر اپنے قرضے ادا کرنے کے لئے دباؤ ڈالنے کی خاطر انھیں گرفتار کرکے زندان میں رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی میں زندان کے احکام خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسلامی حکومت سے مربوط ابحاث کی تکمیل کی خاطر ان احکام کو بھی اشارۃً بیان کرنا ضروری ہے، اگرچہ اس بحث کا حق ادا کرنے کے لئے ایک علیحدہ کتاب بلکہ کئی کتابوں کی تالیف کی ضرورت ہے اور بعض اہل تحقیق نے اب تک اس سلسلے میں کئی کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔[1]

ا۔ زندان کی تاریخ

کوئی نہیں جانتا کہ تاریخ بشریت میں پہلا زندان کب تعمیر ہوا، اس لئے کہ اس مسئلے کا تعلق ان ایام سے ہے جب سالہا سال قبل انسان نے اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں قدم رکھا، جب سے حکومت کا قیام عمل میں آیا تو بظاہر یوں لگتا ہے کہ زندان بھی (حکومت کے ساتھ ہی) وجود میں آیا ہے بلکہ حکام کے علاوہ بھی ستمگر اور ظالم وجابر مالک (جاگیردار وغیرہ) اپنی رعایا کو تنبیہ کرنے کے لئے زندان بناتے تھے، یہاں تک کہ انھیں حیوانات کے قیام کی جگہ پر بھی قید کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔

اسلام میں زندان کی تعمیر سے متعلق مؤرخین کا اتفاق ہے کہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں کوئی زندان سرکاری طور پر موجود نہیں تھا، یہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ آپؐ اسے ناجائز سمجھتے تھے بلکہ اس کا بڑا سبب معاشرۂ اسلامی کی محدودیت اور عدم وسعت تھا اور خاص طور پر آغاز اسلام میں لوگ الٰہی قوانین کے زیادہ پابند تھے جبکہ ان کی خلاف ورزی کرنے والے کم ہی ہوتے تھے۔ لہٰذا قرآن میں کوئی جملہ تک ایسا نظر نہیں آتا جو یہ ظاہر کرے کہ اس زمانے میں زندان کا وجود تھا۔ لیکن زندان کے نہ ہونے کے باوجود ایسے مجرم جنھیں گرفتار کرکے ان کے جرم کی حقیقت معلوم کرنا ضروری ہوتا تھا یا وہ مقروض افراد جو قرضہ ادا کرنے کی استطاعت کے باوجود اسے ادا نہیں کرتے تھے یا وہ قیدی جو اسلامی جنگوں میں مسافروں کے ہاتھ لگتے تھے انھیں زیر نظر رکھنے کے لئے کئی دوسرے طریقے استعمال کئے جاتے تھے جن میں سے بعض کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

---

[1] اس سلسلے میں لکھی گئی کتابوں میں سے ایک ڈاکٹر شیخ احمد وائلی کی تالیف، احکام السجون، ہے جس کا فارسی میں ترجمہ ''احکام زندان'' کے نام سے آقائے بکائی تبریزی نے کیا ہے مذکورہ بالا ابحاث کے منابع اور مآخذ میں سے ایک مآخذ مذکورہ کتاب بھی ہے۔

۱۔بسا اوقات مجرم افراد کو مسجد کے کسی کونے میں قید کر دیا جاتا تھا اور چونکہ تالے وغیرہ کے نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو اس پر نگران کے طور پر مقرر کر دیا جاتا تھا تاکہ فرار نہ ہو جائے، یا اس کے ارد گرد ایک خط کھینچ دیا جاتا اور اسے تاکید کر دی جاتی کہ اس حصار سے قدم باہر نہ نکالے ورنہ وہ اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہوگا! اور وہ (مجرم) بھی خصوصی معاشرتی دلائل و وجوہات کی بناء پر اور اس وجہ سے کہ کہیں اس کا جرم زیادہ سنگین نہ ہو جائے، دائرے سے قدم باہر نہ رکھتا اور بعض روایات میں کلمہ ''ترسیم'' (خط کھینچنے) کے ساتھ تعبیر کرنے سے شاید اسی مطلب کی طرف اشارہ ہو۔

۲۔دالان میں قید کرنا؛ اس لئے کہ اکثر گھروں میں گھر کے دروازے اور صحن کے درمیان دالان ہوتے تھے اور بسا اوقات صحن کی داخلی جانب بھی ایک دروازہ ہوتا تھا اور دونوں دروازوں کے بند ہونے کی صورت میں دالان عملی طور پر، زندان میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

۳۔خود گھر، ایک قسم کا زندان ہوتا تھا، چنانچہ قرآن حکم دیتا ہے کہ بدکار عورتوں کو گھروں میں قید کریں یہاں تک کہ وہ موت سے ہمکنار ہو جائیں۔ (سورۂ نساء/۱۵) البتہ یہ حکم زنا کاروں کی حد کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے اور حدّ کے نزول کے ساتھ ہی یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا۔

۴۔ساتھ ساتھ رکھنا؛ یہ بھی زندان ہی کی ایک صورت تھی یعنی قرض خواہ مقروض با استطاعت کو جدھر جاتا اپنے ساتھ لے جانا، اور جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیتا اسے اپنے آپ سے جدا نہ کرتا۔

۵۔اسیروں (قیدیوں) کی غلامی کا مسئلہ؛ یہ مسئلہ بھی زندان کا قائم مقام ہے، جس کے احکام اسلامی فقہ میں تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔البتہ یہ زندان کی بالکل ابتدائی اور سادہ شکلیں تھیں اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کی وسعت زندگی کی پیچیدگی اور مجرم افراد کی تعداد میں اضافے کے باعث اس کی شکل وصورت بہت حد تک بدل گئی اور زندان ایک مخصوص عمارت کی صورت میں وجود میں آ گیا، اگرچہ دوسرے ممالک میں صدیوں پہلے زندان مکمل صورت میں موجود تھے۔

سب سے پہلا زندان خلیفۂ دوم کے زمانے میں قائم ہوا

اگرچہ بعض مؤرخین اس بات پر مصر ہیں کہ پہلے تین خلفاء کے زمانے میں زندان، یعنی؛ وہ خاص مقام جہاں مجرموں کو پابند رکھا جائے، موجود نہیں تھا اور فقط امیر المؤمنین علیؑ کے زمانے میں زندان قائم ہوا، لیکن یہ دعویٰ ان بہت ساری روایات کے منافی ہے جو یہ کہتی ہیں کہ خلیفہ دوم پہلی شخصیت ہے جس نے زندان قائم کرنے کا اقدام کیا۔اس کا شاہد وہ مطلب ہے جسے ''ابن ھمان'' نے فقۂ حنفی کے بارے لکھی گئی کتاب ''شرح فتح الغدیر'' میں بیان کیا ہے، وہ نقل کرتے ہیں: ''رسول اکرمؐ اور خلیفۂ اول کے دور میں زندان کا کوئی وجود نہیں تھا اور مجرم افراد کو مسجد یا گھر کے دالان میں قید کیا جاتا تھا یہاں تک کہ خلیفہ دوم نے مکہ میں چار ہزار درہم کا ایک گھر خرید کر اسے زندان قرار دیا۔(شرح فتح الغدیر، ج۵، ص۴۷۱)

خلیفۂ دوم کا مکے میں گھر خریدنے کا تذکرہ، بعض دوسری کتب مثلاً النظم الاسلامیۃ اور الجنایات المتحدہ بین القانون والشریعۃ

میں بھی آیا ہے۔ان سب حضرات نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ خلیفہ دوم نے یہ گھر مکہ کے ایک سردار ''صفوان بن امیہ'' سے خریدا تھا، ابواسحق شیرازی نے کتاب المھذ ب میں جوفقہ شافعی کے مطابق لکھی گئی ہے، میں خلیفہ دوم کی گھر کی خریداری اور پھر اسے زندان میں تبدیل کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔[1]

اس امر کا ثبوت یہ بھی ہے کہ خلیفہ دوم کے زمانے میں بعض شعراء کچھ مسائل کوشعر کی زبان میں ادا کرتے جوخلیفہ کو پسند نہ آتے یا خلاف شرع ہوتے تھے اوراس پر حضرت عمران شعراء کوزندان میں ڈالنے کا حکم دیتے تو وہ شعراء زندان سے کچھ اشعار لکھ کر خلیفہ کو بھیجتے جو ان کی بے گناہی اور عذرخواہی پر مشتمل ہوتے تھے، مجموعی طور پر یہ عمل بھی اس بات کا زندہ گواہ ہے کہ خلیفہ دوم کے زمانے میں زندان موجود تھا۔ان میں سے ایک شاعر حطیئہ نامی بھی تھا، حضرت عمر نے اسے زندان میں قید کررکھا تھا، اس نے یہ دوشعر کہے اورانھیں حضرت عمر کے پاس کسی طرح بھجوادیا:

ماذا تَقُولُ لأَفْراخٍ بِذِی مَرَخٍ
حُمْرالْحَواصِلِ لاماءٍ وَلاشَجَر!
اَلْقَیْتَ کاسِبَهُمْ فی قَعْرِمُظْلَمَةٍ
فَارْحَمْ عَلَیْكَ سَلامُ اللهِ یاعُمَر!

وہ ان اشعار میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی زبوں حالی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتا ہے: ''سرخ پوٹوں والے چوزے جوذی مرخ کے مقام پر بغیر پانی اور درخت کے پڑے ہیں توان کے بارے میں کیا کہے گا؟! تونے ان کی روٹی کمانے والے کوتاریک گہرائی میں پھینک دیاہے، اوران پر رحم کر تجھ پر خدا کا سلام ہواے عمر!''

خاص طور پر ''قعر مظلمۃ'' (تاریک گہرائی) کے الفاظ سے بخوبی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ زندان تنگ وتاریک تھا یعنی کال کوٹھڑی تھی۔بعض اورقرائن بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ اس قسم کا زندان اس زمانے میں موجود تھا کیونکہ اسلامی ممالک کے بے پناہ وسیع وعریض ہونے سے طبیعی بات ہے کہ جرائم میں بھی اضافہ ہوتا ہوگا ایسی صورتحال میں یہ تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ مجرم افراد کوزیر نظر رکھنے کے لئے اصلاً کوئی زندان ہی موجود نہ تھا۔

امیرالمؤمنین علیؑ کے دور میں زندان

ان لوگوں کی رائے میں، جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر کے زمانے میں زندان کا کوئی نام ونشان نہیں تھا اوراس کے برعکس وہ جن کا اصرار ہے کہ زندان اس دور میں موجود تھا، ان دونوں قسم کی آراء کے درمیان توافق اوراتفاق کی واحد صورت یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت

---

[1] المھذاب، ج ۲،ص ۲۹۴

عمر نے زندان کی تعمیر کا اقدام نہیں کیا اور چار ہزار درہم کے بدلے صفوان بن امیہ سے خریدے جانے والے مکان سے بطور زندان استفادہ کیا، لیکن جناب امیر المؤمنین علیؑ کے دور میں آپؑ نے ذاتی طور پر زندان کی تعمیر کا اقدام کیا (تاکہ اہل زندان کے انسانی حقوق کا بہتر طور پر لحاظ رکھنے کے ساتھ ساتھ زندان دے ان کے فرار کا راستہ روکا جا سکے)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ نے پہلا زندان چٹائیوں سے بنایا جس میں روشنی اور ہوا کا بآسانی گذر ہوتا تھا اور اس کا نام ''نافع'' رکھا (شاید یہ نام رکھنے سے غرض یہ ہو کہ یہ زندان اخلاقی اعتبار سے مجرموں کی روح پر اثر انداز ہو اور اس طرح ان کی جلد اصلاح ہو سکے) لیکن اس کی وضع وقطع سے سوء استفادہ کیا گیا اور چور وغیرہ اس کی دیواروں میں سوراخ کر کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ناچار امامؑ نے مٹی سے ایک مضبوط زندان تعمیر کرایا اور اس کا نام ''مُخَیِّس'' رکھا۔

جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ خلیفہ دوم کے دور میں اسلامی ممالک کی سرحدیں اتنی پھیل چکی تھیں کہ مجرموں کے لئے زندان کے بغیر اس روز کے معاشرے کا نظام چلانا ناممکن تھا، اور ظاہری طور پر اس موضوع سے انکار پر اصرار کا تعلق سیاسی مسائل اور قومی تعصّبات سے ہے ورنہ اس پر تاریخ بھی گواہ ہے اور قرائن بھی۔

بہر حال اس زمانے میں زندان ایک ایسی جگہ ہوتی تھی جہاں اہل جرم اور با استطاعت مقروضین وغیرہ کو رکھا جاتا تھا اور سیاسی مخالفین کو ہرگز قید نہیں کیا جاتا تھا اور جب کبھی (سیاسی مخالفین) کا وجود ناقابل برداشت سمجھا جاتا انھیں جلا وطن کر دیا جاتا، چنانچہ حضرت ابوذر کی داستان سے کم وبیش سبھی آگاہ ہیں کہ جب خلیفہ سوم اور ان کے ارد گرد منڈلانے والوں کو ابوذر کی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مشتمل گفتگو پسند نہ آئی اور وہ لوگ اسے برداشت نہ کر سکے تو انھیں ایک بے آب وگیاہ مقام کی طرف جلا وطن کر کے بھیج دیا جس کا نام ''ربذہ'' ہے اور جناب ابوذر اسی بدترین آب وہوا کے مقام پر دار فنا سے دار بقا میں منتقل ہو گئے اور خدا کے جوار رحمت میں جگہ پائی۔

لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بنی امیہ کے دور حکومت میں زندان کی کیفیت بالکل ہی بدل گئی اور وہ سیاسی مخالفین، جائز اعتراض کرنے والوں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں کا مرکز بن گیا۔

۲۔زندان کی اقسام اور فلسفہ

آزادی کے ساتھ انسان کے عشق کا سرچشمہ، ترقی وتکامل کے ساتھ اس کا عشق ہے کیونکہ کوئی موجود قید وبند میں پے درپے، کمالات کے حصول کے لئے کوئی حرکت انجام نہیں دے سکتا، یہاں تک کہ حیوانات بھی قفس سے رنجیدہ ہوتے ہیں اگر چہ ان کی زندگی کے تمام وسائل وہاں فراہم ہوں اور وہ آزاد ہونے کو قفس کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں، اگر چہ قفس سے باہر انھیں کیسے ہی خطرات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ جاندار جو پنجرے میں بند ہوتے ہیں نہ ان کے سر میں کوئی جوش وخروش، نہ گلے میں کوئی صدا اور نہ بدن میں کوئی ہیجان ہوتا ہے مگر یہ کہ ان کی پیدائش ہی قفس (پنجرے) میں ہوئی ہو اور وہ آزادی کے ذائقے سے ناآشنا ہوں۔ اگر حیوانات میں یہ مسئلہ ایک پوشیدہ غریزے کی صورت میں ہے تو انسان میں یہ جذباتی ادراک اس کے عقلی ادراک کے مناسب ہے اور وہ عقل

ودلیل کے ذریعے اپنی آزادی کو طلب کرتا ہے، بالکل اسی وجہ اور اسی دلیل کے باعث زندان اور آزادی سے محرومی انسان کے لئے سخت ترین سزا ہے۔

بلاشبہ پوری ظالمانہ تاریخ میں زندان، خودغرض، کینہ توز اور انتقام جو افراد کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں تا کہ وہ اس ذریعے سے اپنے ناجائز مقاصد پورے کرسکیں، لیکن یہ سب کچھ زندان کے حقیقی فلسفے اور مجرمانہ ذہنیت کے حامل افراد کی اصلاح کے مثبت نتائج اور معاشرتی فساد کے ساتھ مقابلے کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ آزادی سے محرومی، زندانی افراد پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے ایک بھاری پتھر کی طرح ہے تا آنکہ مندرجہ ذیل دس اہداف میں سے کوئی ایک وقوع پذیر ہو:

i-ایذائی وعقوبتی زندان

اس قسم کے زندان عام طور پر ان افراد کے لئے ہوتے ہیں جو کسی جرم کے مرتکب ہوئے ہوں انھیں آزادی سے محروم کیا جاتا ہے تا کہ وہ اپنے اعمال کی برائی کی طرف متوجہ ہو کر آئندہ اس قسم کے اعمال سے اجتناب کریں، اسی طرح دوسرے بھی عبرت حاصل کریں۔ زندان کی یہ قسم زمانہ قدیم سے لے کر اب تک رائج رہی ہے اور ہر حکومت کے (چند مستثنیٰ صورتوں کے علاوہ) ایسے زندان رہے ہیں۔

ii-اصلاحی زندان

زندان کی یہ قسم ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے جو کسی بری عادت کے اسیر ہوں (مثلاً نشہ آور اشیاء کے استعمال کے عادی افراد) اور وعظ ونصیحت اور تعلیمات ان پر کوئی اثر نہ کریں، اس صورت میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ انھیں معاشرے کے دیگر افراد سے جدا کر کے ایک مختصر یا طویل مدت کے لئے زندان میں رکھا جائے تا کہ ان کی اصلاح ہو اور وہ منشیات کے استعمال کو ترک کردیں۔

iii-احتیاطی زندان

کوئی اہم حادثہ مثلاً قتل کسی جگہ رونما ہوتا ہے اور واقعی قاتل کا پتہ بھی نہیں چلتا، لیکن ایک فرد یا کئی افراد اس قتل کے ملزم ہوتے ہیں، بلاشبہ اصلی قاتل کا پتہ چلایا جانا ضروری ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ ملزم قتل راہ فرار اختیار کرے اور جرم کے ارتکاب کے کافی شواہد کے ثابت ہونے کے بعد، اس تک دسترسی حاصل نہ ہو۔ ایسی صورت میں قتل کے ملزم یا ملزمان کو وقتی طور پر گرفتار کرلیا جاتا ہے، تحقیق کے بعد اگر وہ بے گناہ ثابت ہوں تو معذرت کے ساتھ انھیں آزاد کردیا جاتا ہے اور جرم ثابت ہونے کی صورت میں اپنے جرم کا بدلہ پاتے ہیں۔ اس قسم کے زندان بھی تقریباً ہر جگہ رائج ہیں۔ واضح سی بات ہے کہ اگر ملزم درحقیقت بے گناہ ہو تو جلد از جلد اس کے بارے میں تحقیقات کرائی جائیں اور اس کی گرفتاری کا عرصہ جس قدر ممکن ہو مختصر ہونا چاہیے۔

iv- تادیبی زندان

اس قسم کا زندان زیادہ تر بچوں کے لئے ہوتا ہے جن پر قانون لاگو نہیں ہوتا، لیکن اگر انھیں کھلی آزادی دے دی جائے تو وہ اس سے سوء استفادہ کر کے گمراہی کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے بعض جرائم کی وجہ سے انھیں زندان میں ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ ادب سیکھیں اور تربیت حاصل کر سکیں۔

v- سیاسی زندان

عام طور پر سیاسی قیدی ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کی سیاسی سرگرمیاں معاشرے کی مصلحت اور موجود نظام کے خلاف ہوں، کبھی وہ معاشرے کی مصلحت کے خلاف نہیں ہوتیں بلکہ اس کے حق میں ہوتی ہیں لیکن وہ خودغرض حکومت کی مصلحتوں کے مطابق نہیں ہوتیں (جیسے آج کی دنیا کے اکثر ممالک میں مخالفین کو اگرچہ وہ حق پر ہوں قید کر دیا جاتا ہے)۔

vi- استحقاقی زندان

استحقاق سے یہاں مراد حق وصول کرنا ہے، مثلاً اگر کوئی کسی کا مقروض ہے اور یہ مقروض قرض کی ادائیگی کی طاقت رکھنے کے باوجود اس کی ادائیگی نہیں کرتا تو اس صورت میں مقروض شخص کو قید کر کے زندان میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اس پر دباؤ ڈالا جائے جس کے نتیجے میں وہ طلبگار یعنی قرض خواہ کا حق لوٹانے پر آمادہ ہو جائے، البتہ اس مقام پر جونہی وہ قرض کی ادائیگی پر آمادہ ہوتا ہے، اُسے آزاد کر دیا جائے گا، کیونکہ اسے زندان میں رکھنے کا مقصد اور ہدف پورا ہو چکا ہے۔

vii- حفاظتی زندان

زندان کی یہ قسم شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتی ہے اور ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے جن سے لوگ بہت تنگ ہوتے ہیں ایسے لوگ اگر آزاد چھوڑ دیئے جائیں تو لوگوں کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے حالانکہ اگر یہ (ذہنی مریض قسم کے افراد) کسی جرم کے مرتکب بھی ہوں تو قتل کے مستحق نہیں ہوتے، اس صورت میں حکومت جو لوگوں کی جان اور مال کی محافظ ہوتی ہے لوگوں کے غصے کی آگ کو بجھانے کے لئے اس قسم کے افراد کو ایک عرصے کے لئے زندان کی چار دیواری میں منتقل کرتی ہے تاکہ وہ نئے ماحول کے عادی ہو جائیں اور خطرہ ٹل جانے کی صورت میں آزاد کر دیئے جاتے ہیں، البتہ جیسے ہم نے کہا ہے کہ اس قسم کے زندان بہت کم ہوتے ہیں اور عام طور پر معاشرتی انقلابوں، طوفانوں اور عمومی ہیجانی کیفیات میں جنم لیتے ہیں۔

مذکورہ بالا سات اقسام کے زندان ایک معقول مقصد اور فلسفے پر مشتمل ہیں۔ اس معقول فلسفے کے مقابلے میں زندان کے غیر معقول اور ظالمانہ فلسفے اور اہداف کے محرکات بھی وجود رکھتے ہیں جو آج اور کل کی دنیا میں موجود اکثر زندانوں کے اصلی عوامل و اسباب ہیں۔

اس ضمن میں چند اقسام کا نام لیا جاسکتا ہے جن کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

۱۔ انتقامی زندان

یہ ایک ایسا زندان ہوتا ہے جس کا کوئی معقول مقصد نہیں ہوتا اور ظالم و جابر حکمران اپنی رعایا کے بعض آزاد لوگوں یا بعض خاص لوگوں سے کینہ اور ناحق عداوت کی بنا پر انھیں زندان میں ڈال دیتے ہیں اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ زندان میں اتنی طولانی مدت گذارتے ہیں کہ اس کے دوران ہی وہ موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

۲۔ مقاومت کو ختم کرنے کے لئے بنائے جانے والے زندان

ظالم و جابر حکمران، حق و عدالت کے لئے قیام کرنے والے افراد کی روحانی اور جسمانی جدو جہد کو ختم کرنے کے لئے انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لئے زندان کے سپرد کر دیتے ہیں، اور کبھی زندان میں ایسے افراد کے ساتھ حقارت آمیز اور ظالمانہ سلوک کے علاوہ انھیں روحانی اور جسمانی طور پر سخت اذیتوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے، واضح ہے کہ حق کے مطابق قیام کرنے والے افراد ایسے امتحان و آزمائش سے صحیح و سالم طور پر باہر بلکہ گاہے کندن بن کر سامنے آتے ہیں اور ان کی قوت قیام میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

بالکل فولاد کی طرح جو مزید سخت ہونے کے لئے بھٹی میں ڈالا جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس ضعیف اور گاہے متوسط افراد پر یہ زندان منفی اثر ڈالتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ آزادی کے بعد اپنا راستہ تبدیل کر لیتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اہل ظلم و جور کے لئے آلۂ کار بن جاتے ہیں کیونکہ زندان میں ان پر خصوصی کام ہو چکا ہوتا ہے۔

۳۔ راہنماؤں سے رابطہ ختم کرنے کے لئے قائم شدہ زندان

یہ زندان مذہبی اور سیاسی راہنماؤں کے لئے خاص ہوتے ہیں کیوں کہ جب اہل جور و ستم حکمران ان کے مقابلے سے عاجز ہو جاتے ہیں تو ان راہنماؤں کا اپنے پیروکاروں سے رابطہ منقطع کرنے کے لئے انھیں (راہنماؤں کو) زندان میں مقید کر دیتے ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ زندان اکثر الٹا نتیجہ دیتے ہیں اور پیروکار افراد کو مزید متحد اور رہبروں کو زیادہ محترم، زیادہ باعظمت اور زیادہ معروف بنا دیتے ہیں۔

۴۔ مزاحمت کو برطرف کرنے کے لئے قائم کردہ زندان

کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ کوئی مرد عالم، دانشور اور سائنسدان یا کمانڈر؛ مختصر یہ کہ کوئی لائق شخص ارباب اقتدار کی خود غرضی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، ایسے افراد کو زندان کی نذر کر دیا جاتا ہے تا کہ آسودگی کے ساتھ اور کسی مزاحم کی مزاحمت کے بغیر اپنی خود غرضی پر مشتمل خواہشات کی تکمیل کی جاسکے۔ یہاں تک کہ تاریخ میں ایسے ظالم اور بدنما اہل جور و ستم کا تذکرہ بھی موجود ہے جو خوبصورت بیویوں کے شوہروں کو قید میں ڈال دیتے تھے تا کہ ان کی بیویوں پر قبضہ کر سکیں!

۵۔ پاک و پاکیزہ لوگوں کے لئے زندان

تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب وہ زندان ہیں جو بے گناہ اور پاکیزہ افراد کے لئے بنائے جاتے رہے ہیں اور تسلیم کرنا چاہیے کہ گناہوں سے آلودہ اور شرمناک ماحول میں بے گناہی سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں؛ ایسے معاشرے میں پاکدامنی ایک بڑا عیب شمار ہوتی ہے اس لئے کہ یہ پاکدامنی اہل گناہ کے منصوبوں پر پانی پھیر دیتی ہے پوری تاریخ میں یوسفؑ جیسے افراد ظالم و جابر حکمرانوں کے زندان میں پابند سلاسل رہے ہیں اور وہ فقط اس لئے کہ ان افراد کی خواہش صرف یہ تھی کہ وہ پاک پاکیزہ رہیں۔ شاعر اس بارے میں کہتا ہے:

بی گناہی کم گناہی نیست دردیوان عشق
یوسف ازدامان پاک خودبہ زندان رفتہ است

یعنی: بے گناہی دیوان عشق میں کوئی کم گناہ نہیں کیونکہ یوسفؑ اپنی پاکدامنی کے باعث زندانی ہوئے۔

واضح ہے کہ اس قسم کے زندان جو ہر قسم کے عقلی و شرعی فلسفے سے محروم ہیں ہمارے موضوع سخن سے خارج ہیں، فقط ایک ضروری وضاحت کی خاطر اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۳۔ قرآنی نقطہ نگاہ سے زندان

یقیناً زندان کے لئے مذکورہ اہداف میں سے اکثر اہداف معقول اور قابل تصور ہیں؛ درحقیقت ان اہداف و مقاصد کے پیش نظر زندان ایک معاشرتی ضرورت ہے چاہے وہ مجرموں کی سزا، ان کی اصلاح و تادیب، خطرات کی برطرفی اور سرچشمۂ فساد کو ختم کرنے کی خاطر ہو یا ان کے علاوہ بعض دوسرے مقاصد کے لئے ہو، قرآن مجید میں بھی اس مطلب کو متعدد اشارات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

البتہ عربی زبان اور قرآن و سنت میں زندان کے ہم معنی الفاظ بکثرت موجود ہیں، جن میں سے بعض واضح طور پر زندان کے ہم معنی جبکہ بعض قابل بحث و گفتگو ہیں۔ ان الفاظ میں سے ایک لفظ "سجن" ہے جو سورۂ یوسف کی نو آیات میں حضرت یوسفؑ کی قید کی مناسبت سے ہے (کبھی بصورت سجن اور کبھی اس کے مشتقات کی صورت میں) استعمال ہوا ہے اور ایک مقام پر سورۂ شعرا میں فرعون کی داستان میں بھی نظر آتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ و سجن (زندان) کی دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے:

لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾

یعنی: "(اے موسیٰؑ) اگر تم نے میرے علاوہ کسی کو اپنا معبود تسلیم کیا تو میں تمہیں اہل زندان میں سے قرار دوں گا۔"[1]

اس بیان سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ موسیٰؑ اور فرعون حتیٰ کہ اس سے قبل یوسفؑ اور عزیز مصر کے زمانے میں بھی حقیقی معنوں میں زندان موجود تھا جس میں گنہگار اور بے گناہ افراد کو قید کیا جاتا تھا، اس طرح کہ وہ سالہا سال زندان میں پڑے رہتے اور بھلا دیئے

[1] سورہ شعراء۔ ۲۹

جاتے تھے۔ دوسرا لفظ "حبس" جو قرآن میں دو دفعہ استعمال ہوا ہے، لیکن زندان کے معنی میں نہیں لیکن احادیث میں بطور وسیع اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔[1]

لفظ "امساك" قرآن میں فقط ایک مقام میں وارد اور زندان کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق زنا کار عورتوں سے ہے جو زنا کی حدّ کے نزول سے پہلے کا حکم تھا، یہ تعبیر سورۂ نساء کی آیت ۱۵ میں ہے جس کی تفصیل بعد میں ذکر کی جائے گی۔ لفظ "نفی" (یعنی سرزمین سے جلا وطن کر دینا) سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳ میں آیا ہے جس کی تفسیر بعض حضرات نے زندان سے کی ہے۔ اسی طرح لفظ "ارجاء" ہے جو سورۂ اعراف کی آیت ۱۱۱ میں موسیٰؑ اور فرعون کے قصے میں آیا ہے، بعض حضرات کی رائے میں "ارجاء" سے مراد زندان میں قید کرنا ہے اس وجہ سے کہ فرعون کے درباریوں نے اسے جناب موسیٰؑ اور ہارونؑ کو جادوگروں کے جمع ہونے تک زندان میں قید کرنے کا مشورہ دیا تھا:

"قالُوا اَرْجِهْ وَ اَخاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدائِنِ حاشِرِينَ"

یہی معنی تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ شعراء کی آیت ۳۶ میں بھی نظر آتا ہے:

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾

لیکن اکثر مفسرین نے "ارجاء" کی اس معنی میں تفسیر نہیں کی بلکہ ان کی رائے میں اس کا مطلب مؤخر کرنا اور تاخیر میں ڈالنا ہے، فرعون کے مقابلے میں جناب موسیٰؑ کا معجزوں کو ظاہر کرنا اور فرعون کا جادوگروں سے مقابلے کا پروگرام تشکیل دینا وغیرہ کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو بہت بعید نظر آتا ہے کہ وہ انھیں زندان میں قید کرنے کا حکم دے۔

بہرحال جو چیز مسلم ہے یہی ہے کہ قرآن میں ایک مقام ایسا ہے جس میں زندان کا حکم نظر آتا ہے اور جسے "امساك" کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے (جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں بھی اشارہ کیا گیا ہے) ارشاد ربانی ہے:

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾

یعنی: اور تمہاری عورتوں میں سے جو زنا کی مرتکب ہوں ان پر چار مسلمان گواہوں کو طلب کرو اگر وہ ان کی بدکاری کی گواہی دے دیتے ہیں تو ان عورتوں کو اپنے گھروں میں روکے رکھو یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا خدا تعالیٰ ان کے لئے کوئی راہ قرار دے۔[2]

---

[1] ان احادیث کے بارے میں بیشتر اطلاع کیلئے میزان الحکمۃ، ج ۲، ص ۲۲۶ تا ۲۵۱ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کتاب میں ان لوگوں کے بارے میں جن کو حبس کرنا جائز ہے اور ان کے بارے میں جنہیں ابدی قید کی سزا دی گئی ہے اور اسی طرح قیدیوں کے حقوق اور حرمت کو تفصیلاً مختلف ابواب میں ذکر کیا گیا ہے۔

[2]

مفسرین کے درمیان مشہور یہی ہے کہ یہ آیت ان عورتوں کی سزا کے بارے میں ہے جو زنا کی مرتکب ہوتی تھیں۔ یہ حکم حدّ زنا کے نزول سے پہلے کا ہے اور اس آیت میں ان کے لئے ابدی زندان کی سزا بیان کی گئی ہے، اگر چہ یہ حکم بعد از اں تازیانے اور سنگسار کے حکم میں تبدیل ہو گیا۔

''فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّى يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ''

یعنی: ''انھیں گھروں میں پابند رکھو یہاں تک کہ انھیں موت آجائے''

اس جملے میں اگر چہ زندان کا کوئی ذکر نہیں لیکن گھروں میں بند رکھنا وہ بھی ساری زندگی، زندان ابدی ہی کے مشابہ ہے۔ فقط اسی ایک مقام پر قرآن میں حکم زندان نظر آتا ہے۔

۴۔ روایات میں زندان میں ڈالنے کے مواقع

روایات میں ابدی اور غیر ابدی زندان کے متعدد مقامات بیان کئے گئے ہیں، جن میں سے بعض کی تفصیل یہ ہے:

ا۔ قتل میں مدد اور معاونت:

اگر کوئی شخص کسی کو پکڑ کر رکھے اور کوئی دوسرا اسے قتل کرے تو اس صورت میں فقہ اسلامی کی رو سے قتل کرنے والے کی سزا موت اور پکڑنے والے کو ہمیشہ کے لئے زندان میں قید کیا جائے گا۔ یہ حکم ہمارے فقہاء کے مابین اتفاقی واجماعی ہے اور معتبر منابع اور مآخذ میں منقول روایات بھی اس حکم کی تائید کرتی ہیں۔ حضرت علیؑ سے مروی ایک حدیث میں ان دو افراد کے بارے میں، جن میں سے ایک کسی کو پکڑتا اور دوسرا قتل کرتا ہے، آپؑ نے یہ فیصلہ دیا:

''يُقْتَلُ الْقَاتِلُ وَ يُحْبَسُ الآخِرُ حَتّى يَمُوتَ غَمّاً كَما حَبَسَهُ حتّى ماتَ غَمّاً''

یعنی: ''قاتل کو قتل کر دیا جائے اور دوسرے (پکڑنے والے) کو محبوس (قید) کیا جائے یہاں تک کہ غم واندوہ سے مرجائے جس طرح اس نے مقتول کو پکڑا تا کہ وہ غم واندوہ کی حالت میں مرجائے۔''[1]

۲۔ قتل کا حکم دینا:

فقہ اسلامی کے مطابق اگر کوئی کسی دوسرے کو کسی بے گناہ کے قتل پر مجبور کرے یہاں تک کہ حکم عدولی کی صورت میں اسے قتل کی دھمکی دے اس مامور کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی بے گناہ کو قتل کرے، اس لئے کہ جب مسئلہ قتل وخون کا ہو تو اس صورت میں تقیہ جائز نہیں؛ ''وَالْمأمُورُ مَعْذُور'' (مأمور مجبور ہوتا ہے) اس مقام پر ایک بے بنیاد بات ہے۔ ایسی صورت حال میں اگر کوئی شخص حکم اسلامی کو

---

[1] وسائل الشیعہ، ۱۹ حدیث ا، باب ۱۷، ابواب قصاص النفس۔

اہمیت نہ دیتے ہوئے اس ظالم شخص کی دھمکی کے باعث کسی بے گناہ کو قتل کر دے تو اس کے بارے میں اسلامی فرمان یہ ہے کہ قاتل کو قصاص کی بنا پر قتل اور اس کا حکم دینے والے کو ہمیشہ کے لئے زندان میں قید کیا جائے! امام محمد باقرؑ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا:

"یُحْبَسُ الآمِرُ بِقَتْلِهِ حَتّٰی یَمُوتَ"

یعنی قتل کا حکم دینے والے کو زندان میں بند کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ موت سے ہمکنار ہو۔[۱]

۳۔تکرار سرقت:

بار بار چوری کرنے کی صورت میں حکم یہ ہے کہ تیسری دفعہ چوری کرنے پر چور کو دائمی قید کی سزا دی جائے، اس حکم کو بزرگ علماء نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے۔[۲]

۴۔مرتد فطری عورتیں:

اگر مرتد فطری عورتیں توبہ کرنے کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان کے بارے میں بھی زندان میں دائمی قید کا حکم ثابت ہے۔ امام محمد باقر -اور امام جعفر صادق -سے مروی روایت میں ہے:

"وَالْمَرْئَةُ اِرْتَدَّتْ عَنِ الْاِسْلاَمِ اُسْتُتِیبَتْ، فَاِنْ تَابَتْ وَاِلاَّ خُلِّدَتْ فِی السِّجْنِ"

یعنی: مرتد عورت کو توبہ کرنے کو کہا جائے گا، اگر اس نے توبہ کر لی تو ٹھیک اسے آزاد کر دیا جائے گا ورنہ زندان میں دائمی قید بھگتے گی۔[۳]

زندان میں ابدی قید کی چند اور صورتیں بھی ہیں جن کی تفصیل کے لئے فقہی کتب کا مطالعہ ضروری ہے۔ وقتی زندان جو تعزیری پہلوؤں پر مشتمل ہوتے ہیں ان کی صورتحال بالکل مختلف ہے، ان کا انحصار جرم، مجرم کی قوت برداشت اور کچھ دوسری شرائط پر ہے۔ قتل کے ملزمان جبکہ ان کے فرار کا خوف ہو اور وہ شخص جو قاتل کو قتل کا جرم ثابت ہونے کے بعد فرار ہونے میں مدد دے، وہ حاملہ عورت جس کا زنا ثابت ہو چکا ہو اور اس کے فرار کا بھی امکان ہو جبکہ وضع حمل اور اس پر حدّ جاری کرنے تک ضروری ہے کہ اسے زندان میں رکھا جائے، ایک محفوظ جگہ سے جو شخص چوری کرے، وہ مقروض جو ادائیگی کی طاقت کے باوجود اپنا قرض ادا نہ کرے، ایسا شخص جو جھوٹی گواہی دے، وہ شخص جو کسی ایسے مجرم کی سرپرستی کرے جس کا جرم مدعی کے حاضر ہوتے ہی ثابت ہو جائے، اور بالآخر وہ لوگ جو منکرات کے مرتکب ہوئے ہوں اور زندان میں قید کئے بغیر ان منکرات کے ترک پر آمادہ نہ ہوں، ایسے سارے افراد عارضی قیدی شمار ہوتے ہیں۔

---

[۱] وسائل الشیعہ، ۱۹ حدیث ۱، باب ۱۳، ابواب قصاص النفس۔

[۲] وسائل، ج ۱۸، ص ۴۹۲، باب ۵، ابواب حد السرقہ۔

[۳] وسائل، ج ۱۸، ۵۴۹، باب ۴، ابواب حد المرتد، حدیث ۶۔

۵۔قیدیوں کے ساتھ انسانی سلوک

جیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ پوری تاریخ میں موضوع زندان سے بے پناہ سوء استفادہ کے باوجود زندان اجتماعی اور انسانی نقطۂ نظر سے جرائم کی روک تھام اور تربیت افراد کے لئے نہایت ضروری ہے لیکن درست شرائط وحدود کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔قید کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اہل زندان کے حق میں انسانی حقوق کا خیال رکھا جائے اور ان کے ساتھ ایک انسان جیسا سلوک کیا جائے ان پر ظالمانہ پابندیاں عائد نہ کی جائیں۔

کسی کو کسی اور کے گناہ کی پاداش میں اسیر نہ کیا جائے،کوئی قیدی اپنے استحقاق سے حتیٰ کہ ایک گھنٹہ بھی زیادہ زندان میں نہ رکھا جائے تمام پروگرام قیدی کی تعلیم وتربیت کے طور پر انجام پائیں،دوسرے لفظوں میں زندان کو مجرموں کی پرورش اور انتقام جوئی کا مرکز ہونے کی بجائے ایک تربیتی مرکز ہونا چاہیے اور ضروری ہے کہ اس تربیتی مرکز کی خصوصیات بھی اس کے اندر موجود ہوں۔

حضرت یوسف -کے قصے میں مصر میں ان کے قیدی ہونے سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ یہ زندان اس قدر ظالمانہ ہوتے تھے کہ بعض اوقات قیدی ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی اسی میں گذار دیتے اور فراموش کر دیئے جاتے اور فقط کسی غیر متوقع حادثے کے رونما ہونے کی صورت میں ہی ظالم حکمرانوں کو قید میں پڑے ہوئے مظلوم قیدی یاد آ جاتے اس طرح کا حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں آخر عمر تک زندان ہی میں پڑے رہتے۔

اگر یوسفؑ تعبیر خواب کا علم نہ جانتے ہوتے اور فرعون مصر بھی وہ معروف خواب نہ دیکھتا اور اس کی تعبیر کے لئے ایک آزاد شدہ قیدی کی وساطت سے حضرت یوسف -کے دامان میں پناہ نہ لیتا تو آپؑ بھی شاید آخر عمر تک قید میں ہی رہتے،حالانکہ یوسف -کسی گناہ کے مرتکب بھی نہیں ہوئے تھے،ان کا گناہ صرف تقویٰ اور عزیز مصر کی زوجہ زلیخا کے ہوس پر مشتمل تقاضے سے انکار تھا،البتہ ناپاک اور گناہ آلود ماحول میں پاکیزگی اختیار کرنا کوئی کم گناہ نہیں!

قرآن فرماتا ہے:یوسف -کی بھرپور کوشش تھی کہ وہ زندان کے ماحول کو تعلیم وتربیت کے مرکز میں بدل ڈالیں،جس میں قیدیوں کی اصلاح ہو اور انھیں توحید وخدا پرستی کی تعلیم دی جائے کیونکہ توحید ہی ہر نیکی و پاکیزگی کی اصل اور سرچشمہ ہے اگر وہ لوگ (قیدی) حضرت یوسف -سے کسی سادہ سے مسئلے مثلاً خواب کی تعبیر کے بارے میں سوال کرتے تو آپؑ فوراً معارف الٰہی اور تربیتی مسائل کے موضوع کی طرف آجاتے اور فرماتے:

يٰصَاحِبَيِ السِّجۡنِ ءَ اَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَيۡرٌ اَمِ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسۡمَآءً سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۰﴾

اے میرے قیدی دوستو!کیا متفرق اور پراگندہ (متعدد) خدا بہتر ہیں یا خدا واحد وقہار؟!خدا کی بجائے

جن معبودوں کی تم پرستش کرتے ہو سوائے اس اسم ونام کے جو تم اور تمہارے آباؤ اجداد نے انھیں دیئے ہیں، کچھ بھی نہیں، خدا تعالیٰ نے ان کے لئے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، حکم فقط خدا کے لئے ثابت ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے غیر کی پرستش نہ کرو، یہی ہے دائمی و مستحکم دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔[۱]

درست ہے کہ یوسف - خود ایک قیدی تھے لیکن ان کا عمل ظاہر کرتا ہے کہ اگر حکومت کی باگ دوڑ بھی ان کے ہاتھوں میں آجائے تو بطریق اولیٰ ان کی کوشش یہی ہوگی کہ زندان کا ماحول ایک تعلیمی ادارے اور مرکز الٰہی میں تبدیل ہو جائے جہاں قیدیوں کی الٰہی قانون کے مطابق تعلیم و تربیت ہو اور اس ماحول میں قیدیوں کو اپنی تربیت گذشتہ زندگی پر ایک نظر اور غلط افکار اور پروگراموں پر تجدید نظر کا جو موقعہ ملا ہے اس سے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کریں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ گناہوں سے آلودہ نہایت برے لوگوں کو اگر زندان میں کوئی اچھا اور نیک ساتھی مل جاتا ہے تو بہت جلد ان کی اصلاح ہو جاتی ہے، اس لئے کہ زندان سے باہر انھوں نے اپنے ماضی میں جھانکنے اور اس پر تجدید نظر کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہوتی لہٰذا زندان ان کے لئے ایک توفیق ہے جو انھیں مجبوراً حاصل ہے۔ احادیث میں قیدیوں کے حقوق انھیں نماز جمعہ میں شرکت اور دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات کے لئے رخصت دینے کے بارے میں بہت اعلیٰ مطالب نظر آتے ہیں۔

ان احادیث میں سے ایک حدیث میں امام جعفر صادق - نے فرمایا:

"عَلَى الإمامِ اَنْ يُخْرِجَ الْمُحْبَسينَ فِي الدَّيْنِ، يَومَ الْجُمُعَةِ اِلَى الْجُمعَةِ، وَ يَوْمَ الْعِيْدِ اِلَى الْعِيْدِ فَيُرْسِلُ مَعَهُمْ فَاِذا قَضَوُا الصَّلاةَ وَ الْعِيْدَ رَدَّهُمْ اِلَى السِّجْنِ"

"مسلمانوں کے پیشوا پر لازم ہے کہ وہ ان قیدیوں کو جو قرض ادا نہ کرنے کی وجہ سے یا اور وجوہات کے باعث زندان میں ہیں، روز جمعہ، اور روز عید نماز عید کے لئے سپاہیوں کے ہمراہ جانے کی رخصت دے اور جب نماز جمعہ اور نماز عید اختتام پذیر ہو تو وہ انھیں واپس زندان میں لے آئیں۔"[۲]

توجہ رہے کہ نماز جمعہ اور عیدین، دو دو خطبوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن کا تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ایک غیر معمولی اثر ہے۔ ایک اور حدیث تو اس سے ایک قدم اور آگے ہے جس کا مضمون یہ ہے:

"اِنَّ عَلیّاً عَلَيهِ السَّلامُ كانَ يُخْرِجُ اَهْلَ السُّجُونِ - مَنْ حُبِسَ فى دَيْنٍ اَوْ تُهْمَةٍ - اِلَى الْجُمُعَةِ فَيَشْهَدُونَها وَ يُضَمِّنَهُمُ الاَوْلِياءَ حَتّى يَرُدُّوهُم"

علیؑ ان قیدیوں کو جو قرض کی عدم ادائیگی یا کسی دوسرے الزام میں زندان میں پڑے ہوتے، نماز جمعہ میں

---

[۱] سورہ یوسف۔ ۳۹۔ ۴۰

[۲] وسائل، ج ۱۸ ص ۲۲۱، باب من یجوز حبسہ، حدیث ۲۔

حاضر ہونے کے لئے لاتے اور ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں سے یہ ضمانت لیتے کہ وہ انھیں واپس زندان میں لائیں گے۔[1]

(ٹھیک ان رخصتوں کی طرح جو آج کل بعض اسلامی ملکوں میں رائج ہیں)۔ ایک اور حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؑ ہر روزِ جمعہ کو زندان کا چکر لگاتے، وہ لوگ جو حدّ جاری ہونے کے انتظار میں ہوتے، ان پر حدّ جاری کرتے (اور آزاد کر دیتے) اور جس کسی پر کوئی حدّ نہ ہوتی اسے بھی آزاد کر دیتے۔[2]

آیات و روایات اور وہ احکام جو اس ضمن میں وارد ہوئے ہیں، اُن اسے جامع دستورات کو اخذ کیا جا سکتا ہے نمونے کے طور پر چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ جب عبدالرحمن ابن ملجم، قاتل حضرت علیؑ کو گرفتار کر کے حوالہ زندان کیا گیا تو امام علیؑ نے اس کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی، اس ضمن میں اپنے فرزندان اور ارد گرد موجود افراد کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اَطْعِمُوهُ وَاسْقُوهُ و اَحْسِنُوا اَسارَهُ"

یعنی: "اسے کھانا دینا، سیراب کرنا اور شائستہ انداز میں اپنی قید میں رکھنا۔"[3]

معروف و مشہور یہی ہے کہ جب امامؑ اس حال میں تھے کہ سر مبارک پھٹا ہوا تھا اور بستر پر تھے کبھی بے ہوش اور کبھی ہوش میں آجاتے تھے، امام حسن - نے دودھ کا ایک پیالہ آنحضرتؑ کو دیا آپؑ نے تھوڑا سا پی کر فرمایا: "باقی دودھ اپنے قیدی ابن ملجم کو دے دو۔"[4]

مرحوم علامہ مجلسی ایک اور حدیث میں نقل کرتے ہیں کہ جب ابن ملجم کو حضرت علیؑ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپؑ نے اس سے کچھ باتیں کیں بعد ازاں اپنے فرزند حسن - سے خطاب کر کے فرمایا:

"اَرْفِقْ يا وَلَدِی بِأَسيرِكَ وَ ارْحَمْهُ وَ اَحْسِنْ اِلَيْهِ و اَشْفِقْ عَلَيْهِ. اَلا تَرى اِلى عَيْنَيْهِ قَدْ طارَتا الى اُمِّ رَأْسِهِ وَ قَلْبُهُ يَرْجِفُ خَوفاً وَرُعْباً وَفَزَعاً. فَقالَ لَهُ الْحَسَنُ عليه السلام يا اَباهُ! قَدْ قَتَلَكَ هذا اللَّعينُ الْفاجِرُ وَ اَفْجَعَنا فيكَ وَ اَنْتَ تَأْمُرُنا بِالرِّفْقِ بِهِ؟! فَقالَ لَهُ نَعَمْ يا بُنَيَّ نَحْنُ اَهْلُ بَيْتٍ لانَزْدادُ عَلَى الذَّنْبِ اِلَيْنا اِلاّ كَرَماً وَ عَفْواً وَ رحمَةً وَالشَّفَقَةَ مِنْ شيمَتِنا لا مِنْ شيمَتِهِ. بِحَقّى عَلَيْكَ فَاَطْعِمْهُ يابُنَيَّ مِمّا تَأْكُلُهُ، وَ اَسْقِهِ مِمّا

---

[1] مستدرک، ج ۱۷، ص ۴۰۳، حدیث ۱

[2] میزان الحکمۃ، ج ۲، ص ۲۵۰

[3] بحار، ج ۴۲، ص ۲۳۹

[4] بحار، ج ۴۲، ص ۲۸۹

تَشْرَبُ وَ لا تُقَيّدُ لَهُ قَدَماً, وَ لا تَغُلَّ لَهُ يَداً"

اے میرے فرزند! اپنے قیدی کے ساتھ نرم دلی کے ساتھ پیش آنا اس کے ساتھ نیکی اور اس پر رحم کرنا؛ کیا نہیں دیکھتے کہ اس کی آنکھیں خوف کے باعث اوپر کو چڑھی ہوئی ہیں اور اس کا دل رعب اور وحشت کی وجہ سے لرز رہا ہے؟! حسن - نے عرض کی: بابا جان! اس ملعون نے آپؑ کے قتل کا سامان فراہم کیا اور ہمیں اس عظیم مصیبت میں مبتلا کیا، پھر بھی آپؑ اس کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرنے کی باتیں کرتے ہیں؟! (جواب میں) آپؑ نے فرمایا: ہاں، اے میرے فرزند! ہم ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنے اوپر ڈھائے گئے ظلم وستم کے مقابلے میں سوائے عفو و کرم اور رحمت وشفقت کے اظہار کے کوئی اور ردعمل ظاہر نہیں کرنا، یہ ہماری عادت ہے نہ اس کی۔ میں تمہیں اپنے حق کی قسم دیتا ہوں کہ اسے وہی کھلانا جو تم خود کھاتے ہو اور اسے بھی وہی کچھ پلانا جو خود پیتے ہو، اس کے پاؤں میں زنجیر اور ہاتھوں میں ہتھکڑی نہ لگانا![1]

۲۔ مرحوم شیخ طوسی اپنی کتاب ''خلاف'' میں کہتے ہیں: جب کبھی کوئی کسی چھوٹے بچے کو پکڑ کر از راہ ظلم قید کرلے اور کوئی دیوار اس پر گر پڑے یا کوئی حیوان درندہ اسے مار ڈالے، یا سانپ اور بچھو اسے ڈس لے جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہوجائے تو یہ قید کرنے والا اس کے خون کا ضامن ہے، بعد ازاں فرماتے ہیں:

"دَلِيلُنا اِجْماعُ الْفِرْقَةِ وَ اَخْبارُهُمْ"

یعنی اس مطلب پر ہماری دلیل تمام علماء امامیہ کا اتفاق واجماع اور ان کی روایات ہیں۔[2]

اس بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ زندان کو امن وامان کا حامل اور صاف ستھرا ہونا چاہیے اور اگر بدامنی اور آلودگی کے نتیجے میں کوئی حادثہ رونما ہوجائے تو قید کرنے والا اس خون کا ضامن اور ذمہ دار ہے۔

۳۔ مرحوم شیخ طوسی اپنی کتاب ''مبسوط'' میں بعض فقہاء سے نقل کرتے ہیں کہ اگر کسی کو کسی کمرے میں قید کر کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا جائے اور گھٹن اور کم ہوا کے باعث وہ قیدی مرجائے تو قید کرنے والا اس کی دیت کا ضامن ہوگا۔[3]

اس مطلب کو گرسنگی (بھوک) وغیرہ کی صورت میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس سارے بیان سے مجموعی طور پر بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ زندان میں قید شخص کو کافی ہوا اور غذا وغیرہ ملنی چاہیے اور ضروری ہے کہ اس کی زندگی اور سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

۴۔ بہت سارے فقہاء نے آداب قاضی کی بحث میں لکھا ہے کہ قاضی کو چاہیے کہ شہر میں داخل ہوتے ہی قیدیوں کے بارے

---

[1] بحار، ج ۴۲، ص ۲۸۷، ۲۸۸

[2] کتاب خلاف، ج ۳، ص ۹۴، کتاب اجنایات، مسئلہ ۱۹

[3] احکام زیاند در اسلام، ص ۲۶۳

میں اطلاع حاصل کرکے ان کی فائلوں کی جانچ پڑتال کرے تاکہ اگر کسی کی مدت قید ختم ہوگئی ہو یا کوئی قیدی اگر بلا جواز و دلیل زندان میں ہے تو انھیں فوراً آزاد کردے۔

اسی طرح بعض فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جب قاضی شہر میں داخل ہو تو لازم ہے کہ تمام شہروں میں اعلان کیا جائے کہ قاضی فلاں روز قیدیوں کے امور کو نپٹائے گا اور جس کسی کا کوئی عزیز قید ہو وہ اس دن حاضر ہوجائے اور جب قیدی کی قید کے مدعی حاضر ہوجائیں تو قیدیوں کے نام یکے بعد دیگرے پکارے جائیں اور ان سے ان کی قید کا سبب پوچھا جائے بعدازاں مدعی سے سوال کیا جائے قیدی کی قید کی اطمینان بخش دلیل دستیاب ہونے کی صورت میں اسے پھر سے داخل زندان کردیا جائے گا اور مدعی نہ ہونے کی صورت میں قیدی کا نام بلند آواز میں پکارا جائے گا تاکہ اگر کوئی مدعی ہو تو وہ قاضی کی عدالت میں پیش ہو کر اپنا دعوٰی پیش کرسکے اس صورت کے برعکس اسے آزاد کردیا جائے گا۔[1]

قیدیوں کی حمایت میں ابو یوسف کا تاریخی لائحہ عمل

عباسیوں کا زمانہ تاریخ اسلام کا سخت گھٹن اور اضطراب کا دور تھا اور اس کا ایک زندہ ثبوت یہ ہے کہ اس دور میں زندانوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔قیدیوں پر سخت دباؤ ڈالا جاتا اور بے گناہ افراد کو بے بنیاد الزامات کی بنیاد پر گرفتار کرکے زندانوں میں ڈال دیا جاتا تھا اور قرون وسطٰی کے زندانوں کی یاد تازہ کی جاتی تھی۔

ان زندانوں کی وحشت ناک خبریں حکومت کی طرف سے لگائے گئے سخت سنسر کے باوجود رفتہ رفتہ باہر بھی پہنچ گئیں اور لوگوں کے اعتراضات ہر طرف سے بلند ہونے لگے، خاص طور پر لوگوں نے علماء وقت پر دباؤ ڈالا کہ اس ظالمانہ کارروائی کو ختم کرنے کی کوشش کریں، اس ضمن میں جو مثبت عمل انجام دیا گیا وہ مشہور فقیہ اہل سنت ابو یوسف شاگرد ابو حنیفہ کا تاریخی فیصلہ تھا۔

عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے ابو یوسف کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ اسلام اور فقہ اسلام کی روشنی میں قیدیوں کے ساتھ سلوک کی کیفیت کے بارے میں ایک لائحہ عمل تیار کرے، ہارون الرشید کا سوال خاص طور پر اس بارے میں تھا کہ مجرم اہل شر و فساد اور چور افراد جب گرفتار ہو کر راہی زندان ہوتے ہیں تو کیا لازم ہے کہ ان کے لئے غذا تیار کی جائے؟ اور اگر لازم ہے تو کیا اس غذا کو زکوۃ کے مال سے تیار کیا جائے؟ یا کسی اور مال سے؟ مجموعی طور پر یہ کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جائے؟

واضح ہے کہ ہارون الرشید کو قیدیوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ لوگوں کے احتجاج نے اسے مجبور کردیا تھا، ابو یوسف نے جواباً ایک تفصیلی لائحہ عمل مرتب کرکے خلیفہ کے پاس بھیج دیا جس میں شجاعت آمیز صراحت کے ساتھ اس نے احکام اسلام کو تحریر کیا اور سلطنت میں موجودہ صورتحال پر بھی کڑی تنقید کی اس نے اپنے سوال و جواب کے دائرے کو قیدیوں، چوروں اور اہل شر افراد تک ہی محدود نہ رکھا، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عباسیوں کے زندانوں میں بیشتر قیدی سیاسی (قیدی) ہیں! اس تاریخی تحریر کو بارہ حصوں میں خلاصہ کرکے

---

[1] جواہر الکلام، ج۲۰ص ۴۷

یہاں پیش کیا جاتا ہے:(غور فرمائیں)

ا۔جب قیدیوں کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ ہوتو ضروری ہے کہ محل زکوٰۃ (نادار لوگوں کے حق) یا بیت المال (عمومی حقوق) کے خرچ سے انھیں کھانا فراہم کیا جائے اور (اے ہارون) تمہیں اختیار ہے کہ ان دو میں سے جسے چاہو انتخاب کرلو۔

۲۔واجب ہے کہ ہر قیدی کے لئے اس کی ضرورت کے مطابق راشن تیار کیا جائے اور اس امر میں کسی قسم کی کوتاہی کرنا جائز نہیں!

۳۔اس بات پر نظر رکھو کہ اگر مشرکین میں سے بھی کوئی شخص گرفتار کیا جائے تو جب تک اسلامی عدالت کی طرف سے اس کا فیصلہ صادر نہیں ہوتا، ضروری ہے کہ اس کے ساتھ بھی یہی اچھا سلوک کرو اور اس کے کھانے کا بھی بندوبست کرو چہ جائیکہ ایک مسلمان قید میں پڑا ہو، کیا یہ حق کے مطابق ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ بھوک سے مر جائے؟!

۴۔اے خلیفہ! گذشتہ خلفاء ہمیشہ قیدیوں کے بارے میں (اچھے رویہ) کی تاکید کرتے اور ان کے لئے موسم گرما اور سرما کے علیحدہ لباس تیار کراتے تھے، اور اس راہ کے سب سے پہلے راہی امیر المؤمنین علیؑ تھے، اور ان کے بعد کے خلفاء بھی اس مسئلے کی اہمیت کے قائل تھے۔

بعض راویان حدیث نے مجھے بتایا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کا تاکیدی حکم تھا کہ زندانوں میں کسی کو اس طرح پابہ زنجیر نہ کریں کہ وہ کھڑے ہو کر نماز ادا نہ کر سکے اور کسی کو رات سے لے کر صبح تک ہتھکڑی نہیں لگنی چاہیے سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے بے گناہوں کا خون بہایا ہے۔

۵۔حکم دے کہ قیدیوں کی خوراک کی مقدار کے مطابق نقد رقم ہر ماہ کے آغاز میں انھیں دے دی جائے اس لئے کہ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ اگر غذا جنس کی صورت میں ان کے حوالے کی جائے، تو زندان کے مامورین اس سے کچھ نہ کچھ چرالیں! اور غذا کا قابل توجہ حصہ قیدیوں تک نہ پہنچ پائے؛ (ابو یوسف نے اس مقام پر بنی عباس کے زندانوں میں حکم فرما فساد کو واضح ترین صورت میں بیان کیا ہے)۔

٦۔کسی قابل اعتماد اور صاحب خیر شخص کو حکم دو کہ وہ ان تمام قیدیوں کا نام ایک رجسٹر میں ثبت کرے جو بیت المال سے راشن حاصل کرتے ہیں وہ اس رجسٹر کو اپنی نگرانی میں رکھے اور ہر ماہ کے آغاز میں بذات خود زندان جائے اور اس رجسٹر کے مطابق ایک ایک قیدی کے نام لے کر پکارے اور اس کے اخراجات کی رقم اس کے ہاتھ میں دے میرے خیال میں دس دینار ایک ماہ کے خرچ کے لئے ایک فرد کے لئے کافی ہوں گے (اگر دینار کو ایک مثقال، اٹھارہ چنوں، کے برابر سونے کی حیثیت سے ملاحظہ کریں تو آج کی کرنسی میں یہ ایک بہت بڑی رقم ہوگی اور یہاں تک کہ اس زمانے کے اعتبار سے بھی ایک بڑی رقم تھی ابو یوسف نے اس مقدار کا انتخاب اس لئے کیا کہ اگر اس سے کم رقم بھی قیدیوں کو دیں تو پھر بھی ان کی ضرورت کے مطابق رقم ادا کریں)۔

۷۔میں نے یہ بات سنی ہے کہ بعض اوقات مامورین قیدیوں کو پابند سلاسل حالت میں لوگوں کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں تاکہ لوگ ان پر ترس کھا کر انھیں صدقہ وخیرات دیں اور اس طرح کچھ رقم قیدیوں کے لئے اکٹھی ہو جاتی ہے! اس ناشائستہ عمل سے پرہیز کرو کیونکہ خدا تعالیٰ ایسے عمل سے راضی نہیں میرے خیال میں مشرکین بھی مسلمان اسیروں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے پس کیسے ممکن ہے کہ

مسلمان اسیروں کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جائے؟! پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ رقم جسے صدقات کے ذریعے جمع کیا جاتا ہے وہ قیدیوں کو دے دی جاتی ہے۔

۸۔ جب کوئی زندان میں فوت ہو جائے اور اس کے کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہ ہوں تو لازم ہے کہ اس کے غسل وکفن کے وسائل مناسب انداز میں بیت المال کے ذریعے فراہم کئے جائیں، اسی طرح ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور پھر سپرد خاک کیا جائے۔ باوثوق افراد نے مجھے خبر دی ہے کہ بعض اوقات کوئی غریب الوطن قیدی زندان میں فوت ہو جاتا ہے اور اس کی میت ایک یا دو روز تک زمین پر پڑی رہتی ہے تا کہ قیدی لوگ ذمہ دار افراد سے پوچھیں کہ بتایئے ہماری ذمہ داری اس میت کے بارے میں کیا ہے؟ اس دوران قیدی افراد اس غم انگیز منظر کو ختم کرنے کے لئے مل جل کر پیسے جمع کرتے ہیں تا کہ کسی ایسے شخص کو دیں جو اسے قبرستان تک پہنچا دے اور غسل وکفن اور نماز جنازہ کے بغیر سپرد خاک کر دے، یہ ایک ایسا دردناک عمل ہے جو کسی مسلمان کے لئے قابل برداشت نہیں!

۹۔ میرے خیال میں اگر تم حکم دو کہ حدود وتعزیرات اسلامی پر صحیح طور پر عمل ہو تو قیدیوں کی تعداد بہت کم ہو سکتی ہے کیونکہ مجرم ذہنیت کے لوگ جب اپنی آنکھوں سے ان سزاؤں کے مناظر دیکھیں گے تو یہ ان کی روح پر اثر انداز ہوں گے! قیدیوں کی تعداد میں اضافے کا ایک اور سبب یہ ہے کہ بہت سارے لوگ زندان میں آنے کے بعد بھلا دیئے جاتے ہیں اور ان کے معاملے کا تعاقب (پیچھا) نہیں کیا جاتا لہٰذا بعض افراد کو اس کام پر مامور کرو کہ وہ ہر روز قیدیوں کے ریکارڈ کا مطالعہ کریں اور جلد از جلد ان کے معاملے کو نپٹائیں اگر ان کے خلاف کوئی دلیل ہو تو انھیں سزا دے کر آزاد اور دلیل کے نہ ہونے کی صورت میں ان کی قید ختم کر کے انھیں آزاد کر دیا جائے۔

۱۰۔ خطا کاروں کی سزا میں افراط کا رویہ نہ اپنایا جائے اس کا خصوصی اور تاکیدی حکم صادر کرو کسی کو اسلامی سزا جو مجاز ہے، سے زیادہ سزا نہ دی جائے، مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارے مامورین صرف الزام کی بنیاد پر قیدیوں کو مارتے ہیں یہاں تک کہ بعض جرائم کی صورت میں ۲۰۰ تا ۳۰۰ یا کم وبیش تازیانے بھی لگائے گئے ہیں! اسلام میں یہ سب کچھ جائز نہیں مسلمان کے بدن کی حرمت حرام ہے اور بغیر وجہ کہ اس کو آزار نہیں پہنچایا جا سکتا۔

۱۱۔ جب کوئی قید کسی ایسے جرم کا مرتکب ہوا ہو جس کی وجہ سے ضروری ہے کہ اس سے قصاص لیا جائے یا اس نے ایسا عمل انجام دیا ہے جو قابل حد وتعزیر ہے تو یہ احکام اسلامی اس پر جلد از جلد جاری کئے جائیں اور وہ بلاوجہ زندان میں نہ پڑا رہے اور اگر صاحبان قصاص خون معاف کر دیں اور مجرم سے درگذر کریں تو اس صورت میں بھی اسے فوراً آزاد کیا جائے۔

۱۲۔ قصاص کے ممکن نہ ہونے کی صورت میں مجرم کامل دیت کی ادائیگی کرے اس کے بعد کچھ عرصہ زندان میں گذارے یہاں تک کہ توبہ کے آثار اس پر ظاہر ہوں اس صورت میں بلا تاخیر اسے آزاد کیا جائے تا کہ وہ اپنی راہ لے اور جہاں جانا چاہے چلا جائے۔[1]

یہ تاریخی دستاویز جو عباسی حکمرانوں کے ہم عصر ایک فقیہ کی قیدیوں کے بارے میں اسلامی طرز فکر کو بیان کرتی ہے، ممکن ہے اس سلسلے میں بعنوان نمونہ ومثال اسلامی تعلیمات کی ایک سند قرار دی جا سکے۔

---

[1] نقل از کتاب الخراج، ص ۱۴۶۔ بالتلخیص

ادارہ حسبہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اشارہ

کسی قانون کی قدر و قیمت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس کا نفاذ کس حد تک ہے، بہترین قوانین اگر نافذ نہ ہوں تو ان کی حیثیت محض کاغذی ہوتی ہے معاشرے میں موجود کسی درد و مشکل کی دوا نہیں ہوتے اس کے برعکس بہت کمزور قوانین کو بھی اگر بہتر طور پر نافذ کیا جائے تو ممکن ہے کہ ایک حد تک مشکل کو حل کر سکیں۔ اس دلیل کے پیش نظر اسلام اور حکومت اسلامی میں قوانین کے نفاذ اور جرائم کی روک تھام کے لئے ایک وسیع اور جامع لائحہ عمل کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ لائحہ عمل مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے:

۱۔ نظام قضائی (عدالتی نظام)

۲۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری

۳۔ مسئلہ حسبہ

عدالتی نظام اور حدود و تعزیرات کے اجراء (جاری کرنے) سے متعلق کافی حد تک گفتگو ہو چکی ہے اب ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور موضوع حسبہ کے بارے میں کچھ گفتگو کریں گے۔ حقیقت میں حدود کا اجراء و نفاذ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کی شاخیں ہیں، اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تین مرحلے ہیں، جن میں سے دو مرحلے واجب کفائی کے طور پر عوام الناس کی ذمہ داری ہیں اور ایک مرحلے کی ذمہ دار حکومت ہے۔

۱۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر قلبی (یعنی انسان دل میں برائیوں سے بیزار اور خوبیوں کا مشتاق ہو (بعض حضرات کی رائے میں اس مرحلے سے مراد یہ ہے کہ انسان نفرت یا دلی لگاؤ کے آثار کو اپنے چہرے پر یا عمل کے ذریعے ناراضگی اور رضامندی کی صورت میں ظاہر کرے) یہ ترک واجبات اور انجام محرمات کے مقابلے میں تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ زبان کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی انسان شروع میں نرم و ملائم اور محبت آمیز انداز میں وعظ و نصیحت کرے اور اثر نہ ہونے کی صورت میں تند و سخت انداز اختیار کر کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری انجام دے۔

۳۔ ہاتھ کے ذریعے امر ابالمعروف و نہی عن المنکر یا دوسرے الفاظ میں واجبات کو ترک کرنے اور محرمات کو انجام دینے والوں کے خلاف قہر آمیز اور عملی اقدام کرنا، یہ چاہے بدنی سزا کے ذریعے ہو یا حبس اور زندان اور اس کے مشابہ عمل کے ذریعے اور جیسا کہ کتب فقہی میں کہا گیا ہے کہ یہ مرحلہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور ممکن نہیں کہ اسے عوام الناس کے سپرد کر دیا جائے کیونکہ ایسا کرنا

شدید گڑبڑ اور سخت بحران کا باعث بن سکتا ہے اور یہ مرحلہ وہی ہے جسے فقہ اسلامی اور عبارات فقہاء ومؤرخین میں ''وظیفہ حسبہ'' کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس مطلب کا مزید جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران/۱۱۰)

۲۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۰۴﴾ (آل عمران/۱۰۴)

۳۔ لَيْسُوا سَوَآءً ط مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُونَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ ط وَأُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ (آل عمران/ ۱۱۳ و ۱۱۴)

۴۔ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ م يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيعُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ ط أُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ط إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۷۱﴾ (توبہ/۷۱)

۵۔ اَلتَّآئِبُونَ الْعٰبِدُونَ الْحٰمِدُونَ السَّآئِحُونَ الرّٰكِعُونَ السّٰجِدُونَ الْاٰمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُونَ لِحُدُودِ اللّٰهِ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۲﴾ (توبہ/ ۱۱۲)

۶۔ اَلَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿۴۱﴾ (حج/۴۱)

۷۔ يٰبُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ أَصَابَكَ ط إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿۱۷﴾ لقمان/۱۷)

ترجمہ:

۱۔تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کے فائدے کے لئے خلق کیا گیا ہے کیونکہ تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

۲۔ چاہیے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (کی ذمہ داری) انجام دے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

۳۔ اہل کتاب سب یکساں نہیں، اہل کتاب میں سے بعض افراد ایسے ہیں جو ایمان اور حق کی خاطر قیام کرتے اور رات کے اوقات میں آیات خدا کی تلاوت کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ سجدے میں پڑے ہوتے ہیں خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر انجام دیتے ہیں اور نیک کام انجام دینے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں یہی لوگ صالحین میں سے ہیں۔

۴۔ باایمان مرد و زن ایک دوسرے کے ولی (یاور اور مددگار) ہوتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں، خدا جلد ہی اپنی رحمت کو ان کے شامل حال قرار دے گا بے شک خدا تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے۔

۵۔ توبہ، عبادت، حمد و سپاس (شکر)، سیاحت اور رکوع و سجود کرنے والے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے اور حدود الٰہی کے محافظ ہی (حقیقی مومن ہیں)، (اور اس قسم کے) اہل ایمان کو بشارت دے دو!

۶۔ (خدا کے دوست وہ ہیں) جنھیں اگر ہم زمین پر صاحب قدرت قرار دیں تو یہ نماز قائم اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں (اسی طرح) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور تمام امور کا اختتام اور انجام اللہ ہی کے لئے ہے۔

۷۔ (لقمان نے کہا) میرے بیٹے ! نماز قائم کرو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انجام دو اور جو مصائب تمھیں لاحق ہوں ان پر صبر کرو کیونکہ یہ سب کچھ اہم امور میں سے ہے!

آیات کا خلاصہ اور تفسیر

نفاذ احکام کے سلسلے میں ایک اہم قدم

مذکورہ بالا آیات وہ خصوصی آیات ہیں جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے اہم فریضے کو بیان کیا گیا ہے جو اس فریضے کی مختلف جہات کو ظاہر کرتی ہیں۔ سب سے پہلی آیت میں قرآن مجید امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک عمومی حکم کے طور پر بیان کرنا اور اسے امت اسلامی کی ایک اہم خصوصیت قرار دیتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ فریضہ سابقہ امتوں میں موجود نہیں تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ

امت اسلامی میں اس (فریضے) کو ایک اصل اصیل اور رکن رکین (یعنی مستحکم قاعدے اور رکن) کی حیثیت دی گئی ہے، ارشاد ہے:

''تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کے فائدے کے لئے خلق کیا گیا ہے کیونکہ تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔''

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ؕ

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک خصوصیت کے طور پر متعارف کراتا ہے جس کے باعث اسلام عالی ترین دین اور امت اسلامی ایک مثالی امت قرار پاتی ہے اور دوسری طرف سے ان دونوں ذمہ داریوں کو خدا پر ایمان سے پہلے ذکر کرتا ہے اور یہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جب تک یہ فریضہ اسلامی اصولوں کے طور پر عوام الناس میں نافذ نہ ہو، لوگوں کے ایمان کی بقاء کی بھی ضمانت فراہم نہیں ہوتی۔

جی ہاں! ایسا ہی ہے اگر ان دو اصولوں کو فراموش کر دیا جائے تو دلوں میں ایمان کی جڑیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں، اس کی شاخیں و پتے کملا جاتے اور آخر کار اس کے ستون منہدم ہو جاتے ہیں۔ ضمناً اس بیان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمان اس وقت تک ایک ممتاز امت شمار ہوں گے جب تک وہ نیکی کی طرف دعوت اور فساد کے ساتھ مقابلے کو فراموش نہیں کریں گے اور جس دن ان دو عظیم الٰہی ذمہ داریوں کو فراموش کر دیا جائے گا اس دن نہ وہ بہترین امت رہیں گے اور نہ ہی معاشرہ انسانی کے لئے سودمند اور نفع بخش! جی ہاں! مسلمان اسی وقت جہان میں موجود امم (امتوں) کی قیادت و راہنمائی کر سکتے ہیں اور دنیا انکے وجود سے خیر و برکت حاصل کر سکتی ہے جب وہ ان دو عظیم ذمہ داریوں کو عمومی سطح پر جاری کریں۔

دوسرے الفاظ میں: امت اسلامی کے ایک ایک فرد پر لازم ہے کہ وہ اس امر (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کے بارے میں اپنی ذمہ داری محسوس کرے جبکہ اس کے برعکس آج کی دنیا میں فتنہ و فساد سے نبرد آزما ہونا اور اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی دعوت دینا فقط حکومتی مامورین کے ذمے ہے اور باقی لوگ اپنے آپ کو ہر قسم کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دیتے اور اجتماعی و معاشرتی مسائل کے مقابلے میں خود کو غیر جانبدار سمجھتے ہیں، لیکن ایک مسلمان یہ کہتے نظر آتا ہے کہ: یہ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) ایک عمومی ذمہ داری ہے جس کے دائرے میں چھوٹے بڑے پیر و جوان عورت مرد عالم اور جاہل سبھی آتے ہیں۔ لفظ معروف (جانا پہچانا) اور منکر (انجانا) پر اعتماد بھی قابل توجہ ہے، اس لئے کہ یہ ایک طرف سے ظاہر کرتا ہے کہ واجبات و محرمات ایسی چیزیں ہیں جنھیں انسان کی عقل و روح بخوبی پہچانتی ہے لہٰذا انسان واجبات سے محبت کرتا ہے جبکہ منکرات اور محرمات اس کے لئے انجانی اور باعث نفرت چیزیں ہوتی ہیں۔

دوسری طرف سے بدیہی اور واضح ہے کہ اگر ان دو فریضوں کو بھلا دیا جائے اور معاشرے کو منکرات (پر عمل کرنے) کی عادت پڑ جائے اور اہل معاشرہ اچھائیوں، برائیوں اور اعمال معروف کو ترک کر دیں تو معروف ان کی نظر میں منکر اور منکر، معروف میں تبدیل ہو جائے گا اور یہ ایک عظیم خسارہ ہے جو کسی معاشرے کا دامن گیر ہو جائے، یہ وہی مصیبت و بدبختی ہے جس نے اکثر معاشروں کو اپنی گرفت

میں لے رکھا ہے کہ ان میں منکر اور معروف نے اپنی جگہیں تبدیل کر لیں ہیں (یعنی منکر اور معروف کی تمیز ختم ہو چکی ہے)۔

دوسری آیت کے پیش نظر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک اور شعبہ ہے جو امت کے بعض افراد کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے الفاظ میں اس کا تعلق خاص طور پر حکومت اور اس کے کارندوں کے ساتھ ہے، ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: ''ضروری ہے کہ تم سے کچھ لوگ نیکی کی طرف دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وظیفہ انجام دیں، ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔''

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۱۰۴﴾

جب اس آیت کو گذشتہ آیت کے سامنے رکھا جائے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک عمومی فریضہ قرار دیتی ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس (پہلی آیت) میں ان دو عظیم ذمہ داریوں کے ایک مرحلے میں قلب و زبان کا اور دوسرے میں شدت عمل کا حکم ہے اور دلچسپ یہ ہے کہ کامیابی اس آیت میں ان لوگوں کے لئے بیان ہوئی ہے جنھوں نے یہ دونوں ذمہ داریاں پوری کی ہیں۔[1]

اُمَّۃ کے ساتھ تعبیر کرنا شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس مرحلے میں کام ایک لائحہ عمل اور ادارہ سازی کی صورت میں انجام پانا چاہیے اور ہم جانتے ہیں کہ جو کام شدت عمل اور حکومت کے ہاتھوں میں انجام پاتے ہیں وہ ان دو امور (لائحہ عمل کی تشکیل اور ادارہ سازی) کے بغیر ممکن نہیں ہوتے۔ اس آیت شریفہ کا اختتامی حصہ بخوبی گواہی دے رہا ہے کہ دنیا و آخرت کی ہر کامیابی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی ان دو عظیم فریضوں کو انجام دینے میں ہے۔

تیسری آیت میں ان دو عظیم ذمہ داریوں کے سلسلے میں ایک اور لطیف اشارہ موجود ہے جو اس کے شأن نزول سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس آیت کے شان نزول کے بارے میں علماء نے کہا ہے کہ قوم یہود کے کچھ دانشمند اور نیک لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور مسلمانوں کے ساتھ ملحق ہو گئے، یہودیوں کے سردار اس واقعے سے سخت نالاں ہوئے اور ان لوگوں کے بارے میں کہنے لگے: ہمارے کچھ برے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے اور اگر وہ درست لوگ ہوتے تو اپنے آباؤ اجداد کے دین سے ہرگز نہ پھرتے! مذکورہ بالا آیت انھیں جواب دیتی ہے کہ

ترجمہ: ''وہ (اہل کتاب) سارے یکساں نہیں: ان میں سے بعض حق و ایمان اور اطاعت خدا کے لئے

---

[1] بعض حضرات نے جو آیت شریفہ میں موجود من کو زائدہ یا بیانیہ قرار دیا ہے اور اس صورت میں تمام اہل ایمان اس آیت کے مفہوم میں شامل ہو جاتے ہیں، آیت شریعہ کے ظاہر کے خلاف ہے بلکہ ظاہری یہی ہے کہ مِن تبعیض کیلئے ہو یعنی تم سے ایک گروہ کو یہ فریض انجام دینا چاہیے۔ اسی طرح بعض حضرات کی رائے میں مِن تبیعضیہ واجب کفائی پر دلالت کیلئے ہے یہ بھی خلاف ظاہر ہے کیونکہ واجب کفائی سب پر واجب ہوتا ہے البتہ اس کے وجوب کی نوعیت واجب عینی سے مختلف ہوتی ہے۔ (بیشتر توضیح اسی بارے میں علم اصول میں دی گئی ہے)۔

قیام کرتے اور مسلسل رات کے اوقات میں سجدے کی حالت میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔ ان کا خدا اور قیامت کے دن پر ایمان ہے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انجام دیتے اور نیک کاموں کی بجا آوری میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی لوگ صالحین میں سے ہیں۔''

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

قرآن اس مقام پر اسلام قبول کرنے والے اہل کتاب میں سے صالحین کی خصوصیت کو تین چیزوں میں بطور خلاصہ بیان کرتا ہے: خدا اور آخرت پر ایمان، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی انجام دہی اور نیک کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا اور روز قیامت پر ایمان لانے کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صالحین کی واضح ترین علامت اور نشانی ہے کیونکہ تمام نیک اعمال کی جڑ اسی عمل میں پوشیدہ ہے۔

چوتھی آیت میں اہل ایمان کی اولین خصوصیت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ اقامت نماز، ادائیگی زکوٰۃ اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت کو بھی اس کے بعد ذکر کیا گیا ہے! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ دو عظیم ذمہ داریاں انجام نہ دی جائیں تو خدا کی اطاعت و بندگی اور عبادت کی اساس خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

ترجمہ: ''باایمان مرد و زن ایک دوسرے کے ولی (یاور اور مددگار) ہوتے ہیں اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں، خدا جلد ہی اپنی رحمت کو ان کے شامل حال قرار دے گا بے شک خدا تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے۔''

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

اس جملے کی تفسیر میں کئی ایک احتمالات دیئے گئے ہیں جن میں سے ایک احتمال یہ ہے کہ وہ لوگ خدا اور اسلام کے اصول میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور متحد ہیں، دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ امور دنیا و دین میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے دوسروں کو کمالات کے بلند مراتب اور مدارج پر پہنچاتے ہیں۔ واضح ہے کہ یہ تینوں تفسیریں ایک دوسرے کے منافی نہیں اور آیت کے مفہوم میں تینوں کا جمع ہونا ممکن ہے، اس لئے کہ آیت شریفہ میں ولایت (اولیاء ہونے) کو مطلق طور پر ذکر کیا گیا ہے جو (ولایت) اہل ایمان کے مختلف جہات میں باہمی تعلق کو بھی اپنی حدود میں شامل کر لیتی ہے۔

پانچویں آیت میں وہ نفع بخش تجارت، جو سچے باایمان افراد خدا کے ساتھ جہاد میں شرکت کے عنوان سے کرتے ہیں اور اپنی جان کا معاوضہ اس کی بہشت کی صورت میں حاصل کرتے ہیں، کو ذکر کرنے کے بعد اس نفع بخش معاملے پر خدا انھیں مبارک باد دیتا اور اسے ایک عظیم کامیابی قرار دیتا ہے اور ان کے اوصاف کو نو صفات کی صورت میں خلاصہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ لوگ توبہ اور عبادت کرنے والے، شکر گذار، سیاحت کرنے والے (یعنی عبادت الٰہی کے مراکز کے درمیان یا میدان جہاد کے درمیان آمد و رفت رکھنے والے ہیں) سجدہ و رکوع اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو بجالانے اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (اے رسولؐ) ایسے اہل ایمان کو بشارت دے دو۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴿۱۱۲﴾

درحقیقت پہلے چھ اوصاف میں (امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور حدود الٰہی کی حفاظت) اور معاشرتی اور اجتماعی فساد اور ابتری کے خلاف ان کے مقابلے، حق و عدالت کے استحکام اور احکام الٰہی کے نفاذ، کی طرف اشارہ ہے اور ان سب (اوصاف) کے بعد خدا کی طرف سے بشارت اور خوشخبری کو مطلق طور پر بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں پہلے چھ اوصاف کی نظر خلق و خالق کے باہمی تعلق اور رابطے پر ہے جبکہ آخری تین اوصاف کی توجہ مخلوق کے آپس میں تعلق پر ہے اور آخر میں بیان کی گئی بشارت کا تعلق دنیوی اور اُخروی سعادت دونوں سے ہے۔

چھٹی آیت شریفہ میں اس مسئلے کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ ہے اور وہ اس کا حکومتی پہلو ہے دوسرے لفظوں میں اسلامی حکمرانوں کی ذمہ داریوں سے ایک اہم ذمہ داری امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شمار ہوتی ہے، ارشاد حق تعالیٰ ہے

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴿۴۱﴾

ترجمہ: ''خدا کے دوست وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین پر طاقت و قدرت عطا کریں تو وہ نماز قائم، زکات کو ادا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انجام دینے والے ہیں اور تمام امور کا اختتام خدا ہی کے لئے ہے۔''

خدا کی مدد کا وعدہ جو اس سے پہلی آیت ''وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ'' میں بیان ہوا ہے، اس کا تعلق درحقیقت ایسے افراد سے ہے جو جب زمین پر قدرت اور اقتدار حاصل کرتے ہیں تو نہ فقط خود نماز پڑھتے ہیں بلکہ نماز کو تمام روئے زمین پر قائم کرتے ہیں، اس کے علاوہ لاچار اور بے کس اور بے بس افراد کے حقوق ان تک پہنچاتے اور پھر ایک وسیع پیمانے پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وظیفہ دیتے ہیں۔ اگرچہ بعض حضرات نے یہ گمان کیا ہے کہ اس آیت میں مذکورہ افراد سے مراد مہاجرین کی جماعت ہے لیکن روز روشن کی طرح واضح ہے کہ آیت شریفہ ایک وسیع تر مفہوم کی حامل ہے اور قیامت تک کے افراد اس مفہوم میں شامل ہو سکتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نماز پڑھنے کو اقامت (نماز) سے تعبیر کرتا ہے جس کا مطلب ہے برپا یا قائم کرنا، صرف منافقین کے سلسلے میں قیام سے تعبیر کیا ہے نہ کہ اقامۃ سے ''وَاِذا قامُوا اِلَی الصَّلوٰۃِ قامُوا کُسالی'' (نساء/ ۱۴۲) تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ حقیقی اہل ایمان نہ فقط خود نماز پڑھتے ہیں بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ نماز پورے معاشرے میں قائم اور برپا ہو، بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ (حقیقی مومن) نہ فقط ظاہری نماز کو بجالاتے ہیں بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ روح وحقیقت نماز کو کمال وصحت کی شرائط سمیت قائم اور برپا کریں (ان دونوں کے درمیان اتفاق پیدا کرنا بھی کوئی مشکل نہیں)۔

ساتویں اور آخری آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں ہم ایک اور نکتے کا سامنا کرتے ہیں اور وہ یہ کہ یہ دو احکام فقط دین اسلام میں ہی موجود نہیں بلکہ گذشتہ امتوں میں بھی اس پر تاکید کی جاتی رہی ہے، (اگرچہ اسلام میں اس کی شکل وصورت بنیادی اور وسیع تر ہے) قرآن اس دانشمند اور حکیم شخص لقمان کی زبانی یوں نقل کرتا ہے: اے میرے فرزند! نماز قائم کرو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وظیفہ انجام دو اور اپنے اوپر نازل ہونے والی مصیبت پر صبر کرو (کیوں) کہ یہ اہم اور اساسی امور ہیں!

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

اس مقام پر انسان کی کامیابی کے چار عوامل واسباب بیان کئے گئے ہیں: نماز قائم کرنا، معروف کا حکم، منکر سے نہی اور صبر واستقامت۔ اس جملے: ''اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ'' (یعنی یہ اہم امور میں سے ہے) کا اشارہ ممکن ہے خاص طور پر صبر واستقامت کی طرف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق چاروں اصول سے ہو۔ یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ صبر واستقامت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ساتھ ساتھ ہونا ان دونوں کے باہمی اور قریبی رابطے کی طرف اشارہ ہو۔ اس لئے کہ ان دو عظیم الٰہی ذمہ داریوں کو انجام دینا بسا اوقات شدائد ومشکلات کے ہمراہ ہوتا ہے، اور صبر واستقامت کے بغیر ان دو مقاصد کو حاصل نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح یہ دو نماز سے بھی قریبی تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ نماز فحشاء اور منکر سے نہی (منع) کرتی ہے یا بالفاظ دیگر نماز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصلی پایہ ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ' (عنکبوت/ ۴۵)

یہ عظیم ذمہ داری؛ روایات کی نظر میں

روایات واحادیث میں بھی اس اہم ذمہ داری کو انجام دینے کی غیر معمولی انداز میں تاکید کی گئی ہے اور اسے تمام فرائض الٰہی کے اجراء ونفاذ کا ضامن اور امن وامان اور آبادی نیز عدل وانصاف کے پھیلنے اور رائج ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

''مَنْ اَمَرَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ فَهُوَ خَلَيفَةُ اللهِ فی اَرْضِهِ، وَخَلَيفَةُ رَسُولِ اللهِ، وَخَلِيفَةُ كِتابِهِ''

"جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے وہ خدا کی زمین پر اس کا خلیفہ ہے اسی طرح وہ رسول خداؐ اور کتاب خدا کا بھی خلیفہ ہے۔" [1]

یعنی وہ بالکل انہی جیسے کام انجام دیتا ہے۔

۲۔ آنحضرتؐ کی ایک اور حدیث میں واضح طور پر ملتا ہے کہ آپؐ منبر پر رونق افروز تھے کہ ایک شخص نے آپؐ سے پوچھا، اے رسول خداؐ! مَنْ خَیْرُ النّاسِ؟ کون سب لوگوں سے بہتر ہے؟ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا:

"اَمَرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاَنْهاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَتْقاهُمْ لِلّٰهِ وَاَرْضاهُمْ"

"وہ شخص جو سب سے زیادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وظیفہ انجام دے اور سب سے زیادہ متقی اور خدا کی رضا پر راضی ہو۔" [2]

۳۔ رسول اکرمؐ ایک اور حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

"لَتَامُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْلَيَعُمَّنَّكُمْ عَذابُ اللّٰهِ:"

تم سب کو ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا چاہیے ورنہ یقینی طور پر عذاب الٰہی تمہارا گھیراؤ کر لے گا۔ [3]

۴۔ ایک معروف حدیث میں حضرت علیؑ بھی فرماتے ہیں:

"وَما اَعْمالُ الْبِرِّ كُلُّها وَالْجِهادُ فی سَبیلِ اللّٰهِ عِنْدَ الاَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهی عَنِ الْمُنْكَرِ اِلاّ كَنَفْثَةٍ فی بَحْرٍ لُجّیٍّ"

"تمام نیک اعمال بشمول جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں جیسے آب دہن (لعاب دہن) کے مقابلے میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔" [4]

۵۔ امام محمد باقر - ایک مختصر مگر واضح بیان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فلسفے اور حکمت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں: اس مختصر عبارت میں ان دو عظیم فریضۂ الٰہی کے سات مقاصد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، آپؑ فرماتے ہیں:

"اِنَّ الاَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهیَ عَنِ الْمُنْكَرِ فَریضَةٌ عَظیمَةٌ بِها تُقامُ الْفَرائِضُ وَتَامَنُ

---

[1] مجمع البیان، ذیل آیہ ۱۰۴ آل عمران، ج ۲، ص ۴۸۴

[2] مجمع البیان، ذیل آیہ ۱۰۴ آل عمران، ج ۲، ص ۴۸۴

[3] ۳۔ وسائل الشیعۃ، ج ۱۱، ص ۴۰۷، حدیث ۱۲، باب ۳، ابواب امر بہ معروف و نہی از منکر

[4] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۳۷۴

الْمَذاهِبُ وَتُحَلُّ الْمَكاسِبُ وَتُرَدُّ الْمَظالِمُ وَتَعْمُرُ الْاَرْضُ وَ يُنْتَصَفُ مِنَ الْاَعْداءِ وَيَسْتَقِيمُ الْاَمْرُ"

ترجمہ: "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرائض الٰہی میں سے ایک اہم فریضہ ہے کہ باقی فرائض اس کے ذریعے برپا اور قائم ہوتے ہیں، ان دو کے ذریعے راستے پر امن ہو جاتے ہیں، کاروبار اور کمائی حلال ہوتی ہے، مظلوموں کے حقوق ان تک پہنچتے ہیں، زمین آباد ہو جاتی ہے، دشمنوں سے انتقام لینا ممکن ہو جاتا ہے اور تمام امور اپنے صحیح راستے پر چل پڑتے ہیں۔"[1]

اس موضوع سے متعلق اسلامی پیشواؤں سے اس قدر احادیث نقل ہوئی ہیں کہ اگر انھیں جمع کیا جائے تو ایک مستقل اور علیحدہ کتاب بن جائے۔ اس مقام پر چند نکات کی جانب توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ حکومت کی بہترین قسم وہ ہے جس میں تمام لوگ شریک ہوں، بالفاظ دیگر حکومت کے پائے عوام کے کندھوں پر ہوں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دراصل مسئلہ حکومت کو عمومیت بخشنے اور اس (حکومت) میں عوامی شرکت کو یقینی بنانا ہے، اس لئے کہ اسی طریقے سے بہت سے جرائم کی روک تھام ہو سکتی ہے اور لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے آشنا ہو سکتے ہیں اور اس بات کے پیش نظر کہ جرائم کا مقابلہ کرنے والے مامورین (جیسے پولیس وغیرہ) کی تعداد ان لوگوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے جن سے ارتکاب جرم کا خوف ہوتا ہے، لہٰذا ایسی صورتحال میں اس اسلامی فریضے کی اہمیت واضح تر ہو جاتی ہے کیونکہ فقط اسی طریقے سے معاشرے کی بہتری اور فلاح کا سامان مہیا ہو سکتا اور جرائم کی راہ روکی جا سکتی ہے۔

وہ فرمان جو یہ کہتا ہے کہ اگر گھر کے اندر فرزند کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے والدین اس کے ذمہ دار ہیں اور اگر ماں باپ کسی جرم کے مرتکب ہوں تو بالغ فرزند ان کی نسبت ذمہ داری کا ثبوت دے، اسی طرح اگر دنیا کے مشرقی حصے میں کوئی گناہ واقع ہو اور مغربی حصے میں موجود کوئی شخص اس کی روک تھام پر قادر ہونے کے باوجود اسے نہ روکے تو وہ اس گناہ میں شریک سمجھا جائے گا، یہ فرمان بلاشبہ گناہ کی روک تھام اور ذمہ داریوں کو انجام دینے کی دعوت میں نہایت عمیق و وسیع اثر کا حامل ہے۔

یہ سب کچھ ایسی صورتحال میں ہے کہ آج کی دنیا اور تمام الحادی و مادی حکومتوں میں جرائم و مفاسد کو روکنے کی ذمہ داری ایک چھوٹے سے خاص گروہ کے سپرد کر دی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کارکردگی بہت محدود اور کم ہے۔ یہیں سے اس اسلامی فرمان کی اہمیت و عظمت کے ساتھ ساتھ حکومت اسلامی کا عوامی ہونا بھی واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عوام ایک پولیس مین کی طرح عمل کریں، بلکہ ان کا فریضہ نیکی کی دعوت اور برائی سے مقابلے کی حد تک ہے اور یہ عمل کبھی وعظ و نصیحت اور کبھی فاسد اور مفسد افراد سے قطع تعلق کی صورت میں ہوتا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعۃ، ج ۱۱ ص ۳۹۵، حدیث ۶، باب ۱

۲۔تعزیرات کی بحث میں یہ کہا جا چکا ہے کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وسیع حکم کا ایک شعبہ ہیں، وہی شعبہ جس کا اختیار فقط حاکم شرع کو حاصل ہوتا ہے اور دوسرے اس میں دخالت کا کوئی حق نہیں رکھتے، اور جیسا کہ وہاں بھی ذکر ہوا ہے کہ تعزیر کا مقصد گناہوں کے ارتکاب اور ان کی تکرار سے باز رکھنا ہے اور اس راہ میں قاعدہ اَلاَسۡهَلُ فَالاَسۡهَلُ (آسان سے آسان تر) سے استفادہ کرنا چاہیے یعنی ہمیشہ سادہ تر مراحل سے آغاز اور ان کے غیر مؤثر ہونے کی صورت میں پیچیدہ اور سخت تر رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ دوستانہ یاددہانی، نرم انداز میں سرزنش، شدید سرزنش، بے توجہی اور قطع تعلق اور آخر کار زندان و تازیانہ، جرمانہ، معاشرتی اور اجتماعی توہین و توبیخ اور اس طرح کی دوسری چیزیں، یہ سب وہ مراحل ہیں جو تعزیر کے طور پر انجام دیئے جاتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ سب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نمونے اور مصادیق ہیں۔ اس دلیل کو پیش نظر رکھتے ہوئے حدود و تعزیرات سے متعلق فقہی مباحث میں تعزیر کے جواز و مشروعیت کو ثابت کرنے کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دلائل پر تکیہ اور اعتماد کیا جاتا ہے۔

۳۔ان دو الٰہی ذمہ داریوں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کی اجتماعی امن و امان، نفاذ و اجراء قوانین، منکرات کے خلاف جنگ، جرائم اور قیدیوں کی تعداد کم ہونے اور تمدن اجتماعی کی ترقی و پیشرفت میں مددگار ہونے میں، تاثیر، (اثر اندازی) ناقابل انکار ہے اور تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو معاشرہ ان دو ذمہ داریوں کو شعوری اور صریح طور پر انجام دے وہ پاک صاف اور امن و امان کا گہوارہ بن جائے گا اور وہ لوگ جو ان دو سے غفلت برتتے ہوئے انھیں فراموش کر دیں اور جرائم اور گناہوں کے معاملے میں الگ تھلگ رہیں، منحوس نتائج و عواقب سے روبرو ہوں گے اور ظلم و فساد اور فحاشی وغیرہ ان کے گھروں میں بھی داخل ہو جائیں گے اور ایسے معاشرے میں کوئی شخص امن محسوس نہیں کر پائے گا اور بالکل ویسے ہی جیسے رسول اکرمؐ کی حدیث مبارک میں بیان ہوا ہے، مصیبت اور عذاب الٰہی ان کے دامن گیر ہو جائے گا اور امام علیؑ کے الفاظ میں ایسی صورتحال میں حل مشکلات اور دفع مصیبت کے لئے نیک لوگوں کی دعا بھی بارگاہ الٰہی میں قبول نہیں ہو گی۔

"فَيُوَلّٰى عَلَيۡكُمۡ شِرَارُكُمۡ ثُمَّ تَدۡعُونَ فَلا يُسۡتَجَابُ لَكُمۡ"[1]

۴۔امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عمل جیسا کہ معلوم ہے حقیقی طور پر ثقافتی اور تمدنی عمل سے شروع ہوتا ہے، اس بناء پر ذرائع نشر و ابلاغ اور تمام سمعی و بصری تبلیغات (نشریات) جو کسی نہ کسی طرح لوگوں کی علمی سطح بلند کرنے اور انھیں نیکی و پاکیزگی، اخلاق انسانی، اصول فضیلت اور فساد سے بیزاری کی طرف متوجہ کرنے سے سروکار رکھتے ہیں، یہ سب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دائرے میں ایک خاص جگہ اور مقام رکھتے ہیں یہاں تک کہ تعلیم و تربیت کے مراکز اور اعلیٰ علوم، جو نونہالوں اور جوانوں کو درست اعتقادی اصول، انسانی معیار اور اجتماعی قوانین و آداب سے روشناس کراتے اور ان کی تعلیم و تربیت کے اقدام کرتے ہیں، کا بھی اس دائرے میں ایک خاص مقام ہے، کیونکہ یہ سب امور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شریک ہو سکتے ہیں، لہٰذا ان دو اہم اجتماعی ذمہ داریوں کو نافذ کرنے میں ان مراکز کا کردار واضح ہو جاتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۴۷۔

یہ نکتہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ عام طور پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فروع دین کے دو شعبے شمار کیا جاتا ہے لیکن ایک لحاظ سے ان کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ اصول اعتقاد کے ایک بڑے حصے کو بھی اپنے دائرے میں شامل کر لیتا ہے کیونکہ یہ سب اس راہ میں مؤثر اور کارساز ہیں اور عقائد کی اساس کو مضبوط کر کے ہی مفاسد سے جنگ ممکن ہے، اسی طرح عبادات بھی ان کا مقدمہ ہیں۔

۵۔ بعض حضرات کے گمان کے برعکس، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک مذہبی رسم ہی نہیں بلکہ ایک واضح عقلی فلسفے کا بھی حامل ہے۔ (غور فرمائیں)

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اجتماعی روابط کے پیش نظر اور یہ کہ کوئی اچھا یا برا کام، معاشرۂ انسانی میں ایک خاص مقام تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ دوسرے مقامات تک بھی جا پہنچتا ہے، ایک برائی آگ کی طرح ہوتی ہے کہ جس پر اگر قابو نہ پایا جائے تو مسلسل دوسری جگہوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر خاکستر کر دیتی ہے، لہٰذا فساد اور برائیوں کے خلاف جنگ ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے بہترین تعبیر وہی ہے جسے رسول اکرمؐ کی ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ:

''ایک گناہ گار اور جرائم پیشہ شخص لوگوں کے درمیان اس احمق شخص کی مانند ہے جو لوگوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا ہو، اور جب کشتی وسط سمندر میں پہنچ جائے تو وہ کلہاڑا اٹھا کر اپنی جگہ کو کاٹ کر اس میں سوراخ کرنے پر تل جائے، لوگوں کے اعتراض کرنے پر ان کو یہ جواب دے کہ میں اپنے حصے کی جگہ پر سوراخ کر رہا ہوں تمہیں اس سے کیا مطلب ہے؟ یقیناً یہ ایک احمقانہ بات ہے، اگر دوسرے لوگ اسے اس خطرناک کام سے باز نہیں رکھتے، تو تھوڑی ہی دیر میں سب غرق ہو جائیں گے''۔[1]

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۳، ص ۱۴۲۔

یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دوسروں کی نجی (پرائیویٹ) زندگی میں قطعاً کوئی مداخلت نہیں بلاشبہ اسلام دوسروں کی خصوصی (ذاتی) زندگی میں مداخلت اور ان کے امور میں تجسس کو حرام قرار دیتا ہے اور قرآن اسے واضح طور پر بیان کرتا ہے (سورۂ حجرات) لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی محدودیت اجتماعی طور پر ناپسندیدہ عمل ہے جو معاشرے کی تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے، لوگوں کی تقدیر ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور معاشرے کے ہر فرد کا جرم و انحراف پورے معاشرے کے انحراف کا باعث بنتا ہے۔

اس بناء پر کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں سے یہ کہے کہ تمہارا اس سے کیا تعلق؟ (جاؤ اپنا کام کرو) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہم سب کا ہے، اس لئے کہ ہم سب کی تقدیر ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ مثلاً حکومت وبائی امراض کی روک تھام کے لئے اپنے مامورین کو ویکسینیشن پر مامور کرتی ہے کیا کسی کو حق حاصل ہے کہ وہ ان سے یہ کہے: تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟ بیمار ہوں گا تو میں، خطرے کا سامنا میں نے کرنا ہے، چلو اپنا رستہ لو، تم کون ہوتے ہو میری ذاتی زندگی میں مداخلت کرنے والے؟! سارے لوگ اسے یہی جواب دیں گے کہ تمہاری سلامتی دوسروں کی سلامتی سے جدا نہیں اور تمہاری بیماری دوسروں کے بیمار ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ہم سب کے ساتھ مربوط ہے، اس بناء پر قبول کرنا چاہیے کہ ان دو فریضوں کی انجام دہی انسان کی اجتماعی زندگی کے آثار سے متعلق ہے اور اسی طرح ان کا تعلق اجتماعی حقوق وفرائض سے بھی ہے۔ یہ تھا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اس کا اسلامی حکومت کے اہداف ومقاصد میں پیشرفت کے کردار کا خلاصہ۔

حکومت اسلامی میں حسبہ اور محتسب کا ادارہ

یہ بحث امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ساتھ مکمل طور پر مربوط ہے اور درحقیقت یہ اسی بحث کا ایک شعبہ ہے کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو شعبے ہیں، پہلا شعبہ عمومی ہے جس کا تعلق تمام لوگوں کے ساتھ ہے، دوسرا شعبہ خصوصی ہے جس کا ربط حکومت کے ساتھ ہے، اس خصوصی شعبے میں ممکن ہے شدت اور سختی کرنا ایک لازمی امر ہو اور ایسا کرنا عوام کا کام نہیں، بلکہ حکومت کے تجربہ کار افراد (مامورین) ہی اس کے ذمہ دار ہیں، اور یہ عمل ''حسبہ'' کی اساس کو تشکیل دیتا ہے۔[1]

وضاحت:

''حسبہ'' لغت میں مادہ احتساب سے اسم مصدر ہے اور جیسا کہ اہل لغت نے کہا ہے کہ اس کا مطلب اجر خدا کی طلب کے لئے مشکلات کے مقابلے میں صبر اور سر تسلیم خم کرنا ہے، اسی طرح ثواب کی خاطر اعمال خیر کو انجام دینے کی کوشش کرنا بھی اس کا ایک معنی ہے اور چونکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا یہ شعبہ اطاعت خدا کی راہ میں اور اس کی رضا حاصل کرنے اور منکرات کے خلاف جنگ کرنے کے لئے کوشش کرنا ہے لہٰذا اسے ''حسبہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ کتاب التحقیق میں ''حسبہ'' کے اصل معنیٰ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ لفظ دراصل آزمائش کے قصد سے فکر ونظر کو استعمال کرنے اور تحقیق اور عمل درآمد کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ تفسیر محتسب کے کام سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ وہ معاشرے (ملک) کے مختلف حصوں سے خبریں حاصل کر کے ان کے مطابق عمل درآمد کرتا ہے اور ہر حرکت کو پیش نظر رکھتا ہے اور اس (حرکت) کے انحرافی ہونے کی صورت میں یاددہانی کراتا ہے اور اگر اس کا کوئی اثر نہ ہو تو طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔

ادارہ ''حسبہ'' خلفاء کے دور میں ایک معروف ادارہ ہوتا تھا جو کاریگروں، اہل تجارت، کاشتکاروں اور عوام کے امور کی منکرات اور جرائم کے اعتبار سے نگرانی کرتا تھا اور محتسبین جہاں بھی خلاف قانون کارروائی دیکھتے فوراً اس کے مرتکب فرد یا افراد کو منع کرتے اور مؤثر نہ ہونے کی صورت میں ان افراد کو اسی جگہ سزا دیتے یا گرفتار کر کے قاضی وزندان کے سپرد کر دیتے۔

بعض حضرات کی رائے میں اس مسئلے کی اصل کی برگشت زمانہ رسول اکرمؐ کی طرف ہے، آپؐ بذات خود محتسب کا وظیفہ انجام دیتے تھے اور کبھی اپنی غیبت کے دوران کسی اور کو یہ وظیفہ انجام دینے کے لئے انتخاب فرماتے، لیکن یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ اس زمانے حتیٰ کہ

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، ج ۲، مادۂ حسب۔

قدیم فقہاء کے دور میں بھی اس لفظ کو (اس معنی میں) استعمال کرنے کا رواج اور معمول نہیں تھا، اور ایسے لگتا ہے کہ یہ لفظ پہلی بار اموی اور عباسی خلفاء کے دور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس شعبے کے لئے انتخاب کیا گیا۔

بہرحال رسول اکرمؐ کے زمانے کی اخبار و روایات جو ہم تک پہنچی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ لفظ ''حسبہ'' آج کے معنی ومفہوم میں اس وقت رائج نہیں تھا لیکن اس کا حقیقی مفہوم یعنی حکومت اسلامی کی اجتماعی امور پر نگرانی کی مکمل طور پر رعایت کی جاتی تھی کبھی رسول اکرمؐ یہ وظیفہ کسی اور کو سونپ دیتے اور کبھی اسے بذات خود انجام دیتے تھے۔

ان احادیث میں سے ایک یہ حدیث ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ فتح مکہ کے بعد رسول اکرمؐ نے سعید بن عاص کو بازار مکہ پر مامور فرمایا (تاکہ وہ درست اور عادلانہ خرید وفروخت پر نظر رکھیں)

''اِسۡتَعۡمَلَ رَسُولُ اللّٰہِ سَعِیدَبۡنَ سَعِیدِبۡنِ الۡعاص بَعۡدَ الۡفَتۡحِ عَلی سُوقِ مَکَّۃِ۔'' [۱]

یہاں تک کہ بعض روایات بتاتی ہیں کہ بعض عورتیں، عورتوں سے مربوط مسائل (پردہ وغیرہ) کی نگرانی کرتی تھیں، ان میں سے ایک عورت ''سحراء بنت نھیک'' [۲] بھی تھی جس نے آنحضرتؐ کا زمانہ پایا تھا، یہ عورت اس کام پر مامور تھی، بازاروں میں گردش کرتی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی تھی (اگرچہ بعض کی رائے میں وہ رسول اکرمؐ کی بجائے خلیفۂ دوم کے دور میں اس کام پر مامور تھی)۔ [۳]

اور بہت سے موقعوں پر رسول اکرمؐ بذات خود یہ اہم وظیفہ دیتے خاص طور پر لین دین میں ملاوٹ جعل سازی اور ذخیرہ اندوزی کے مسائل پر کڑی نظر رکھتے۔ ان میں سے ایک حدیث کا مضمون یہ ہے:

''اِنَّ رَسُولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم مَرَّ بِالۡمُحۡتَکِرِینَ فَاَمَرَ بِحُکۡرَتِہِمۡ اَن تُخۡرَجَ اِلی بُطُونِ الۡاَسۡواقِ، وَحَیۡثُ تَنۡظُرُ الۡاَبۡصارُ اِلَیۡہا''

ترجمہ: رسول اکرمؐ نے ذخیرہ اندوزوں کی ایک جماعت کے پاس سے گذرتے ہوئے انھیں حکم دیا کہ وہ ذخیرہ شدہ چیزوں کو بازار میں لوگوں کے سامنے لے آئیں۔ [۴]

لوگوں نے تجویز پیش کی کہ اے رسول خدا ان چیزوں کا نرخ بھی معین فرما دیں لیکن آپؐ نے نرخ کی تعیین سے اجتناب فرمایا۔

ایک اور حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اکرمؐ ایک ایسے شخص کے پاس سے گذرے جس نے اچھے اور ناقص غلے کو آپس میں ملا دیا تھا، آپؐ نے فرمایا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کیا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ اس طرح سارا غلہ فروخت ہو جائے گا، آپؐ نے یہ سن کر فرمایا:

---

[۱] الترتیب الادریہ نوشتہ کتانی، ج۱، ص۲۸۵ (کتانی نے یہ روایت استیعاب عبدالبر سے نقل کیا ہے)۔

[۲] نھیک (شریک کے وزن پر ہے در اصل طاقتور اونٹ اور کاٹدار تلوار کے معنی میں ہے افراد قاطع کو نھیک کہا جاتا ہے)

[۳] التراتیب الادرایہ نوشتۂ کتانی، ج، اص۲۸۵

[۴] وسائل، ج۱۲، ص۳۱۷، حدیث۱، باب۳

"مَيِّزْ كُلِّ واحِدٍ مِنْهُما عَليحِدّة لَيْسَ فى دينِنا غِشّ!"

ہر ایک کو دوسرے سے جدا کردو (اور ہر حصے کی علیحدہ قیمت مقرر کرو) ہمارے دین میں جعل سازی اور ملاوٹ (کی کوئی گنجائش) نہیں![1]

عہدنامہ مالک اشتر میں بھی ذکر ہوا ہے کہ جناب امیرؑ نے انھیں فرمان دیا:

"اِمْنَعْ مِنَ الاِحْتِكارِ فَاِنَّ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وآله وسلم مَنَعَ مِنْه، وَلْيَكُنْ الْبَيْعُ بَيْعاً سَمِعاً بِموازينَ عَدْلٍ، وَ اَسْعارٍ لاتُجْحِف بِالْفَريقَيْنِ مِنَ الْبائِعِ وَ الْمُبْتاعِ، فَمَنْ قارَفَ حَكْرَةً بَعْدَ نَهْيِكَ اِيّاهُ فَنَكِّلْ بِهِ وَ عاقِبْهُ فى غَيْرِ اِسْرافٍ"

ذخیرہ اندوزی کو سختی کے ساتھ روکو کیونکہ رسول اکرمؐ نے اس سے منع فرمایا ہے، معاملات آسان شرائط کے ساتھ طے کئے جائیں، عادلانہ ترازو اور مناسب نرخوں کے ساتھ خرید و فروخت ہونی چاہیے اس طرح کہ نہ فروخت کرنے والا اور نہ ہی خریدار نقصان و زیاں کے شکار ہوں اور اگر کوئی تمہارے منع کرنے کے باوجود ذخیرہ اندوزی سے باز نہ آئے تو اسے سزا دو ایسی سزا جو حد سے زیادہ نہ ہو۔[2]

اسی طرح ہم حضرت علیؑ کے حالات زندگی میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ آپؑ ذاتی طور پر حسبہ سے مربوط امور کی ذمہ داری انجام دیتے تھے، کبھی قصابوں کے بازار سے آپؑ کا گذر ہوتا تو انھیں خلاف قانون اعمال سے منع فرماتے۔[3] اور کبھی ماہی گیروں کے کام کی نگرانی کرتے اور انھیں حرام مچھلیاں فروخت کرنے سے منع فرماتے۔[4]

لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مسئلہ حسبہ نے وسعت حاصل کرلی اور رفتہ رفتہ اس نے ایک اہم اور وسیع ادارے کی صورت اختیار کرلی اور اس کے مامورین محتسب کے نام و عنوان سے کوچہ و بازار اور چھوٹی بڑی سڑکوں پر شب و روز گشت کرتے اور مختلف اجتماعی معاملات پر نظر رکھتے اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو موقع ہی پر سزا دیتے اور کبھی مجرم کو گرفتار کر کے قاضی کے پاس بھیج دیتے (جیسے آج کل ٹریفک پولیس کرتی ہے)۔

دائرہ حسبہ میں اس قدر وسعت آ گئی کہ تمدن اسلامی کا مشہور مورخ جرجی زیدان اس بارے میں لکھتا ہے: حسبہ، قضاوت کی مانند ایک دینی منصب ہے اور قاضی کی طرح محتسب بھی ناپسندیدہ امور (خلاف قانون امور اور برائیوں) پر نظر رکھا اور لازم حد تک تعزیر اور تا

---

[1] کنزالعمال، ج۴، ص۱۵۹۔

[2] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

[3] کنزالعمال، ج۴، ص۱۵۸

[4] وسائل، ج۱۶، ص۳۳۲

دیب کرسکتا ہے اور وہ بھی لوگوں کو شہروں میں عمومی مصلحتوں کی رعایت کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جیسے گذرگاہوں کو مسدود کرنے سے روکنا، سامان کی نقل وحمل کرنے والوں اور صاحبان کشتی کو اس بات سے روکنا کہ وہ سواری پر حد سے زیادہ سامان نہ لادیں اور زیادہ افراد کو نہ سوار کریں، اسی طرح وہ یہ حکم بھی صادر کرتا ہے کہ گرنے والی خطرناک دیواروں کو منہدم کردیا جائے اور راہگیروں کو نقصان پہنچانے والی ہر چیز کو راستے سے ہٹادیا جائے اور اسی طرح کاروباری اموراور وزن و پیمانے میں جعلسازی اور دھوکہ دہی پر نظر رکھتے ہوئے ہر قسم کے جوروستم اور ناانصافی کی روک تھام کا اہتمام کرتا ہے۔

یہ امور دراصل قاضی کے فرائض تھے،لیکن چونکہ قاضی عملاً ان تمام امور کو انجام نہیں دے سکتا تھا لہٰذا انھیں علیحدہ کر کے انھیں ایک جدا فریضہ قرار دیا گیا۔اس امر (فریضے) کی سربراہی اور نگرانی لازمی طور پر ایک صالح اور دیندار شخص کے سپرد کی جاتی تھی کیونکہ یہ ایک خدمت دینی شمار ہوتی تھی (اور محتسب اس مقام ومنصب کے بغیر اس سے عہدہ برآ ہونے پر قادر نہیں ہوتا تھا)۔امور حسبہ کا نگران تحقیقات کی خاطر بقیہ علاقوں میں اپنے نمائندے بھی مقرر کرتا تھا،وہ روزانہ کسی مسجد میں قیام کرتا اور اس کے نمائندے بازاروں میں پیشہ ور اور کاروباری افراد پر نظر رکھتے تھے۔

مصر میں امور حسبہ کا سربراہ (نگران) ایک دن مسجد قاہرہ اور دوسرے دن مسجد فسطاۃ میں بیٹھ جاتا اور اپنے نمائندوں کو کوچہ وبازار میں بھیج دیتا تاکہ وہ گوشت کی کیفیت اور کھانے پکانے کے مراکز پر نظر رکھ سکیں اور اسی طرح چارپایوں پر لادے جانے والے بوجھ کی بھی نگرانی کریں اور کسی کو اجازت نہ دیں کہ وہ ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ لادیں، پانی بھر کرلانے والے ماشکیوں کو پانی کے ظروف کو ڈھک کر رکھنے کا حکم دیتے اور یہ کہ وہ پانی کے ظرف کی ظرفیت کی مقدار یعنی چوبیس ڈول کا خیال رکھیں کریں اور اپنے بدن کی حفاظت کی خاطر چھوٹی چھوٹی زرد قمیضیں پہنے رکھیں۔(یہ نمائندے) مدرسہ ومکتب کے معلمین کو آگاہ کرتے کہ وہ بچوں کو شدید اور سخت سزائیں نہ دیں اور جسم کے نازک حصوں پر مارنے سے اجتناب کریں،اسی طرح عوام الناس کے ساتھ ساتھ معلمین کے لئے بھی یہ حکم تھا کہ وہ والدین کو آگاہ کریں کہ وہ اپنی اولاد کو فریب دینے سے گریز کریں۔

اسی طرح محتسب ٹکسال (سکے ڈھالنے کے ادارہ) پر بھی نظر رکھتا تھا کہ کہیں جعلی سکے نہ بنائے جائیں (یعنی ان میں سونے یا چاندی کی مقدار کم ہو)۔اندلس میں اس منصب کو "خطَّةُ الاِحتِساب" کہا جاتا تھا جس کی سرپرستی ایک قاضی کے سپرد ہوتی تھی،اس کا معمول ہوتا تھا کہ وہ خود سوار ہوکر بازاروں میں گشت کرتا اور اس کے مامورین اور مددگار اس کے ہمراہ ہوتے تھے،آٹے کے پیڑوں کا وزن معلوم کرنے کے لئے مخصوص ترازو اس کے ایک ساتھی کے ہاتھ میں ہوتا (تاکہ اگر روٹی کا وزن مقررہ وزن سے کم ہوتو اس نان فروش کو سزا دی جائے) اسی طرح ضروری تھا کہ قصاب کی دوکان میں گوشت پر ایک کاغذ لگا ہو جس پر گوشت کی قیمت درج ہوتا کہ قصاب اسے زیادہ قیمت پر نہ فروخت کرسکے،خیانت کی صورت میں فروخت کرنے والے کی خیانت مخفی نہیں رہتی تھی کیونکہ بعض اوقات محتسب کسی کنیز یا بچے کو بازار سے کوئی چیز خریدنے کے لئے بھیجتا، پھر محتسب خود اس کا وزن اپنے پاس موجود ترازو پر کرتا، اگر وزن کم ہوتا تو اس سے وہ یہ اندازہ لگا لیتا کہ باقی لوگوں کے ساتھ بھی اس کالین دین ایسا ہی ہوگا (لہٰذا اسے قانون کے مطابق سزا دیتا)۔وہ لوگ حسبہ سے مربوط بہت سے

موجودہ قوانین کو اپنے مدارس میں پڑھاتے بالکل ایسے ہی جیسے فقہاء احکام فقہ کی تدریس کرتے ہیں۔[1]

اس مجموعی کلام اور حسبہ کے بارے میں تحریر شدہ کتابوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آج جو کام بلدیہ، پولیس، حکومتی تعزیرات، محکمۂ تعلیم اور قضاوت کے سپرد ہیں، ادارہ حسبہ ان کا ذمہ دار تھا۔ اور یہ حکومت اسلامی کا ایک فعال شعبہ شمار ہوتا تھا، خاص طور پر منکرات کے خلاف اس کی جنگ بے حد اہمیت کی حامل ہے، یہی وجہ ہے کہ شعراء کے کلام میں محتسب اور اس کے کارہائے نمایاں واضح طور پر منعکس ہیں۔

بعض منابع و مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ محتسب ہونا واجب کفائی کے عنوان سے مسلمانوں کے درمیان معروف رہا ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "حسبہ" امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک شاخ (شعبہ) ہے اور یہاں تک کہ عورتوں میں سے بعض افراد کو اس منصب کے لئے انتخاب کیا جاتا تھا تاکہ وہ خواتین سے مربوط امور کی نگرانی کریں۔

"دائرۃ المعارف دھخدا" میں وظائف محتسب کی بحث میں ہے: محتسب کا وظیفہ (فریضہ) اولاً مذہبی قوانین کا اجراء و نفاذ اور اعمال حرام سے منع کرنا تھا، اور ثانیاً ان امور کے صحیح طور پر نافذ العمل ہونے پر نظر رکھتا تھا، جن کا تعلق معاشرے کے افراد کے عمومی روابط اور ان کی فلاح و بہبود سے ہو، اسی طرح اس کی ذمہ داری یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ راہوں کو مسدود یا تنگ کرنے کے عمل کو روکے۔ اسی طرح پیمانے اور وزن کی نگرانی، جو آج کل بلدیہ کے ذمے ہے، محتسب کی ذمہ داری تھی، یہ تمام امور دراصل قاضی کے ذمے ہوتے تھے لیکن بعد از اں اسے ایک علیحدہ ذمہ داری قرار دے دیا گیا تاکہ قاضی پر ان امور کا اضافی بوجھ نہ پڑے۔[2]

اسی طرح اس کتاب میں وظائف محتسب کو مَعَالِمُ الْقُرْبَةِ نامی کتاب سے تفصیلاً نقل کیا گیا ہے کہ شاید یہ کتاب احکام حسبہ کے بارے میں جامع ترین کتاب ہو، اس میں تقریباً ان تمام امور کی نگرانی محتسب کی ذمہ داری ہے۔ مثلاً تمام قسم کے کاروبار، پیداواری اور ملازمتی مسائل اور تعلیم و تربیت وغیرہ۔ ان امور میں سے بعض یہ ہیں: کوچہ و بازار میں امور منکر پر کڑی نظر رکھنا، نانبائیوں کے امور اور وزن و پیمانہ کی درستگی، ذبح کرنے والوں اور ذبح خانوں کی شرائط کے بارے میں تحقیقات، صاحبان حمام، اطباء، اساتذہ، مؤذن حضرات، خادمین مسجد، واعظان، مکتوب نویسان کے مسائل اسی طرح تاجروں، تیراکوں، معماروں، دلالوں، صرافوں، اور زرگروں وغیرہ کے امور کی تحقیق اور ان کی نگرانی بھی محتسب کا وظیفہ شمار ہوتی تھی۔[3]

جہاں تک مسئلہ حسبہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مابین فرق و تفاوت کی بات ہے تو بعض کتابوں جیسے الاحکام السلطانیہ میں بہت سارے فرق اور اختلافات گنوائے گئے ہیں جن کی تعداد نو تک جا پہونچتی ہے [3] لیکن ان سب کو ایک جملے میں بطور خلاصہ بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ: حسبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہ شعبہ ہے جس کا حکومت کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جو لازم اور ضروری موقعوں

---

[1] تاریخ تمدن اسلامی جرجی زیدان، ج ۱ ص ۲۵۲

[2] لغت نامہ دھخدا، مادۂ حسبہ

[3] لغت نامہ دھخدا، مادۂ حسبہ

پر شدت عمل اور سختی کو بھی اختیار کر سکتا ہے، بنابریں محتسب حکومت کی طرف سے منصوب ہوتا ہے اور اسے کچھ لوگوں کی مدد حاصل ہوتی ہے جو معاشرے کے اہم امور کی نگرانی کرتے ہیں۔

یہ سب لوگ بیت المال سے تنخواہ حاصل کرتے ہیں اور ضروری ہو تو مجرمان کو گرفتار کر کے انھیں تعزیر کرتے اور سزا دیتے ہیں، لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمومی شعبہ اس صورتحال کا حامل نہیں ہوتا۔ (غور فرمائیں)

☆☆☆☆☆

رکن چہارم: تعلیم وتربیت

اشارہ

حکومت اسلامی کے اہم ارکان میں سے ایک رکن درست تمدن وثقافت کی اشاعت اور تعلیم وتربیت ہے۔ اس بات کے پیش نظر کہ انسان تمام مخلوقات میں سے ایک متمدن مخلوق ہے یعنی اس کے اعمال اور طرز عمل اس کے افکار اور نظریات سے انعکاس سے ہوتا ہے، معاشرے میں تبدیلی اور ہر قسم کی اصلاح انسانی فکر وروح پر اثر انداز ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ درست اسی وجہ سے آج کے معاشروں میں مختلف سیاسی اجتماعی، عسکری اور اقتصادی مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اقوام کی تہذیب وتمدن پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ذرائع ابلاغ یعنی میڈیا چاہے مطبوعات (کتابوں اور اخباروں) کی صورت میں ہو، یا ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ کی صورت میں ہو اُسے ارکان حکومت کے ایک رکن کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور حکومت کے تین ستونوں (مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ) کے مقابلے میں چوتھا ستون شمار کیا جاتا ہے، بلکہ بہت سے دانشوراسے حکومت اور معاشرے کا سب سے اہم رکن (ستون) قرار دیتے ہیں اور اس پر بہت زیادہ سرمایہ بھی خرچ کیا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے نہ کہ مبالغہ آرائی، کیونکہ اگر ذرائع ابلاغ ونشریات (میڈیا) صحیح وسالم ثقافت کی نشر واشاعت کے لئے ایک جامع اور مؤثر لائحہ عمل تشکیل دیں تو مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کو پنپنے کا بہتر موقع ملتا ہے، ان سب کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے اور معاشرے کے افراد خود بخود (بغیر کسی دباؤ کے) اپنے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حکومت اسلامی کا دستور العمل جو قرآن مجید اور سنت قطعی وواقعی سے استنباط اور مرتب کیا گیا ہے اور جس کا تعلق چودہ سو سال پہلے سے ہے، اس (دستور العمل) میں انسان کے تصور سے زیادہ ثقافتی، تعلیمی وتربیتی امور اور بشارت دینے اور انذار کرنے (ڈرانے) پر اعتماد کیا گیا ہے اور مختلف لائحہ عمل کی مختلف شکلوں کو اس مقصد کے لئے توجہ کا مرکز بنایا گیا ہے۔

یہ موضوع نہایت قابل غور ہے کہ حکومت اسلامی کی واضح ترین قسم یعنی؛ رسول اکرمؐ کی حکومت ایک ثقافتی بنیاد پر ہی قائم ہوئی تھی اور آنحضرتؐ نے ایک ثقافتی انقلاب کی بنیاد پر اسے استوار کیا تھا آپؐ نے تیرہ سال مکے میں تعلیم وتربیت اور ثقافت وعقائد اسلامی کی ترویج اور نشر واشاعت میں گذارے اور اپنے اصحاب کی اس انداز سے تربیت فرمائی کہ وہ ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلامی حکومت کے اصلی بانی قرار پائے، یعنی سیاسی واجتماعی نظام، اسی ثقافتی انقلاب کی بنیاد پر قائم ہوا۔ نظریات وافکار کا احیاء، تمام اسلامی دستورات، احکام کا سرچشمہ ہے، یہاں تک کہ رسول اکرمؐ اپنے مخالفین سے فقط یہی تقاضا کرتے ہوئے فرماتے تھے: ''سنجیدگی کے ساتھ اللہ کے لئے قیام کرو پھر خوب غور وفکر کرو''

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا

(سورۂ سبا/۴۶)

رسول اکرمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ التَّفَکُّرَ حیاۃُ قَلْبِ الْبَصیرِ، کَما یَمْشِی الْمُسْتَنیرُ فِی الظُّلُماتِ بِالنُّورِ"

''غور وفکر کرنا ایک بابصیرت دل کی زندگی ہے، جس طرح انسان تاریکی میں روشنی کے ذریعے چلتا ہے۔ [۱]

(یعنی معاشرتی وانفرادی مشکلات کے حل میں غور وفکر تفکر کے نور کے ساتھ قدم آگے بڑھاؤ)۔ ایک اور حدیث میں امام علیؑ فرماتے ہیں:

"بِالْفِکْرِ تَنْجَلی غَیاھِبُ الاُمُورِ"

غور وفکر کے ذریعے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ [۲]

ایک اور معروف حدیث میں ہے:

"تَفَکُّرُ ساعَةٍ خَیْرٌ مِنْ عِبادَةِ سِتّینَ سَنَةٍ"

کچھ دیر غور وفکر کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ [۳]

اور اسی بنیاد پر ہم مندرجہ امور کے بارے میں گفتگو کریں گے اور اس ضمن میں قرآن مجید سے راہنمائی اور مدد لیں گے۔

۱۔ اسلام میں علم، تعلیم اور تربیت کی نشر واشاعت۔

۲۔ فقط علوم دینی ہی اہمیت کے حامل نہیں۔

۳۔ روایات واحادیث میں مفید علوم کا حاصل کرنا۔

۴۔ اسلام میں معلم کا مقام اور۔

۱۔ اسلام میں تعلیم وتربیت

قرآن مجید میں تعلیم، تعلم اور علم کی اشاعت کے بارے میں بکثرت آیات موجود ہیں، لیکن ان سب آیات کے تذکرے کی اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں لہٰذا یہاں ہم ان کی واضح مثالوں اور نمونوں کو اشارتاً ذکر کرتے ہیں:

۱۔ "اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾ [۴]

---

[۱] بحار الانوار، ج ۸۹، ص ۱۷۔

[۲] غرر الحکم۔

[۳] بحار الانوار، ج ۶۶، ص ۲۹۳۔

[۴] (سورۂ طلاق ۱۲)

۲۔ "كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴿۱۵۱﴾ (سورۂ بقرہ/۱۵۱)

۳۔ "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ (سورۂ بقرہ/۱۲۹)

۴۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴿۴۳﴾ (سورۂ نحل/۴۳)

۵۔ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴿۱۲۲﴾

(سورۂ توبہ/۱۲۲)

۶۔ "يُؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴿۲۶۹﴾ "(سورۂ بقرہ/۲۶۹)

۷۔ "اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ﴿۱۵۹﴾ (سورۂ بقرہ ۱۵۹)

ترجمہ:

ا۔ "خدا تعالیٰ وہی ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ان کی طرح زمین بھی، اس کا فرمان مسلسل ان میں نازل ہوتا ہے تا کہ تم جان لو کہ خدا تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔"

۲۔ "اسی طرح جس طرح (قبلہ تبدیل کر کے ہم نے اپنی نعمت تم پر کامل کر دی) ایک رسول کو ہم نے تمہاری طرف بھیجا تا کہ وہ ہماری آیات پڑھ کر تمہیں سنائے اور تمہیں پاک کرے اور تمہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تھے وہ کچھ تمہیں سکھائے۔"

۳۔ "اے پروردگار! ان کے درمیان ایک رسول کو اپنی طرف سے مبعوث فرما تا کہ وہ تیری آیات انھیں پڑھ کر سنائے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور پاک کرے اس لئے کہ تو قدرت اور حکمت والا ہے۔"

۴۔''اور تم سے پہلے سوائے ایسے افراد کے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، ہم نے نہیں بھیجے اے لوگو! اگر تم نہیں جانتے تو ان سے پوچھ لو جو جاننے والے ہیں۔''

۵۔''یہ بات شائستہ نہیں کہ اہل ایمان سب کے سب (میدان جہاد کی طرف) کوچ کریں، ہر گروہ میں سے ایک طائفہ کیوں کوچ نہیں کرتا (اور ایک حصہ مدینہ منورہ میں نہیں رہ جاتا) تاکہ دین (کے معارف واحکام الٰہی سے) آگاہی حاصل کریں اور اپنی قوم کے پاس واپس آنے کے بعد ان کو (عذاب الٰہی) سے ڈرائیں، شاید (وہ لوگ خدا کے حکم کی مخالفت) سے ڈریں اور پرہیز کریں۔''

۶۔''خدا جسے چاہے حکمت (دانش) عطا کرتا ہے، اور جسے حکمت ودانش عطا کی جائے اسے (بہت بھلائی) عطا کی گئی ہے اور سوائے اہل عقل کے (ان حقائق کا کوئی ادرک نہیں کرتا) اور فقط وہی متذکر ہوتے ہیں۔''

۷۔''وہ لوگ جو واضح دلائل اور وسیلہ ہدایت کے نازل ہونے کے بعد انہیں چھپاتے ہیں جب کہ ان لوگوں کے لیے ہم نے کتاب میں بیان کر دیا ان پر خدا لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔''

تعلیم وتربیت سے متعلق ان سات آیتوں پر جو قرآن مجید کی دسیوں آیات میں سے منتخب کی گئی ہیں ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے اس معاملے کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔

پہلی آیت، اس کائنات کو ایک علمی مرکز کے طور پر متعارف کراتی ہے کہ جس کی تمام مخلوقات کو اپنے متعلق انسان کے علم ودانش کی خاطر پیدا کیا گیا ہے، مقصد ان مخلوقات کو پیدا کرنے کا یہ ہے کہ انسان ان کے بارے میں غور وفکر کریں اور اپنے رب کے علم وقدرت سے آشنائی حاصل کریں، بالفاظ دیگر پوری کائنات کی تخلیق کا مقصد علم ودانش ہے، خدا تعالیٰ کا فرمان ہے:''خدا تعالیٰ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور یہی کیفیت آسمانوں کی طرح زمین کی بھی ہے اس کا فرمان ہمیشہ آسمانوں اور زمینوں کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے (اور اس نے ہمیشہ انھیں اپنی ربوبیت کے زیر سایہ رکھا ہے) تاکہ تم جان لو کہ خدا تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم تمام چیزوں پر محیط

ہے۔''[1]

یہ دراصل ایک دلچسپ نکتہ ہے کہ زمینوں اور آسمانوں کی تخلیق اور ان کی دائمی تدبیر، انسان کی حس جستجو کو متحرک کرنے اور اسرار کائنات میں اس کے غور وفکر کرنے کا وسیلہ ہے، جس کے نتیجہ میں انسان خدا کی قدرت اور اس کے علم سے آگاہ ہوتا ہے؛ پس یہ سب انسان کی تربیت اور قربتِ خدا کے حصول کے مقدمات اور وسائل ہیں اسی طرح اس بات کی آگاہی کہ احکام شریعت، احکام تخلیق کی طرح ایک محتاط اور دقیق حساب کے مطابق ہیں، پس یہ تخلیق علم وآگاہی کی خاطر ہے۔

دوسری آیت میں رسول اکرمؐ کی بعثت کے مقصد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ آپؐ آیات الٰہی کے زیر سایہ لوگوں کی تعلیم وتربیت کریں، ارشاد خدا ہے:

ترجمہ: ''جیسے ہم نے ایک رسولؐ کو تم میں سے مبعوث کیا ہے تا کہ وہ ہماری آیات کی تمہارے سامنے تلاوت کرے اور تمہیں پاک کر دے، حکمت سے آشنا کرے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تھے اس سے تمہیں آگاہ کرے''

" كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ"

اس مقام پر رسول اکرمؐ کی نبوت کے مقصد کے طور پر ہی کتاب وحکمت کی تعلیم پر تکیہ نہیں کیا گیا، بلکہ ان امور کی تعلیم کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جن تک نزول وحی کے بغیر دسترسی کا کوئی امکان نہیں۔ اس جملے پر ''يُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ'' (غور فرمائیں) اس طرح تخلیق کائنات کا ہدف علم ودانش کی ترقی اور رسول اکرمؐ کی بعثت کا مقصد بھی علم وحکمت کی اشاعت اور نسانوں کی تربیت اور پرورش ہے۔

تیسری آیت سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ یہ عظیم اور عالی مقصد یعنی تعلیم وتربیت اور حکمت کی تعلیم، ابراہیم خلیل اللہ کی امت کے لئے دعا میں بھی بیان ہوا ہے، چنانچہ آپؑ خدا تعالیٰ سے درخواست کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں:

ترجمہ: ''اے پروردگار! ان کے درمیان (یعنی امت اسلام میں) انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو

---

[1] سات آسمانوں کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں، ایک معروف تفسیر یہ ہے کہ آسمانوں اور ہوائی کُرے اور ثابت وسیار ستارے جو ہمیں دکھائی دیتے ہیں ان سب کا تعلق پہلے آسمان سے ہے اور اس سے پرے چھ اور عظیم جہان ہیں اور سات زمینوں کے بارے میں ایک تفسیر یہ ہے کہ وہی عوالم (عالم) جو اوپر کی طرف ہیں ایسے ہی عوالم کرۂ زمین کی نچلی طرف بھی موجود ہیں۔ یہی مطلب رسول اکرمؐ کی ایک حدیث میں ایک دلچسپ عبارت کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: کیا تم لوگ جانتے ہو کہ تمہارے پاؤں کے نیچے کیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا: ''الْاَرْضُ وَتَحْتَهَا اَرْضُ اُخْرىٰ بَيْنَهُمَا خَمْسَ مَأَةَ عَامٍ'' یعنی تمہارے پاؤں کے نیچے کرۂ زمین ہے اور اس کے نیچے ایک اور زمین ہے کہ جن کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ (تفسیر روح البیان، ج ۱۰، ص ۴۴)۔ سات آسمانوں سے متعلق مزید وضاحت تفسیر موضوعی، پیام قرآن، ج ۲، ص ۱۷۸ میں ملاحظہ کیجیے۔

تیری آیات ان کے سامنے پڑھے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، کیونکہ تو صاحب قدرت وحکمت ہے (اور اس بات پر قادر ہے)''

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دو مقاصد (تعلیم وتربیت) سابقہ امتوں میں بھی رائج رہے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت اور اس بارے میں نازل ہونے والی بعض دوسری آیات میں بھی تعلیم کتاب اور تزکیہ کے ساتھ ساتھ حکمت کی تعلیم کی بات ہوئی ہے، لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ اس مقام پر حکمت سے کیا مراد ہے؟ اس کی متعدد تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی تفسیر یہ ہے کہ حکمت سے مراد معارف دینی اور ان کے احکام سے متعلق آگاہی ہے اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد رسول اکرمؐ کی سنت ہے کیونکہ اسے (سنت کو) کتاب اللہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے؛ بعض کی رائے میں اس سے مراد وہ علامات اور نشانیاں ہیں جو حق کو باطل سے جدا کرتی ہیں اور (حکمت کی تفسیر میں) یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آیات متشابہہ کا مفہوم ہے اور رسولؐ کے لئے اس کی تعلیم دینا ضروری ہے۔[1]

لیکن اگر ہم حکمت کے لغوی مفہوم یعنی جہل وخطا سے باز رکھنے والی چیز اور ہر چیز کو اس کی مناسب جگہ پر رکھنے پر توجہ کریں تو ایسے نظر آتا ہے کہ حکمت سے مراد یہ ہے کہ انسان احکام کے اسرار، اسباب اور نتائج نیز کائنات اور انسان کی تخلیق کے اسرار، اپنی سرنوشت اور انجام کے بارے میں آگاہی حاصل کرے۔

چوتھی آیت میں ایک کلی قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو تعلیم وتربیت کے مسئلے کی بنیاد ہے، ارشاد فرماتا ہے: اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھو: ''فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ'' یہ آیۂ شریفہ اگرچہ سابقہ انبیاء کی، صفات کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو انسان ہی کی جنس سے تھے اور بظاہر دوسرے افراد سے مختلف نہیں تھے، لیکن معلوم ہے کہ اس آیت کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کیا جا سکتا اور حکم اپنی عمومیت (عام ہونے) پر باقی ہے۔

یہ درحقیقت ایک بنیادی اصل (قانون) ہے جس کی صحت اور درستگی کو تمام عقلاء تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیشہ نہ جاننے والوں کو جاننے والوں سے علم حاصل کرنا چاہیے کیونکہ علوم ودانش دراصل ان تجربات اور غور وفکر کا نتیجہ ہوتے ہیں جنھیں گذشتگان حاصل کرتے اور آنے والی نسلوں کے سپرد کر دیتے ہیں، بعد والی نسلیں ان میں اضافہ کر کے اپنے بعد والوں کو منتقل کر دیتی ہیں، اسی ترتیب کے ساتھ انسان کا علم اور اس کی دانش دن بدن ترقی حاصل کرتی چلی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تعلیم انسان کی معنوی اور مادی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں اور اُس کی معاشرتی پیش رفت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اس مقام پر غزالی سے نقل شدہ ایک جملہ مطلب کو واضح تر کر دیتا ہے اس سے کسی نے پوچھا: اسلام کے اصول وفروع پر تمہیں جو

---

[1] تفسیر کبیر، فخر رازی، ج ۴، ص ۶۶، موضوع بحث آیت۔

علمی تسلط حاصل ہے اسے تم نے کہاں سے حاصل کیا؟! اس نے جواب میں مذکورہ بالا آیت یعنی ''فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ'' کی تلاوت کی؛ یعنی ''علم کل علماء اور دانشمندوں سے سوال کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔''[1]

اہل بیت ÷ سے منقول متعدد روایات میں اہل ذکر کی تفسیر ائمہ معصومینؑ سے کی گئی ہے۔[2] لیکن چونکہ معلوم ہے کہ اس قسم کی تفسیریں کسی مطلب کو منحصر کر دینے کے معنیٰ میں نہیں بلکہ اتم واکمل (کامل ترین) فرد اور مصداق کو ظاہر کرنے کے لئے ہوتی ہیں، اس قسم کا مفہوم قرآن کی اکثر آیات میں نظر آتا ہے۔

پانچویں آیت مسلمانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہے: ''معلمین اور متعلمین'' اور حقیقت میں ہر مسلمان کو ان دو گروہوں میں سے ہونا چاہیے؛ یا پڑھائے یا پڑھے، یا معلم ہو یا متعلم (شاگرد) قرآن میں ارشاد باری ہے: شائستہ نہیں کہ سب مسلمان نکل پڑیں کیوں ایک گروہ سے ایک طائفہ کوچ نہیں کرتا تا کہ وہ (معارف اسلامی اور احکام سے) آگاہی حاصل کرے اور اپنی قوم کے پاس واپس آ کر اسے (خدا کے عذاب سے) ڈرائے، شاید وہ لوگ (خدا کی مخالفت سے) ڈر جائیں:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾

پوری تاریخ میں علماء نے اس آیت کے ذریعے استدلال کیا ہے تا کہ علوم اسلامی حاصل کرنے کے وجوب کو واجب کفائی کے عنوان سے دوسرے لوگوں کے لئے ثابت کر سکیں، علاوہ ازیں عمل کرنے کے لئے علم حاصل کرنے کو سب علماء واجب عینی قرار دیتے ہیں۔

آج دنیا کے اکثر ممالک میں علم حاصل کرنا سب پر لازم ہے اور از روئے قانون ہر بچے کا پڑھنا ضروری ہے اور اگر وہ نہ پڑھے تو اس کا سرپرست جوابدہ ہوتا ہے، لیکن کسی جگہ تعلیم دینا قانونی طور پر لازم نہیں بلکہ ہر کسی کو اختیار ہے کہ وہ تعلیم دے یا نہ دے، لیکن اسلام میں جس طرح علم حاصل کرنا واجب ہے اسی طرح دوسروں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا بھی وجوب ولزوم کا پہلو رکھتا ہے، اس کی ایک دلیل یہی مذکورہ بالا آیت یعنی آیہ نفر ہے، کیونکہ ایک طرف سے جملہ ''فَلَوْلاَ نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ'' کے ذریعے علم حاصل کرنے کے لئے نکل پڑنے کو واجب قرار دیا جاتا ہے۔[3]

تو دوسری طرف سے جملہ ''وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ'' کے ذریعے تعلیم دینے کو بھی واجب اور لازم شمار کیا جاتا ہے البتہ جملہ ''لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ'' میں مذکور یہ الٰہی فرائض ہیں، جو عمل کرنے کے مقدمات ہیں۔ اسی بناء پر بعض اوقات بعض علماء اسلام کئی کئی دن کا سفر طے کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر تک جاتے ہیں تا کہ وہ ایک حدیث حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں، اس کی

---

[1] تفسیر روح البیان، ج۵، ص۳۷۰۔

[2] ان روایات سے آگاہی کے لئے تفسیر البرہان، ج۲، ص۳۶۹ کی طرف رجوع کریں، قابل توجہ یہ ہے کہ یہ الفاظ اہل سنت کی روایات میں بھی آئے ہیں، شواہد التنزیل حسکانی، ج۱، ص۳۳۴ اور احقاق الحق، ج۳، ص۴۸۲ کا مطالعہ فرمائیں۔

[3] علماء ادب کے بقول کلمہ ''لولا'' تحضیضیہ ہے جو ملامت اور سرزنش کے موقع پر کہا جاتا ہے اور واضح ہے کہ سرزنش ترک واجب اور ارتکاب حرام کی وجہ سے کی جاتی ہے۔

ایک مثال یہ ہے کہ ''جابر'' ایک حدیث (جو کسی عالم کے پاس موجود تھی) کی خاطر مدینہ سے مصر گئے تا کہ اس سے وہ حدیث سن کر اپنے پاس محفوظ کر سکیں، لہٰذا کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص بھی سفر کئے بغیر مرحلہ کمال تک نہیں پہنچ سکتا (کیونکہ اس طرح وہ مختلف شہروں کے علماء سے رابطہ کر کے ان کے علم و تجربے سے مستفیذ ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص بھی ہجرت کئے بغیر منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔[1]

سورہ کہف میں حضرت خضر -اور حضرت موسیٰ -کے واقعے میں آیا ہے کہ عظیم پیغمبر موسیٰ -نے بعض علوم حاصل کرنے کے لئے طولانی، تکلیف دہ اور پر مشقت راہ کو طے کیا، تا کہ اس مرد الٰہی (حضرت خضر -) کے پاس پہنچ کر ان سے علم حاصل کر سکیں۔ چھٹی آیت میں ایک اور اہم تعبیر جو علم و دانش حاصل کرنے کے بارے میں ہے، اس کا ذکر کچھ اس طرح ہے: خدا دانش و حکمت جسے چاہے عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کی جائے، اسے خیر کثیر عطا کیا جاتا ہے، اور صرف اہل عقل ان حقائق کو سمجھ سکتے ہیں:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

واضح ہے کہ اس تعبیر ''مَنْ يَّشَآءُ'' (جسے خدا چاہے) سے یہ مراد نہیں کہ خدا تعالیٰ حکمت و دانش کو بلاوجہ لوگوں کو عطا کرتا ہے، بلکہ جیسا کہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہمیشہ اُس کی حکمت کے ہمراہ ہوتی ہے۔ یعنی جسے وہ لائق سمجھتا ہے اسے عطا کرتا ہے اور یہ لیاقت یا کدو کاوش اور علم حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ مشقت برداشت کرنے سے پیدا ہوتی ہے یا خودسازی اور تقویٰ اختیار کرنے سے کیونکہ تقویٰ بصیرت اور روشن ضمیری کا سرچشمہ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس آیت میں علم و دانش کو خیر کثیر کہا گیا ہے اور یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو تمام نیکیوں اور خوبیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے یعنی خیر دنیا و آخرت، خیر مادی و معنوی اور تمام جہات میں خیر غرض ہر قسم کے خیرات اس خیر کثیر میں سمٹ جاتے ہیں۔

مفسر عالیقدر مرحوم علامہ طباطبائی اس مقام پر ایک نکتے کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جملہ ''وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ'' بصورت فعل مجہول ذکر ہوا ہے جبکہ اس سے پہلا جملہ فعل معروف پر مشتمل ہے (اور فرماتے ہیں: خدا تعالیٰ جسے چاہتا ہے علم و حکمت عطا کرتا ہے) تا کہ واضح ہو کہ حکمت و دانش ذاتی طور پر خیر کثیر کا سرچشمہ ہے نہ فقط خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی بناء پر بلکہ ذات و حقیقت علم، خیر کثیر (فراوانی) ہے![2]

آخری آیت اس مسئلے کے ایک اور رخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ ہے علم و دانش کو چھپانے کی شدید مذمت لہٰذا ارشاد حق تعالیٰ ہے: ''وہ لوگ جو ہماری طرف سے روشن دلائل اور ہدایت کے وسیلے کے نازل ہونے کے بعد، جسے ہم نے لوگوں کے لئے (آسمانی) کتاب میں بیان کر دیا ہے، اگر چھپاتے ہیں تو خدا ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں''

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي

---

[1] تفسیر روح البیان، ج ۳، ص ۷ ۵۳۔

[2] تفسیر المیزان، ج ۲، مذکورہ آیت کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

اللہ تعالیٰ کی لعنت (یعنی اللہ تعالیٰ کا ان کو اپنی رحمت سے دور کرنا) اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ان شدید ترین تعبیرات میں سے ایک ہے جو قرآن مجید میں گناہوں میں سے کسی گناہ کے بارے میں آئی ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم و دانش کا کتمان (چھپانا) کس قدر برا اور قابل مذمت ہے۔ یعنی ایسے علوم کو چھپانا جو لوگوں کی ہدایت کا وسیلہ ہیں۔ ایک اور آیت میں، جو اس آیت کے بعد سورۂ بقرہ میں بلا فاصلہ ذکر ہوئی ہے آیا ہے کہ پشیمانی اور خدا کی طرف برگشت اور توبہ کے بعد روشن مسائل کے چھپانے کا مداوا فقط اسی صورت میں ممکن ہے کہ انھیں آشکار کیا جائے اور یہ اس بات کو بخوبی ظاہر کرتا ہے کہ علم چھپانے کی تلافی اسی وقت ہوسکتی ہے جب اسے ظاہر کیا جائے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ [1]

اگرچہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو رسول اکرمؐ کی علامات اور نشانیوں کو، جو انھوں نے اپنی کتابوں میں دیکھ رکھی تھی، چھپاتے تھے۔ لیکن بدیہی واضح ہے کہ مفہوم آیت میں وسعت ہے اور ہر اس علم کا کتمان جو لوگوں کے لئے سرچشمہ ہدایت ہو اس وسیع مفہوم میں شامل ہوسکتا ہے۔ معصومین ؑ سے منقولہ روایات بھی یہی ظاہر کرتی ہیں یہاں کہ علم کا مطلق مفہوم مُراد ہے (نہ کوئی خاص شانِ نزول)۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث کے مطابق فرماتے ہیں:

"مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ يَعْلَمُهُ، فَكَتَمَهُ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيامَةِ بِلِجامٍ مِنْ نارٍ"

''وہ شخص جو جن علوم کو جانتا ہے اس سے اگر ان کے بارے میں کچھ پوچھا جائے اور وہ اسے چھپائے تو روز قیامت اس کے منہ پر آگ کی لگام ڈالی جائے گی'' [2]

رسول اکرمؐ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں اس مطلب کو مزید واضح کیا گیا ہے:

"مَنْ كَتَمَ عِلْماً نافِعاً عِنْدَهُ، اَلْجَمَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيامَةِ بِلِجامٍ مِنْ نارٍ"

جو شخص اپنے پاس موجود مفید اور نافع علم کو چھپائے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے منہ پر آگ کی لگام ڈالے گا۔ [3]

واضح ہے کہ یہ الفاظ تمام انسانوں کے لئے ہر قسم کے مفید علوم کے بیان پر مشتمل ہیں۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے اس مطلب کو صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"مَنْ عَلِمَ شَيْئاً فَلا يَكْتُمْهُ"

---

[1] سورۂ بقرہ/ ۱۶۰

[2] مجمع البیان، ج ۱ اور ۲، ص ۲۴۱۔

[3] کنز العمال، ج ۱۰، ص ۲۱۶، حدیث ۲۹۱۴۲ اور بحار الانوار، ج ۲، ص ۷۸۔

جو شخص کسی چیز کے بارے میں علم رکھتا ہے وہ اسے ہرگز چھپا کر نہ رکھے۔[1]

۲۔فقط علوم دینی ہی اہمیت کے حامل نہیں

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ تصور کریں کہ علم، تعلیم و تعلم اور ان کی نشر و اشاعت کے بارے میں قرآن اور احادیث میں جو اتنی تاکید کی گئی ہے، وہ فقط دینی علوم اور حکومت اسلامی کی بحث میں جن دوسرے علوم کی وسعت بھی مرکز توجہ ہے، ان کے ساتھ ان (تاکیدات) کا کوئی تعلق نہیں۔لیکن یہ ایک فاش غلطی ہے کیونکہ آیات قرآن کے ساتھ ساتھ روایات سے بھی تعلیم و تربیت اور علم کی اہمیت بطور مطلق ذکر ہوئی ہے۔اس مطلب پر بکثرت شواہد موجود ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل آیات قرآن ہیں:

۱۔حضرت آدم -کے واقعے میں تعلیم اسماء کا بیان ہوا ہے جس کا اشارہ تمام موجودات کی تخلیق کے اسرار کی طرف ہے نہ فقط علوم دینی کی طرف:''وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا''(سورۂ بقرہ/۳۱)

۲۔سورۂ الرحمن میں خدا کی طرف سے تعلیم بیان کا ذکر ہے اور اسے آغاز سورہ میں ایک عظیم عطیۂ الٰہی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور عظیم ترین نعمتوں کے مجموعے کا اس میں ذکر کیا گیا ہے:''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ''(سورۂ الرحمن/۴)

۳۔سورۂ یوسف میں تعبیر خواب کے علم اور خوابوں کے آنے والے حوادث سے حکایت کرنے کی طرف حضرت یوسف کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرماتا ہے:''ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي''(سورۂ یوسف/۳۷)

۴۔پھر اسی سورہ میں ملک کا انتظام چلانے اور بیت المال کے انتظام سے متعلق اشارہ کر کے حضرت یوسف -کی زبان سے عزیز مصر سے مخاطب ہو کر ارشاد فرماتا ہے:

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾ [2]

۵۔(اسی ملکی انتظام چلانے کے سلسلے میں) طالوت اور جالوت کے واقعے میں قرآن اس زمانے کے نبی حضرت اشموئیل -کی طرف سے طالوت کو (انتظامی امور) چلانے پر مامور کرنے کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

خدا تعالیٰ نے اسے (طالوت کو) تم میں سے منتخب کیا ہے اور اسے وسیع علم اور جسمانی قدرت عطا کی ہے۔[3]

واضح ہے کہ طالوت کا بقیہ بنی اسرائیل سے ممتاز ہونا فقط معارف الٰہی جاننے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ سیاسی اور انتظامی امور کے

[1] کنز العمال، حدیث ۲۹۱۴۵۔

[2] سورۂ یوسف/۵۵

[3] سورۂ بقرہ/۲۴۷

بارے میں اس کی بصیرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو اس ذہین وفطین اور مدبر جوان کی سرشت میں موجود تھی۔

۶۔ حضرت داؤدؑ کے واقعے میں "صنعۃ لبوس"، زرہ سازی کے علم کا تذکرہ کیا گیا ہے جوان کے لئے ایک عظیم فخر تھا بلکہ مجمع البیان میں طبرسی کے بقول "لبوس" کا تعلق ہر قسم کے اسلحے سے بھی ہے اور اس سے مراد فقط زرہ نہیں [1]

اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے:

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ [2]

۷۔ سورۂ کہف میں خضر -اور موسیٰؑ کے واقعے ان علوم کا تذکرہ ہے جو خضرؑ نے موسیٰؑ کو سکھائے اور ان میں سے کسی علم کا علوم دینی سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ ایسے علوم تھے جو انسانی معاشرے کو بہترین صورت اور نظام کے مطابق چلانے کے کفیل تھے۔ اس بارے میں قرآن فرماتا ہے:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

اس مقام پر (موسیٰؑ اور ان کے ہم سفر یوشعؑ) نے ہمارے بندگان میں سے ایک ایسے بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت کا مشمول قرار دے کر علم کثیر سے مالا مال کر دیا تھا۔ [3]

بعد کی آیات میں ان علوم کے تین نمونے بطور تفصیل بیان کیے گئے ہیں کہ جن میں سے کسی کا تعلق بھی علوم دینی سے نہیں بلکہ سب کا تعلق امور زندگی کی تدبیر اور انتظام سے ہے۔

۸۔ سورۂ نمل میں حضرت سلیمانؑ کی پرندوں کے ساتھ گفتگو کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور قرآن اسے حضرت سلیمانؑ کے لئے باعث فخر قرار دیتا اور فرماتا ہے:

وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ

(حضرت سلیمانؑ نے کہا) اے لوگو! مجھے پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔ [4]

۹۔ سورۂ کہف کی آخری آیات میں ذوالقرنین -کے واقعے میں ان کی سدّ بندی کے واقعے کو ایک اہم واقعہ کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور یہاں تک کہ فاسد ومفسد قبائل (یاجوج وماجوج) کے حملوں سے حفاظت کے لئے ایک نہایت مضبوط آہنی دیوار بنانے کے بارے میں ان کی تدبیر کی کیفیت اور جزئیات کو بیان کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

---

[1] مجمع البیان، ذیل آیت ۸۰ / سورۂ انبیاء؛ لیکن آیت میں کچھ ایسے قرائن ملتے ہیں کہ جن کا بیشتر اشارہ "زرہ" کی طرف ہے۔

[2] سورۂ انبیاء / ۸۰

[3] سورۂ کہف / ۶۵

[4] سورۂ نمل / ۱۶

اٰتُوۡنِیۡ زُبَرَ الۡحَدِیۡدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ قَالَ انۡفُخُوۡا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوۡنِیۡۤ اُفۡرِغۡ عَلَیۡهِ قِطۡرًا ﴿۹۶﴾

"(آپؑ نے لوگوں سے کہا) لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے میرے پاس لاؤ (اور انھیں ایک دوسرے پر رکھو) یہاں تک کہ وہ (ٹکڑے) دو پہاڑوں کے درمیانی فاصلے کو ڈھانپ لیں، بعدازاں کہا (ان کے اطراف میں آگ روشن کرو) اور اسے پھونکیں مار کر ہوا دو (انھوں نے ایسا ہی کیا) یہاں تک کہ لوہے کے ٹکڑے سرخ اور نرم ہو گئے، پھر کہا: اب پگھلا ہوا تانبا لاؤ تا کہ میں اسے ان پر ڈال دوں۔" [۱]

سدّ سازی سے متعلق یہ علم بھی خدا کی طرف سے ایک عطیہ تھا۔

۱۰۔ سورۂ لقمان میں بھی کئی آیتوں میں حضرت لقمانؑ کی اپنے بیٹے کو کئی نصیحتوں کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ ایسے احکام پر مشتمل ہے جن کا تعلق نفسیات اور معاشرتی امور سے ہے جن کی رعایت کرنا زندگی میں بے حد اہمیت رکھتا ہے، آپ اپنے بیٹے کو حکم دیتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ بے توجہی اور ترشروئی کے ساتھ ہرگز پیش نہ آؤ، متکبرانہ انداز سے زمین پر مت چلو، چلنے میں اعتدال سے کام لو، بلند اور سخت لہجے میں بات کرنے سے پرہیز کرو اور اپنے تمام کاموں میں صبر و استقامت کی رعایت کرو۔ (سورۂ لقمان/ ۱۷ تا ۱۹) یہ سب کچھ اس حال میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے لقمانؑ کو علم و حکمت کا حامل ہونے کی وجہ سے بزرگ اور باعظمت قرار دیا ہے یہاں تک کہ ان کی بات کو اپنی بات کے ہمراہ اور ایک ہی انداز میں بیان کیا ہے!

۱۱۔ سورۂ سبا میں حضرت سلیمانؑ کے حالات میں اس تعمیر اور فنکاری کا ذکر ہے جسے جنات سلیمانؑ کی نگرانی میں انجام دیتے تھے:

یَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِیۡبَ وَ تَمَاثِیۡلَ وَ جِفَانٍ کَالۡجَوَابِ وَ قُدُوۡرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ

جو کچھ سلیمانؑ ان جنوں سے چاہتے اور انھیں اس کا حکم دیتے، تو وہ (فوراً اس کی تعمیل کرتے ہوئے) ان کے لئے معابد، تمثال، غذا کے بڑے بڑے ظروف اور حوض اور اپنے مقام پر ٹکی ہوئی دیگیں بنا ڈالتے تھے! [۲]

اور اس سے پہلی آیت میں دھاتوں کے پگھلانے کا علم جو حضرت سلیمانؑ کو حاصل تھا، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے

"وَ اَسَلۡنَا لَهٗ عَیۡنَ الۡقِطۡرِ"

یعنی: "ہم نے سلیمانؑ کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کے چشموں کو جاری کیا۔" [۳]

---

[۱] سورۂ کہف/ ۹۶

[۲] سورۂ سبا/ ۱۳

[۳] سورۂ سبا/ ۱۲

۱۲۔سورۂ بقرہ میں قرآن مجید حضرت داؤدؑ کی حکومت کے بارے میں فرماتا ہے:

"وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ"

داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں حکومت اور حکمت بخشی اور جو کچھ وہ چاہتے تھے انھیں اس کی تعلیم دی۔[1]

واضح ہے کہ علم وحکمت سے مراد اس مقام پر وہ علم ہے جو ملک ومملکت کا نظام چلانے کے لئے ضروری ہوتا ہے اور اگر اس کا ایک وسیع تر معنی بھی ہو تو علوم کا یہ حصہ قطعی طور پر نظام حکومت کو بھی اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے۔ مذکورہ آیات اور بعض دوسری آیات قرآن میں موجود مجموعی اشارات سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کے گمان کے برعکس جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے فقط علوم دین اور معارف الٰہی کو اہمیت دی ہے اور دوسرے علوم کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، قرآن نے علوم کی ان اقسام کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور انھیں عظیم عطیات ربانی کی حیثیت دی ہے اور مسلمانوں کو مادی اور معنوی زندگی میں مفید علوم حاصل کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔

۳۔احادیث میں مفید علوم حاصل کرنے کی تاکید

احادیث میں بھی آیات قرآن کی پیروی میں، صرف علوم دینی ہی کو حاصل کرنے کی ترغیب نہیں دی گئی، بلکہ ان کے علاوہ مادی ومعنوی زندگی میں مفید علوم حاصل کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیں:

۱۔رسول اکرمؐ کی ایک معروف حدیث میں آیا ہے کہ:

"أُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ فَإِنَّ طَلَبَ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ"

علم حاصل کرو اگر چہ وہ ملک چین میں ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔[2]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ملک چین اس زمانے میں دنیا کا سب سے دور ملک سمجھا جاتا تھا، اس بناء پر مراد یہ ہے کہ علم کے پیچھے میں جاؤ اگر چہ وہ دنیا کے سب سے دور ملک میں ہی کیوں نہ ہو۔ واضح ہے کہ وہ علم جو اس زمانے میں چین کے ملک میں موجود تھا، معارف قرآنی ودینی پر مشتمل نہیں تھا، کیونکہ ان کی جگہ تو مراکز وحی تھے، بلکہ مراد دنیوی اعتبار سے مفید علوم ہیں۔

۲۔ایک اور حدیث میں امام علیؑ فرماتے ہیں:

"اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَاطْلُبُوهَا وَلَوْ عِنْدَ الْمُشْرِكِ"

---

[1] سورۂ بقرہ/۲۵۱

[2] بحار الانوار، ج۱ص۱۸۰اور کنزالعمال، حدیث ۲۸۶۹۷۔

حکمت صاحبان ایمان کی گمشدہ چیز ہے پس اسے طلب کرو اگر چہ وہ مشرکین کے پاس ہی کیوں نہ ہو۔ [1]
واضح ہے کہ مشرکین کے پاس پائے جانے والے علوم، معارف توحید اور علوم الٰہی ہرگز نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ کوئی دوسرے مفید علوم ہی ہیں جو زندگی میں کام آسکیں اور کبھی ان کے پاس موجود ہوتے ہیں۔ اس قسم کی احادیث اس معروف کہاوت ''علم کا کوئی وطن نہیں'' کی ترجمانی کرتے ہوئے تاکید کرتی ہیں کہ علم و دانش مومنین کی گمشدہ چیز ہے، ان کا حق ہے کہ جس جگہ اور جس کے پاس ملیں وہ انھیں حاصل کریں۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں ذکر ہوا ہے:

"كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا"

یعنی: ''حکیمانہ کلمات مومن کی گمشدہ چیز ہے، جس جگہ انھیں دریافت کرے وہ انھیں حاصل کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔'' [2]

۳۔ رسول اکرمؐ کی ایک معروف حدیث میں مذکور ہے:

"اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمُ الاَدْيَانِ وَ عِلْمُ الاَبْدَانِ"

یعنی: ''علم دو قسموں پر مشتمل ہے: علوم دینی اور علوم طب (پہلا علم انسان کی روح کی سلامتی کا اور دوسرا اس کے بدن کی سلامتی کا باعث ہے)۔'' [3]

۴۔ آنحضرتؐ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"اَلْعِلْمُ ثَلاثَة: اَلْفِقْهُ لِلاَدْيَانِ وَ الطِّبُ لِلاَبْدَانِ وَ النَّحْوُ لِلِّسَانِ"

یعنی: علم کی تین اقسام ہیں: ادیان کے بارے میں علم و آگاہی، ابدان کے لئے علم طب اور زبان کے خطا سے محفوظ ہونے کے لئے نحو (ادبیات) سے آگاہی۔ [4]

اس حدیث شریف میں علوم الٰہی و بشری کے تین اہم شعبوں کو بیان کیا گیا ہے: علوم دینی، علم طب اور علم نحو و ادبیات جو حقیقت میں دوسرے علوم کی کلید (چابی) ہیں۔

۵۔ امیر المؤمنین - سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ:

"اَلْعُلُومُ اَرْبَعَةٌ: اَلْفِقْهُ لِلاَدْيَانِ وَالطِّبُ لِلاَبْدَانِ وَالنَّحْوَ لِلِّسَانِ، والنُّجُومُ لِمَعْرِفَةِ

[1] بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۳۴
[2] بحار الانوار، ج ۲، ص ۹۹، حدیث ۵۸
[3] بحار الانوار، ج ۱، ص ۲۲۰ حدیث ۵۲
[4] بحار الانوار، ج ۵، ص ۴۵، حدیث ۵

الازمان"

علم کی چار قسمیں ہیں: فقہ؛ دین کے لئے، طب؛ بدن کے لئے، نحو وادبیات؛ زبان کے لئے اور ستارہ شناسی اوقات کی تشخیص کے لئے۔ [۱]

۶۔ امام جعفر صادقؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"وَ کَذٰلِكَ اَعْطٰى(اَلاِنْسانَ) عِلْمَ مافيهِ صَلاح دُنْیاهُ كَالزِّراعَةِ وَالغِراسِ وَاسْتِخْراجِ الاَرَضِيْنَ، وَاقْتِناءِ الاَغْنامِ وَالاَنْعامِ وَاسْتِنْباطِ المِياهِ، وَمَعْرِفَةِ الْعَقاقِيرِ الَّتي يُسْتَشْفى بِها مِنْ ضُرُوبِ الاَسْقامِ، وَالْمَعادِنِ الَّتي يُسْتَخْرَجُ مِنْها اَنْواعُ الْجَواهِرِ، وَ رُكُوبِ السُّفُنِ وَالْغَوْصِ فِي الْبَحْرِ... وَالتَّصَرُّفِ فِي الصِّناعاتِ وَ وُجُوهِ الْمَتاجِرِ وَالْمَكاسِبِ"

امام جعفر صادقؑ نے اس روایت کے مطابق مفید علوم کو شمار کرنے کے ضمن میں جو خدا تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم سے انسان کو عطا کئے ہیں ارشاد فرمایا ہے: اسی طرح خدا تعالیٰ نے انسان کو وہ علوم عطا کئے ہیں کہ اس کی دنیا کی اصلاح ان میں ہے۔ جیسے زراعت، باغبانی، مردہ زمین کو زراعت کے لئے تیار کرنا، مویشی پالنا، زمین سے پانی نکالنا، ان جڑی بوٹیوں کی شناخت جو کئی قسم کی بیماریوں کی دوا ہیں، ان معادن کی شناخت کہ جن سے جواہر نکالے جاتے ہیں، کشتیوں پر سواری، دریاؤں میں غوطہ خوری اور انواع واقسام کی مصنوعات تشکیل دینا اور مختلف قسم کی تجارت اور کاروبار وغیرہ کو انجام دینا۔ [۲]

اس ترتیب سے امامؑ نے ان تمام علوم کو خدا تعالیٰ کی بخشش اور اس کا عطیہ شمار کیا ہے اور انسانوں کو اس کی تعلیم کی تشویق وترغیب دلائی ہے۔

۷۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث میں باپ پر اولاد کے حقوق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَيُعَلَّمَهُ كِتابَ اللهِ وَ يُطَهِّرَهُ وَ يعَلِّمَهُ السِّباحَةِ"

باپ پر فرزند کے حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ اسے کتاب خدا کی تعلیم دے، گناہوں سے پاک کرے اور فن تیراکی سکھائے۔ [۳]

---

[۱] بحار الانوار، ج۱ص۲۱۸۔

[۲] بحار الانوار، ج۳، ص۸۳۔

[۳] وسائل، ج۱۵ص۱۹۹، باب۸۸، حدیث۷،

اس حدیث سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ فن تیرا کی بھی اسلام کے قانون ساز کی نگاہ میں اوجھل نہیں رہا اور اس کی تعلیم کی اپنے فرزندوں کو تاکید کی ہے۔

۸۔ ایک اور حدیث میں حضرت موسیٰ بن جعفر -فرماتے ہیں:

"وَبَعْدَ عِلْمِ الْقُرآنِ ما يَكُونُ اَشْرَفَ مِنْ عِلْمِ النُّجُومِ وِ هُوَ عِلْمُ الاَنْبياءِ وَالاَوْصِياءِ وَ وَرَثَةِ الاَنْبياءِ الَّذينَ قالَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ:" وَ عَلاماتٍ وَ بِالنَجمِ هُمْ يَهْتَدونَ"

''یعنی: علم قرآن کے بعد کوئی علم، علم نجوم اور ستارہ شناسی سے بہتر نہیں اور یہ انبیاء، اوصیاء اور ان کے وارثوں کا علم ہے؛ وہی لوگ جن کے حق میں خدا تعالیٰ نے فرمایا: خدا تعالیٰ نے علامات مقرر کی ہیں اور ستاروں کی مدد سے ان کی راہنمائی کی جاتی ہے۔[1]

مجموعی طور پر مذکورہ بالا آیات و روایات اور دوسری روایات جن کو ذکر کرنے سے بات طولانی ہوجائے گی، سے بخوبی استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ کیسے اسلام نے ایک طاقتور علمی تحریک کی بنیاد رکھی؟ یہی وجہ ہے کہ دو تین صدیوں کے گذرنے کے ساتھ ہی اس آبرومند پودے نے نشوونما پائی اور اس کی شاخ و برگ نے پورے عالم اسلام کو اپنے سائے میں لے لیا اور وہ اتنا پھلا پھولا کہ تھوڑی ہی مدت میں مختلف شعبوں میں کثیر تعداد میں معارف الٰہی، فلسفہ، طب، صحت و تندرستی، جغرافیہ، فزکس، کمسٹری اور دیگر علوم فنون پر کتابیں لکھی اور شائع کی گئیں جن میں سے ایک حصہ ترجمے اور دوسرا حصہ اسلامی دانشمندوں کی جدید تحقیقات پر مشتمل تھا۔

وہ دانشمند جنھوں نے اسلامی تاریخ تمدن کو موضوع بحث بنایا یا اس کے بارے میں کوئی کتاب لکھی، جسے مغرب کے علماء انھوں نے تاریخ تمدن اسلامی کی اہم فصل کو مسلمانوں کی علمی تحریک کے ساتھ مختص کیا اور مسلمانوں کے زیر نظر آب و تاب اور وسعت پانے والے مختلف علوم کو ان کے دانشمندوں کے نام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ نکتہ نہایت دلچسپ ہے کہ مغربی مؤرخین نے واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ یورپ کی نشاۃ علمی کا سرچشمہ مسلمانوں کی نشاۃ علمی ہے اور اہل یورپ اپنی علمی سطح میں اسلامی دانشوروں کے مرہون منت ہیں! کتاب ''تاریخ تمدن مغرب اور مشرق میں اس کی بنیادیں'' جو چند ایک مغربی دانشوروں کی تالیف ہے، میں ذکر کیا گیا ہے کہ ''جب ہم بیزانس[2] اور مسلمانوں کی مگربی تمدن کے سلسلے میں خدمات کو دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشرق کی طرف سے ایک بڑی روشنی مغرب کی تابانی کا باعث بنی ہے!''

ڈاکٹر ماکس میرہوف ''میراث اسلام'' نامی کتاب میں لکھتا ہے: ''علوم عرب یعنی مسلمانوں کے علوم ایک ماہ تابان کی طرح تھے

---

[1] بحار الانوار، ج ۴۷، ص ۱۴۶ اور سورہ نحل۔ ۱۱۶۔

[2] بیزانس، مشرقی روم کا بادشاہ تھا جس کا پایہ تخت بیزانس کہلاتا تھا (اور اب ترکی کے بعض حصے پر مشتمل ہے اور بیزانس موجود استنبول میں رہا ہے)

جنھوں نے قرون وسطیٰ کے یورپ کی تاریک راتوں کو منور کیا اور جب علوم جدیدہ ظاہر ہوئے، چاند بے رنگ ہو گیا لیکن اسی چاند نے تاریک راتوں میں ہماری راہنمائی کی اور ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابھی بھی اس کی تابانی و تابش ہمارے ساتھ ہے!"[1]

اسی کتاب کی ایک اور عبارت میں آیا ہے: "......مختصر یہ کہ (علمائے اسلام کی کتابوں کے ترجمے) سے مشرقی علوم باران رحمت کی طرح یورپ کی خشک زمین پر برسے اور اسے زرخیز و پرثمر بنا دیا اس طرح آہستہ آہستہ اہل یورپ مشرقی علوم سے آشنا ہوئے!" وہ اپنی یاداشتوں (ڈائری) میں علوم طبیعی اور طب کے عنوان کے تحت لکھتا ہے: "جو کچھ ان آخری سالوں میں دریافت ہوا ہے اس نے جہان اسلام کے قدیم علوم کی تاریخ پر ایک جدید نور افشانی کی ہے بطور مسلم یہ دریافتیں ابھی کافی نہیں اور دنیا مستقبل قریب میں علوم اسلامی کی اہمیت کا مزید سراغ لگائے گی۔"[2]

ایک اور بیان میں لندن یونیورسٹی کے عربی کے استاد پروفیسر گیب کے مقالے جو "اسلامی ادبیات کے یورپ پر اثرات" کے عنوان سے لکھا گیا ہے' اسے اس طرح نقل کرتے ہیں: "جب ہم گزشتہ (ایام) پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی ادبیات، مغرب کے تمدن کا خمیر اور سرچشمہ ہیں، اور وہ اس طرح کہ مشرقی نظریات اور افکار نے مغرب کے قرون وسطیٰ کے لوگوں کی تاریک روح کو اپنی نورانیت سے منور کر دیا اور ان کی ایک وسیع تر جہان کی طرف رہنمائی کی!"[3]

جرجی زیدان مشہور عیسائی مؤرخ "تاریخ تمدن اسلامی" نامی کتاب میں' ان علوم پر اسلام کے اثرات جو بیرونی دنیا سے حلقۂ اسلامی میں داخل ہوئے' کی بحث میں یوں لکھتا ہے: "جب تمدن اسلامی اوج کمال پر پہنچا اور اجنبی علوم اسلامی دنیا میں عام ہونے لگے تو مسلمان انھیں حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے، اسلامی علماء میں سے کچھ لوگوں نے اپنے نبوغ اور بے پناہ ذہانت کے بل بوتے پر ان علوم کے اصلی صاحبان کو پیچھے چھوڑ دیا اور ان میں نئے افکار و آراء اور دریافتوں کا اضافہ کیا، اس طرح سے علوم کو تنوع اور کمال نصیب ہوا اور انھوں نے اسے اسلامی تمدن اور آداب اسلامی کا حصہ بنا دیا اور جب اہل یورپ علوم یونان کو دوبارہ یورپ میں واپس لے لئے متحرک اور کمربستہ ہوئے تو انھوں نے بیشتر علوم کو اسلامی رنگ میں عربی زبان سے حاصل کیا!"[4]

ایک اور عبارت میں لکھتا ہے: "تمدن اسلامی سے متعلق تعلیم کے کردار کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ حکمت اور علم مختلف رکوں اور پہلوؤں سے (مسلمانوں کے ہاں) خوب پھلے پھولے اور علماء، فقہاء، اطباء اور فلاسفہ نے اپنے نبوغ اور خداداد ذہانت کے خوب جوہر دکھائے۔"

مختصر یہ کہ دنیا کی عمومی تاریخ میں یا وہ کتابیں جو بطور خاص اسلامی تمدن کے بارے میں لکھی گئی ہیں، (ان کتابوں) میں

---

[1] میراث اسلام، ص ۱۳۴

[2] میراث اسلام، ص ۱۱۱

[3] تاریخ تمدن اسلامی، جرجی زیدان، ج ۳، ص ۱۹۶

[4] تاریخ تمدن اسلامی جرجی زندان، ج ۳ ص ۲۲۲

مسلمانوں کی نشاۃ علمی اور تاریخ علم وتمدن انسانی پر اس کے طویل المدت یا مختصر اثرات کے بارے میں شرق وغرب کے مؤرخین کے بہت سے اعترافات نظر آتے ہیں جن میں سب کا تذکرہ ایک علیحدہ کتاب کا متقاضی ہے اور مذکورہ بالا بیان ان اعترافات کا ایک بے حد کم اور ناچیز حصہ ہے۔

۴۔ اسلام میں استاد کا مقام

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ علم حاصل کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے واجب عینی ہے اور بعض صورتوں میں واجب کفائی شمار ہوتا ہے، یعنی بعض علوم کو حاصل کرنا سب کے لئے ضروری ہے اور وہ علوم جو خاص افراد کے لئے ہیں اور سب لوگوں کا انھیں حاصل کرنا آسان نہیں، واجب کفائی ہیں۔ علوم کی تعلیم دینا بھی ایسے ہی ہے؛ بعض علوم ایسے ہیں کہ جن سے آگاہ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ سب کو ان کی تعلیم دیں جبکہ بعض علوم کی تعلیم وتدریس واجب کفائی ہے۔ مجموعی طور پر ان تمام علوم کا حصول جن کے ساتھ معاشرے کی معنوی اور مادی وابستگی ہوتی ہے، کبھی سب پر اور کبھی بعض خاص افراد پر واجب ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جدید علمی پیشرفت سے علیحدگی اختیار کرے، بلکہ حکومت اسلامی کے ارکان کی مضبوطی اور تقویت کی خاطر تعلیم وتعلم کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جانی چاہیے اور یقینا اگر مسلمان اس سلسلے میں کسی کوتاہی کا ارتکاب کریں جو اسلامی ممالک کی پسماندگی کا سبب ثابت ہو تو وہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہیں!

قرآن مجید سب سے پہلا معلم خدا تعالیٰ اور پہلا شاگرد حضرت آدمؑ کو قرار دیتا ہے اور سب سے پہلا علم جو حضرت آدمؑ کو سکھایا گیا، اسے علم الاسماء شمار کرتا ہے (قوی احتمال ہے کہ اسماء سے مراد موجودات جہان اور راز تخلیق سے آگاہی ہے)۔ فقط حضرت آدمؑ ہی نہیں تھے جنھیں خدا نے تعلیم دی، بلکہ حضرت یوسفؑ کو بھی تعبیر خواب کا علم مرحمت فرمایا: ''وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ'' (سورۂ یوسف/۱۰۱) اور حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولی (زبان) سکھائی۔ ''وَقَالَ يَاأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ'' (سورۂ نمل/۱۶) اور حضرت داؤدؑ کو زرہ سازی کی تعلیم دی، ''وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَكُمْ'' (سورۂ انبیاء/۸۰) اور حضرت خضر -کو فراوان اور کثیر علم عطا کیا، ''وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا'' (سورۂ کہف/۶۵) اور فرشتوں کو علم وآگاہی فراوان عطا کی، ''سُبْحَانَكَ لَاعِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا'' (سورۂ بقرہ/۳۲) اور اس نے انسانوں کو بھی تعلیم دی ''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ''، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو وہ کچھ سکھایا جس کا جاننا معمولی انداز میں آپؐ کے لئے ممکن نہیں تھا، ''وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ'' (سورۂ نساء/۱۱۳) خدا کے عظیم فرشتے یعنی فرشتۂ وحی حضرت جبرائیل -آنحضرتؐ نے بہت سی تعلیمات حاصل کیں، ''عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى'' (سورۂ نجم/۵)[1]

انبیائے کرام بھی عظیم ترین معلمین کے زمرے میں قرار پائے ہیں جنھوں نے دنیا ودین سے متعلق بکثرت علوم سے نوع انسان کو آشنا کیا، قرآن مجید رسول اکرمؐ کے بارے میں فرماتا ہے: آپؐ لوگوں کو علم وحکمت سکھاتے ہیں۔

---

[1] اکثر مفسرین نے ''شدید القوی'' سے جبرائیلؑ مراد لئے ہیں لیکن بعض کی رائے میں اس سے مراد خود خدا تعالیٰ ہے۔

''وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتابَ وَالْحِکْمَةَ'' (سورۂ جمعہ/ ۲) یہی لائحہ عمل ہر نبی نے اپنی امت کے بارے میں انجام دیا اور انھیں دنیا و دین کے علم سے مستفید فرمایا۔ علماء جو پیغمبروں کے وارث ہیں، انھوں نے پیغمبروں کے بعد تعلیم دینے کی ذمہ داری اپنے سر لی اور لوگوں کو علم و دانش سے روشناس کرایا، ایسے علماء کا مقام قرآن کی نظر میں اس قدر بلند و بالا ہے کہ ان کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

''یَرْفَعِ اللهُ الَّذِینَ آمَنُوا مِنْکُمْ وَ الَّذِینَ اُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجاتٍ''

''خدا تعالیٰ ایمان لانے والوں اور وہ جنھیں علم عطا کیا گیا ہے، کو عظیم درجات بخشتا ہے۔'' [۱]

احادیث مبارکہ میں معلم کا مقام اس قدر اعلیٰ ہے کہ خدا اور اس کے فرشتے اور تمام موجودات حتیٰ کہ چیونٹیاں اپنے بلوں اور مچھلیاں دریاؤں اور سمندروں میں اس شخص پر درود بھیجتی ہیں جو لوگوں کو امور خیر کی تعلیم دیتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں رسول خداؐ فرماتے ہیں:

''اِنَّ اللهَ وَ مَلائِکَتَهُ حَتَّی النَّمْلَةِ فِی جُحْرِها وَ حَتَّی الْحُوتِ فِی الْبَحْرِ یُصَلُّونَ عَلی مُعَلِّمِ النّاسِ الْخَیْرَ'' [۲]

کئی اور احادیث میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ رسول اکرمؐ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

''اَلا اُخْبِرُکُمْ بِاَجْوَدِ الاَجْوَدِ؟ اللهُ الاَجْوَدُ الاَجْوَدُ! وَ اَنَا اَجْوَدُ وُلْدِ آدَمَ! وَ اَجْوَدُکُمْ مِنْ بَعْدِی رَجُلٌ عَلِمَ عِلْماً فَنَشَرَ عِلْمَهُ یُبْعَثُ یَوْمَ الْقِیامَةِ اُمَّةً وَحْدَهُ!'':

کیا میں تمہیں سب سے زیادہ عطا کرنے والے سے بھی زیادہ عطا کرنے والے کے بارے میں آگاہ نہ کروں؟ عطا کرنے والوں میں سب سے زیادہ عطا کرنے والا خدا ہے اور میں اولاد آدمؑ میں سے سب سے زیادہ عطا کرنے والا ہوں اور میرے بعد تم میں سے سب زیادہ عطا کرنے والا وہ ہے جو علم و حکمت کو حاصل کر کے اسے پھیلائے (نشر کرے) اور دوسروں کو بھی سکھائے ایسا شخص بروز قیامت ایک امت کے طور پر مبعوث کیا جائے گا۔ [۳]

امت کے ساتھ تعبیر کرنا بخوبی ظاہر کرتا ہے کہ معلمین کی وجودی وسعت انسانی معاشرے میں ان کی تعلیمات کی وسعت کی مناسبت سے صورت پذیر ہوتی ہے اور وہ جس قدر شاگردوں کی تربیت کریں گے اسی نسبت سے ان کی معاشرتی اور معنوی شخصیت وسیع تر ہوتی جائے گی اور ایک مرحلے میں ایک امت کی صورت اختیار کر لے گی۔ علم و دانش اور تمدن کی نشر و اشاعت کی اہمیت اسلام میں اس حد

---

[۱] سورۂ مجادلہ/ ۱۱ح

[۲] کنز العمال، حدیث ۲۸۷۳۶۔

[۳] میزان الحکمة، ج ۶، ص ۴۷۴۔

تک ہے کہ ایک معروف حدیث کے مطابق مجلس علم کو جنت کے باغات میں سے ایک باغ قرار دیا گیا ہے۔[1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسلام میں علم حاصل کرنے کے لیے بطور مقدمہ وتمہید جو بھی کام کیا جائے اُسے عبادت شمار کیا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"مُجالَسَةُ الْعُلَماءِ عِبادَةٌ"

یعنی: "علماء کے ساتھ بیٹھنا عبادت ہے۔" [2]

ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظم -فرماتے ہیں:

"اَلنَّظَرُ اِلی وَجْهِ الْعالِمِ حُبّاً لَهُ عِبادَةٌ"

محبت کے ساتھ عالم کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔[3]

اسی طرح ایک اور حدیث میں رسول اکرمؐ جناب ابوذرؓ سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں:

"اَلْجُلُوسُ ساعَةً عِنْدَ مُذاكَرَةِ الْعِلْمِ خَيْرٌ لَكَ مِنْ عِبادَةِ سَنَةٍ، صِيامٍ نَهارِها، وَقِيامِ لَيْلِها وَالنَّظَرُ اِلى وَجْهِ الْعالِمِ خَيْرٌ لَكَ مِنْ عِتْقِ اَلْفِ رَقَبَةٍ"

علمی مذاکرے میں ایک ساعت شرکت کرنا تمہارے لئے ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے، (ایسا سال) جس کے تمام دنوں میں تم روزہ رکھو اور راتیں عبادت میں گزار دو اور عالم کے چہرے پر نگاہ کرنا تمہارے لئے ایک ہزار غلاموں کو آزاد کرنے سے بہتر ہے![4]

اس سلسلے میں بکثرت روایات ہیں اگر ان سب کا تذکرہ کیا جائے تو بات بہت طویل ہوجائے گی لہٰذا اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس بحث کو جناب لقمان حکیم سے روایت شدہ ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ لقمان حکیم اتنی باعظمت شخصیت کے مالک ہیں کہ

---

[1] س حدیث کو اگرچہ ہم نے اسلامی مآخذ ومنابع میں نہیں پایا، لیکن بعض حدیثوں میں بیان ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: "بادِرُوا اِلی رِياضِ الْجَنَّةِ قالُوا يارَسُولَ اللهِ وَما رِياضُ الْجَنَّةِ؟ قالَ حَلَقُ الذِّكْرِ" یعنی جنت کے باغات کی طرف تیزی سے حرکت کرو، عرض کیا گیا: اے رسول خدا! جنت کے باغات کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ذکر کی مجالس وحلقے۔ مرحوم فیض وافی کی جلد اول میں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: حلقۂ ذکر سے یہاں مراد مجلس علم ہے جیسا کہ اس باب کی دوسری احادیث سے استفادہ ہوتا ہے۔ (وافی، ج۱، ص۱۷۷) یہ حدیث صحیح ترمذی میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوئی ہے: "اِذا مَرَرْتُمْ بِرِياضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوا قالَ وَما رِياضُ الْجَنَّةِ؟ قالَ حِلَقُ الذِّكْرِ" (صحیح ترمذی، ج۵، ص۵۳۲، باب ۸۳، حدیث ۳۵۱۰)۔

[2] بحار الانوار، ج۱، ص۲۰۴۔

[3] بحار الانوار، ج۱، ص۲۰۵۔

[4] بحار الانوار، ج۱، ص۲۰۳۔

ان کی باتوں کو قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ آپ نے اپنے فرزند سے فرمایا:

"یَابُنَیَّ جالِسِ الْعُلَماءَ... فَاِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ یُحْیِی الْقُلُوبَ بِنُورِ الْحِکْمَةِ کَما یُحْیِی الاَرْضَ بِوابِلِ السَّماءِ"

یعنی: میرے بیٹے! علماء کے ہم نشین بنو...... کیونکہ خدا تعالیٰ دلوں کو علم کے نور سے روشن کرتا ہے، جس طرح بارش کے موٹے موٹے قطرے زمین کو زندہ کرتے ہیں۔ [1]

بیان شدہ امور سے بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ مسئلہ تعلیم و تربیت اور دانش و تمدن کی اشاعت کو اسلامی دستور العمل میں بالعموم اور حکومت اسلامی کے پروگرام میں بالخصوص نہایت اہمیت حاصل ہے اور تعلیم و تربیت کو غیر معمولی اہمیت دینا حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے۔

۵۔ بالواسطہ اور بلا واسطہ تعلیمات

گزشتہ صفات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ زیادہ تر بلا واسطہ تعلیم و تربیت سے متعلق تھا۔ مدارس وغیرہ میں تدریس کرنا لیکن اسلام میں بالواسطہ تعلیمات بھی کثرت کے ساتھ ہیں جن کا اثر کئی لحاظ سے بلا واسطہ تعلیمات کی نسبت وسیع اور عمیق تر ہے۔ اسلامی عبادات خاص طور پر وہ عبادات جو جماعت کی صورت میں انجام دی جاتی ہیں مثلاً نماز جماعت، نماز جمعہ اور حج وغیرہ ایسے امور میں سے ہیں جو لوگوں کی اجتماعی تعلیم پر بہت قوی اثر ڈالتی ہیں۔

نماز جماعت جو دن رات میں پانچ بار انجام دی جاتی ہے، مسلمانوں کو، اتحاد، مساوات اور برادری کا درس دیتی ہے اور معاشرے کے مختلف طبقات جو بعض اوقات معاشرے میں مختلف ذمہ داریوں کے نتیجے میں ایک دوسرے سے مکمل طور پر کٹے ہوتے ہیں اور پورے سال میں ایک بار بھی ایک دوسرے سے مل نہیں پاتے نماز جماعت انھیں یکجا اور ایک ساتھ جمع کرتے ہوئے معاشرتی مسائل میں ہم فکری اور ہم دلی سے انھیں آشنا کرتی ہے۔

نماز جماعت کی صفیں جن پر روحانیت چھائی ہوتی ہے، اسلامی معاشرے کے اجتماعی مسائل سے آگاہی اور ان کے حل کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ مسلمان آغازِ اسلام میں نماز جماعت کے ذریعے اپنے بے شمار دشمنوں کے مقابلے ۔۔۔ صفوں وحدت کے علاوہ ایک دوسرے سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور اس طرح حکومت اسلامی کے منصوبوں کو سرعت کے ساتھ عملی جامہ پہنانے میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔

نماز جماعت میں اسلامی احکام کے مطابق سورۂ حمد اور دوسری سورہ کی قرائت کے وقت فقط امام جماعت ان دو سورتوں کو پڑھتا ہے اور اس طرح اجتماعی نظم وضبط کو زندہ کیا جاتا ہے اور روحانیت آمیز (نظم وضبط) کے ذریعے ان دو سورتوں کے مفہوم کو امام جماعت لوگوں

[1] بحار الانوار، ج ۱، ص ۲۰۴۔

کے دلوں میں پروان چڑھاتا ہے۔

یہ نکتہ اہمیت کا حامل ہے کہ مختلف مناسبتوں کے لحاظ سے قرآن کی مختلف سورتوں اور آیتوں کو سورۂ حمد کے بعد تلاوت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک سورت معارف اسلامی، اخلاق اور سیاسی و معاشرتی تعلیمات پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس وقت یہ آیات اور سورتیں ایک دلنشین انداز میں امام جماعت کے ذریعے پڑھی جاتی ہیں، جبکہ باقی سب افراد کھڑے ہوئے اور ایک گہرے سکوت میں ڈوبے ہوتے ہیں، تو ان پر ان سورتوں اور آیتوں کا ایک قوی اور بے نظیر اثر پڑتا ہے اور سب کو مضمون آیات میں غور و فکر کا موقع ملتا ہے اور عبادت کی روحانیت اس اثر گذاری کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے اور اگر یہ عبادات اسلامی آداب، حضور قلب اور پوری توجہ کے ساتھ انجام دی جائیں جو، ان کی قبولیت کی اصلی شرط ہے، تو یہ نماز جماعت اسلامی معاشرے کے لئے ایک پرثمر اور بااثر مکتب کی صورت اختیار کر سکتی ہے اور اس سے قطع نظر یہ دشمنوں اور اغیار کے لئے ایک تعلیمی درس ثابت ہو سکتی ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب وہ مسلمانوں کو صف بستہ اور منظم نماز جماعت کی صورت میں دیکھتے ہیں تو غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایک حدیث میں امام رضا -فرماتے ہیں:

"اِنَّما جُعِلَت الْجَماعَةُ لِئَلّا یَکُونَ الاِخْلاصُ وَالتَوحِیدُ وَالاِسْلامُ وَالْعِبادَةُ لِلّٰهِ اِلاّ ظاهِراً مَکْشوفاً مَشْهُوراً، لِاَنَّ فی اِظْهارِهِ حُجَّة عَلی اَهْلِ الشَّرْقِ وَالْغَرْبِ... مَعَ ما فیهِ مِنَ الْمُساعَدَةِ عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوی، وَالزَّجْرِ عَنْ کَثیرٍ مِنْ مَعاصِی اللهِ عَزَّوَجَلَّ"

''نماز جماعت کو قائم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایمان، توحید، اسلام اور خدا کی عبادت ظاہر اور آشکار طور پر انجام پائے کیونکہ عبادت کے اظہار سے دنیا کے مشرق و مغرب پر حجت تمام ہو جاتی ہے (اور اس سے اسلام اور تعلیمات اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کی ترغیب ملتی ہے)...... اس کے علاوہ یہ نیکی اور تقویٰ کی بنیاد پر امداد (اور ایک دوسرے کے حال سے آگاہی اور آپس میں سب کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون) اور اسی طرح بہت سارے گناہوں اور معصیت الٰہی کی روک تھام کا سبب بنتا ہے (کیونکہ جب لوگ شب و روز میں چند بار اس روحانی فضا میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو دوسروں کے حقوق پر تجاوز اور گناہوں کے ارتکاب سے شرم اور دائمی طور پر حاضر ہونے کی وجہ سے) اجتناب کرتے ہیں۔''[1]

مختصر یہ کہ مسلمانوں کی بیداری اور تعلیم و تربیت پر نماز جماعت کا اثر انداز ہونا کسی پر پوشیدہ نہیں، اسی طرح دشمنوں کی سازشوں کی بیخ کنی اور ان کی طاقت کو ختم کرنے میں بھی اس کی اثرات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔

یہی وجہ ہے یہ عبادت نہایت اہم ہے اور اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور احادیث میں اس کی اس قدر فضیلت اور ثواب بیان ہوا ہے کہ جس انسان حیران ہو جاتا ہے۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث میں بیان فرماتے ہیں:

"مَنْ مَشی اِلی مَسْجِدٍ یَطْلُبُ فیه الْجَماعَةَ کانَ لَهُ بِکُلِّ خُطْوَةٍ سَبْعُونَ اَلْفَ حَسَنَةٍ، وَ

---

[1] وسائل الشیعۃ، ج ۵، ص ۳۷۲۔

یُرْفَعُ لَهُ مِنَ الدَّرَجاتِ مِثْلُ ذٰلِكَ، فَاِنْ ماتَ وَهُوَ عَلٰی ذٰلِكَ، وَ کَّلَ اللهُ بِهِ سَبْعَینَ اَلْفَ مَلَكٍ یَعُودُونَهُ فی قَبْرِهِ وَ یُبَشِّرُونَهُ وَ یُؤنِسُونَهُ فی وَحْدَتِهِ وَ یَسْتَغْفِرونَ لَهُ حَتّٰی یُبْعَثُ۔"

''وہ شخص جونماز جماعت میں شرکت کی غرض سے جاتا ہےتو اسے اس کے ہرقدم کے بدلے میں ستر ہزار نیکیاں ملیں گی اور اسی مناسبت سے اس کے درجات بھی بلند ہوں گے اور اگر اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوجاتا ہےتو خدا تعالیٰ ستر ہزار فرشتوں کو مامور کرتا ہے کہ وہ قبر میں اس سے ملاقات کریں اور اسے بشارت دیں اور تنہائی میں اس کے مونس ہوں اور قیامت تک اس کے لئے استغفار کرتے رہیں!''[۱]

٦۔نماز جمعہ اور اس کے تربیتی اثرات

نماز جمعہ ایک اور اہم عبادت اور سیاسی وعبادی اجتماع ہے۔جو تعلیم وتربیت کے لحاظ سے اسلامی معاشرے پر بالواسطہ اور بلا واسطہ گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ یہ باعظمت اور پرشکوہ نماز ہر ہفتے میں ایک بار قائم کی جاتی ہے اور ایک شہر کے تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک ہی نماز جمعہ میں شرکت کریں۔[۲]

نماز جمعہ میں نماز سے قبل دو خطبے بیان کئے جاتے ہیں جو وعظ ونصیحت،تقویٰ وپرہیز گاری کی تاکید اور خاص طور پر معاشرے کے اہم سیاسی اور معاشرتی مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں جو روحانی لطافت، گناہوں کی آلودگی سے طہارت اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی معارف اسلامی سے آگاہی، اجتماعی وسیاسی واقعات سے آگاہ ہونے اور ان کے سلسلے میں درست رویہ اپنانے کا باعث بنتے ہیں یہی نہیں بلکہ یہ خطبات روح دینی اور معنوی نشاط کے سائے میں مشکلات کے حل کے لئے عمومی تعاون کی فضا بھی فراہم کرتے ہیں۔

دو خطبے بیان کرنا نماز جمعہ کے واجبات میں سے ہے،خطبے کے آداب کے بارے میں احادیث اور فقہ کی کتابوں میں آیا ہے کہ خطیب اس قدر بلند آواز سے خطاب کرے کہ تمام لوگوں کو اس کی آواز اچھی طرح سنائی دے اور تمام لوگوں کو خطبے کے دوران خاموش رہنا چاہیے اور وہ خطیب کی طرف متوجہ ہوکر اس کی باتوں پر کان لگائے رہیں۔خطیب کو فصیح وبلیغ ہونا چاہیے جو مسلمانوں کے احوال ومسائل سے آگاہ ہو اور اہل اسلام کے مفادات سے باخبر،شجاع اور حق بیانی میں صریح لہجے کا مالک ہو،اس کے علاوہ اسے ایسا ہونا چاہیے کہ اس کا حسن سلوک اور طرز عمل معاشرے پر اس کے کلام کے مؤثر ہونے کا سبب بنے اور اس کی طرز زندگی سے لوگوں کو یاد خدا آجائے۔

---

[۱] وسائل الشیعہ ،ص ۳۷۲،حدیث ۷۔

[۲] مکتب اہل بیت کے پیروکاروں کا یہی عقیدہ ہے جبکہ اہل سنت کے نزدیک نماز جمعہ متعدد جگہ پر نماز جماعت کی طرح مختلف مساجد میں منعقد کی جاسکتی ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، ج۱ص ۳۸۵)۔

ان خطبوں میں مسلمانوں کے اہم دینی اور دنیوی مسائل کو بیان کیا جانا چاہیے اور وہ سب کچھ بیان ہونا چاہیے جو بیرونی مما لک اور اندرونی ملک مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے، اسی طرح اہم سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی مسائل ترجیحات کو پیش نظر رکھ کر پیش کئے جائیں اور ضروری آگاہی سے لوگوں کو مستفید اور انھیں دشمنوں کی سازشوں سے باخبر کیا جائے اور ان کے منصوبوں کو نقش بر آب کرنے کے لئے مختصر یا طویل مدت کے لائحہ عمل سے انھیں آگاہ کیا جائے۔

خطیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذہین، بیدار اور اسلام کے مادی و معنوی مسائل میں صاحب فکر و مطالعہ ہو اور نماز جمعہ کے اس اجتماع سے مسلمانوں کی آگاہی اور مقاصد اسلامی کی پیشرفت کے لئے بہترین استفادہ کر سکے۔ ایک جامع اور پُر معنی حدیث میں امام رضا نے فرمایا: ''نماز جمعہ کے خطبے اس لئے ہوتے ہیں کہ نماز جمعہ ایک عمومی لائحہ عمل ہے۔ خدا تعالیٰ امیر مسلمین کو یہ امکان فراہم کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے خدا کی اطاعت کی ترغیب دلائے اور خدا کی معصیت و نافرمانی سے انھیں بچنے کی تلقین و تاکید کرے۔''

آپؑ نے مزید فرمایا:

"وَ تَوْقِيفِهُمْ عَلى ما اَرادَ مِنْ مَصْلَحَةِ دِينِهِمْ وَ دُنْياهُمْ وَ يُخْبِرُهُمْ بِما وَرَدَ عَلَيْهِمْ مِنَ الآفاقِ مِنَ الاَهْوالِ الَّتى لَهُمْ فِيهَا الْمَضَرَّةُ و الْمَنْفَعَةُ"

''اور وہ (خطیب) انھیں اہم واقعات سے آگاہ کرے جو اس تک مختلف مقامات سے پہنچتے ہیں اور جو لوگوں کے نفع و نقصان اور عام زندگی گزارنے میں مؤثر واقع ہو سکتے ہیں۔'' اس کے بعد آپؑ نے فرمایا: ''یہ جو نماز جمعہ میں دو خطبے مقرر کئے گئے ہیں اس لئے ہیں کہ ایک خطبے میں خدا کی حمد و ثنا، تمجید و تقدیس الٰہی (اور اخلاقی و معنوی مسائل کا) بیان ہو اور دوسرے میں معاشرتی ضرورتوں، تنبیہات، دعا اور اسلامی معاشرے کی اصلاح سے متعلق اوامر و نواہی اور احکامات کا بیان ہو جن سے آشنائی عوام الناس کے لئے ضروری ہے۔''[1]

لوگوں کی سیاسی اور اجتماعی مسائل کے بارے میں آگاہی پیدا کرنے میں نماز جمعہ آج جو کردار ادا کر رہی ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ذرائع و ابلاغ کے ذریعے دشمن کے ہفتے بھر کے پروپیگنڈے نماز جمعہ کے ایک ہی خطبے کے ذریعے اپنا اثر کھو دیتے ہیں اور اگر مسلمان اس اہم اسلامی پروگرام کو صحیح انداز میں جان لیں اور اسے اسی طرح انجام دیں جیسے اسلام چاہتا ہے اور بعض ضعیف النفس اور غیروں کی آلۂ کار حکومتوں کی طرح اس عظیم عبادت کا چہرہ مسخ نہ کریں، تو وہ تمدن اور تعلیم و تربیت پر اس کے مثبت اثرات اور اس کی اس کی برکات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

نماز عیدین (عید الفطر و عید الاضحیٰ) جو ساتھ مشابہت رکھتی ہے اپنے ان دو خطبوں کی وجہ سے جو نماز کے بعد بیان کئے جاتے ہیں، نماز جمعہ ہی کی طرح اثرات و برکات رکھتی ہیں۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۵، ص۳۹، حدیث ٦۔

۷۔ حج کے عظیم اجتماع کے تمدنی اور ثقافتی اثرات

ایک اور اسلامی عبادت جو مسلمانوں کی تعلیم و تربیت، علم کی نشر و اشاعت، اتحاد و وحدت اور شان و شوکت کے لحاظ سے بہت مؤثر ہے، وہ عبادت حج ہے جو ہر سال پوری دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دیتی ہے اور انھیں ایک عظیم اجتماع کی صورت میں جمع کر کے معنوی اور مادی تعلیمات سے بہرہ مند کرتی ہے۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ فریضہ حج ہر صاحب استطاعت مسلمان پر پوری زندگی میں فقط ایک بار واجب اور کئی دفعہ بجالانا مستحب ہے۔

اس سلسلے میں عورت، مرد، بوڑھے، جوان، گورے، کالے، پڑھے لکھے اور ان پڑھ میں کوئی فرق نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر سال مسلمانوں کی علمی ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی شخصیات حجاج کے ہمراہ خانہ خدا کی زیارت کے لئے آتی ہیں اور اس عرصے میں مکہ، مدینہ اور دیگر مقامات پر (ان شخصیات) کا آپس میں رابطہ قائم رہتا ہے اور اس طرح معلومات کا آپس میں قابل ملاحظہ تبادلہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر ان آخری چند سالوں میں بہت سارے مسلمان اس عظیم معنوی اجتماع کی اہمیت سے آشنا ہو چکے ہیں اور اسی وجہ سے وہ حج کے پرشکوہ مناسک کی ادائیگی کے ضمن میں اجتماعات، سمینار اور کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں تاکہ مختلف ممالک کے دانشور حضرات ان میں جمع ہوں اور اپنے ثقافتی تحائف اور سوغاتوں کا آپس میں تبادلہ کریں۔ قرآن مجید ایک مختصر جملے میں فلسفۂ حج اور اس کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ"

''لوگ اس مقدس سرزمین کی طرف اس لئے آتے ہیں تاکہ اپنے منافع کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں!'' [۱]

مفسرین نے اس مقام پر کلمہ "منافع" پر بہت گفتگو کی ہے، لیکن ایک بات واضح ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں کوئی محدودیت نہیں لہٰذا یہ لفظ تمام منافع اور معنوی برکات اور مادی سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی فلسفوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ربیع بن خثیم نے اس کلمہ کی تفسیر امام جعفر صادقؑ سے پوچھی تو آپؑ نے فرمایا: ''اس سے مراد دنیا و آخرت دونوں کے منافع ہیں''۔ [۲]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ نے ہشام بن حکم کے جواب میں فلسفۂ حج کے بارے میں اس کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کے طفیل تمام دنیا کے مسلمان ایک دوسرے سے آشنا ہوتے ہیں، پھر اس کے اقتصادی منافع اور حج کے باعث پیدا ہونے والے مشاغل اور آخر کار اس کے ثقافتی اثرات کی طرف آپؑ نے اشارہ کیا اور فرمایا:

"وَ لِتُعْرَفُ آثَارُ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم وَ تُعْرَفُ اَخْبارُهُ وَ يُذْكَرُ وَلا يُنْسى"

---

[۱] سورہ حج / ۲۸

[۲] تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۴۸۸۔

نیز اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ رسول اکرمؐ کے آثار واخبار کی معرفت حاصل ہو (اور اسلامی علوم ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوں) اور انھیں بھلانہ دیا جائے۔[1]

بہر حال اگر کوئی شخص حج کے مراسم ومناسک پر غور کرے، خاص طور پر نزدیک سے ان کا مشاہدہ کرے تو وہ اس کے تعلیمی اور ثقافتی پہلو کی اہمیت سے آگاہ ہوجائے گا جو بلاشبہ کم نظیر یا بے نظیر ہے۔ جی ہاں! حج ہر سال ایک عظیم ثقافتی کانفرنس یا کانفرنسوں میں تبدیل ہوسکتا ہے اور اسلامی دانشور مکہ میں اپنی موجودگی کے دوران جمع ہوکر حج کے خاص معنوی اثرات کے علاوہ اپنے نئے اور بدیع افکار کو دوسروں تک منتقل کرسکتے ہیں۔

اس گھٹن آلود فضا میں جب ستمگر اور ظالم خلفاء وسلاطین مسلمانوں کو معارف اسلامی کی نشر واشاعت کی اجازت نہیں دیتے تھے، وہ اس فرصت سے استفادہ کرتے جو فریضۂ حج انھیں فراہم کرتا تھا، اس طرح وہ اپنی بہت سی مشکلات حل کرلیتے اور ائمہ ھدیٰؑ اور بزرگ علماء سے رابطہ قائم کرکے معارف اور قوانین اسلام اور سنت رسول اکرمؐ پر پڑے ہوئے پردے کو اٹھادیتے اور اپنے شہروں اور ملکوں کی طرف واپسی کے وقت، اہم معنوی اور اخلاقی پیغام اپنے ہمراہ لاتے تھے۔

۸۔معروف مساجد اور زیارتگاہوں کے اثرات

وہ مراکز جو اسلامی ثقافت کی نشر واشاعت میں اور عوام کو آگاہ کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارے دینی پیشواؤں کے مزارات بھی ہیں کہ لوگ ہمیشہ اسلامی ممالک گوشے گوشے سے معنوی سفر کی حیثیت سے ان پر حاضری دیتے ہیں اور اس طرح یہ تبادلہ اطلاعات اور انتقال معلومات اور اجنبی ثقافتوں کی یلغار کے خلاف جنگ کا بہترین وسیلہ ہیں۔ اسلام میں بعض ایسی معروف مساجد موجود ہیں جن کی زیارت کا حکم دیا گیا ہے باصطلاح ان کی طرف ''رخت سفر'' کا حکم ہے اور ان میں عبادت کے ذریعے اپنے دل وجان کو نور معنویت میں غرق کرکے دور ونزدیک کے علاقوں سے آئے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ عملاً ثقافتی تعلق قائم کرکے اسے مضبوط کیا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں امیر المؤمنین -فرماتے ہیں:

"لَایُشَدُّ الرِّحالُ اِلاّ اِلی ثَلاثَةِ مَساجِدَ: اَلْمَسْجِدِالْحَرامِ وَمَسْجِدِ الرَّسُولِ وَمَسْجِدِ الْکُوفَةِ"

صرف تین مساجد کے لئے کمر ہمت باندھو: مسجد الحرام، مسجد نبوی جو مدینہ میں ہے اور مسجد کوفہ۔[2]

یہ مطلب اہل سنت کی معروف کتب میں بھی بیان ہوا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اکرمؐ فرماتے ہیں:

---

[1] وسائل الشیعه، ج۸، ص۹، حدیث۱۸۔

[2] وسائل الشیعه، ج۳، ص۵۵۲، احکام مساجد، باب۴۴، حدیث۱۶۔

"لاتُشَدُّ الرِّحالُ اِلّا ثَلاثَةِ مَساجِدَ: مَسْجِدی هذا وَ مَسْجِدِ الْحَرامِ وَمَسْجِدِ الاَقْصی"

سفر صرف تین مساجد کی طرف ہونا چاہیے: میری مسجد، مسجد الحرام اور مسجد الاقصیٰ ۔ [1]

واضح ہے کہ یہ دو حدیثیں آپس میں منافات نہیں رکھتیں کیونکہ جب دونوں کو ایک ساتھ ملایا جائے تو چار مساجد مورد توجہ قرار پاتی ہیں، بدیہی ہے کہ ان احادیث سے مراد تین یا چار مساجد کی اہمیت کو بیان کرنا ہے اور اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں اگر انسان کسی دوسری مسجد میں شرکت کے لئے رخت سفر باندھے تو اس نے خلاف شرع عمل انجام دیا ہے جیسا کہ بعض بے شعور افراد گمان کرتے ہیں کیونکہ اگر ان احادیث کا مفہوم تحریم (حرام ہونا) ہو تو مطلق طور پر ہر سفر سوائے ان تین سفروں کے حرام ہونا چاہیے جبکہ جائز سفر بے شمار ہیں۔ (توجہ رہے کہ "لاتُشَدُّ الرِّحال" مطلق ہے اور سارے سفر اس کی حدود میں آجاتے ہیں!) اسی سے ملتا جلتا مطلب بحار الانوار میں بھی آیا ہے۔ [2]

اس قسم کی مساجد درحقیقت اہم علمی و ثقافتی مراکز ہیں اور صدر اسلام میں سالہا سال درس و بحث کا مرکز رہی ہیں اور بزرگ علماء ان میں اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ اب بھی مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ میں پورے سال مجالس علمی منعقد کی جاتی ہیں اور دوسرے ممالک مثلاً سوریہ، عراق اور ایران کی اہم مساجد تعلیم و تربیت کا مرکز ہیں اور کبھی بہت ہی بڑی بڑی کلاسیں ان میں تشکیل دی جاتی ہیں اور شاید ان مساجد میں عبادت کے قصد سے دور و نزدیک کے مقامات سے آنے اور ان کی طرف رخت سفر باندھنے کی مسلمانوں کو ترغیب دینا شاہد اس وجہ سے ہو کہ مسجد سے معنوی استفادے معنویت کے علاوہ وہ لوگ ان مساجد کے ماضی میں کارناموں کی طرف بھی متوجہ ہوں اور ان کے علمی پہلوؤں سے بھی استفادہ کریں۔

یہی بات پیشوایان اسلامؑ کے مقدس حرموں میں بھی موجود ہے کیونکہ ان کے مزار کا صحن یا حرم غالباً علوم اسلامی کی تدریس کا مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے اور ان مقامات (مزارات) سے زیارت کے علاوہ میں علمی استفادہ بھی کیا جاتا ہے۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ بعض زیارتگاہیں جیسے امام علی الرضا - کے حرم کی ہر سال بارہ ملین سے زیادہ لوگ زیارت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر پورے سال عظیم اجتماعات منعقد ہوتے رہتے ہیں اسی طرح سیمنار، کانفرنسیں اور مجالس علمی کا انعقاد بھی جاری رہتا ہے اور یہ تمام چیزیں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت پر نہایت گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، ج ۲، ص ۱۰۱۴، کتاب الحج، باب ۹۵، حدیث ۱۳۹۷۔

[2] بحار، ج ۹۶، ص ۲۴۰، باب ۴۴، حدیث ۲۔

حکومت اسلامی میں مطبوعات کا کردار

اشارہ

بلاشبہ آج کی دنیا میں تعلیم وتربیت کے اہم ذرائع میں سے ایک ذریعہ مطبوعات ہیں، جو صنعت اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے پوری دنیا میں پھیل چکی ہیں اور افکار عامہ کی اصلاح یا خرابی اور اسے خوشنما یا بدنما بنانے کا ایک قوی اور مضبوط عامل ہیں اور عصر حاضر میں کہ ایک اخبار یا مجلہ بیک وقت دنیا کے کئی بر اعظموں میں چھپ کر پورے دنیا میں ضائع ہورہا ہے اور افکار عامہ کو کسی نہ کسی طرح متاثر کررہا ہے۔یقینی طور پر ماضی میں مطبوعات کا کردار اس قدر وسیع نہیں تھا۔ بہرحال کتاب ولائبریری کا ہمیشہ سے پوری تاریخ میں تعلیم وتربیت اور علوم کے ایک نسل سے دوسری نسل میں انتقال اور ثقافتوں کے تکامل میں ایک غیر معمولی کردار رہا ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو اہمیت قرآن نے کتاب وکتابت کو دی ہے اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، یقینی طور پر کتاب وکتابت آغاز اسلام ہی میں مسلمانوں کی علمی تحریک اور کوشش کا سبب بنی ہے۔اس ضمن میں قرآن مجید میں بکثرت آیات آئی ہیں:

۱۔نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (سورۂ قلم ۱)

۲۔اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ
(سورۂ علق ۳ تا ۵)

۳۔وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ '(سورۂ بقرہ ۲۸۲)

۴۔وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ''(سورۂ بقرہ ۲۸۲)

۵۔وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا (سورۂ سبأ ۴۴)

۶۔اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ
(سورۂ احقاف ۴)

۷۔رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (سورۂ بینہ ۲و۳)

ترجمہ:

۱۔قسم ہے قلم کی اور اس کی جو وہ لکھتے ہیں۔

۲۔ پڑھ کہ تمہارا رب سب سے زیادہ کرامت و بزرگی والا ہے، وہی جس نے قلم کے ذریعے تعلم دی انسان کو، اس چیز کی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

۳۔ ضروری ہے کہ کوئی لکھنے والا عدالت کے مطابق اس (سند کو) تمہارے درمیان تحریر کرے، اور وہ جو کتابت سے آشنا ہے لکھنے سے پرہیز نہ کرے، ایسے ہی جس طرح خدا نے اسے تعلیم عطا کی ہے، پس وہ ضرور لکھے۔

۴۔ شاہد اور کاتب کو ہرگز (حق گوئی کی وجہ سے) کوئی نقصان نہ پہنچے۔

۵۔ ہم نے (اس سے پہلے) آسمانی کتاب نام کی کوئی چیز انھیں نہیں دی کہ وہ اسے پڑھیں (اور اس پر اعتماد کر کے تمہاری باتوں کو جھٹلائیں)

۶۔ کسی کتاب آسمانی (اس کتاب سے پہلے) یا گذشتگان کے کسی علمی اثر (کتاب وغیرہ) کو میرے پاس لاؤ (جو تمہارے صدق گفتار کی دلیل بن سکے) اگر تم اپنے وعدے میں سچے ہو۔

۷۔ خدا کی طرف سے ایک رسول (ان کے پاس آئے) جو پاکیزہ صحیفوں کو انھیں پڑھ کر سنائے اور جن میں صحیح اور قدر و قیمت کی حامل کتب (تحریریں) ہوں۔

تشریح

آیات قرآنی میں اہم مسائل کی تاکید کے لئے بعض اوقات قسم پر اعتماد کیا جاتا ہے کبھی یہ قسم خدا کی ذات پاک کی اور اکثر مقامات پر کائنات کی اہم مخلوقات کھائی جاتی ہے: مثلاً سورج، چاند اور زمین وغیرہ کی۔ ہمارے موضوع کی پہلی آیت، سورۂ قلم کی اولین آیت ہے جس میں قلم کی قسم اور وہ تمام مسائل کی قسم اُٹھائی گئی ہے جو قلم سے لکھے جاتے ہیں، اس کے بعد قرآن فرماتا ہے: ''نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ...'' درحقیقت یہاں جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے ظاہری طور پر ایک چھوٹی سی چیز ہے۔ سرکنڈے کا چھوٹا سا ٹکڑا یا اس کے مشابہ کوئی چیز، اور تھوڑا سا رنگین محلول بعد از اں وہ سطور جو ناچیز صفحات پر لکھی جاتی ہیں، لیکن حقیقت میں تمام انسانی ثقافتوں، علوم و دانش، بیداری، فکر و اندیشہ اور تشکیل مذاہب کا سرچشمہ اور تعلیم و تربیت اور ہدایت و آگاہی بشر کا منبع یہی معمولی سی چیز میں ہی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اہل دانش انسانی حیات کو دو زمانوں میں تقسیم کرتے ہیں: ''زمانۂ تاریخی'' اور ''زمانۂ قبل از تاریخ'' اور کہتے ہیں کہ انسان کا تاریخی زمانہ اس وقت سے شروع ہوا جب لکھنے کا عمل ایجاد ہوا اور انسان قلم ہاتھ میں لے کر اپنی زندگی کے واقعات کو صفحات پر لکھنے کے قابل ہوا اور اس سے پہلے زمانے کو زمانۂ قبل از تاریخ کہتے ہیں۔ یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ یہ آیت ایک ایسے ماحول میں نازل ہوئی جو دنیا کا پسماندہ ترین ماحول تھا اور اس میں کوئی لکھنے اور قلم کی اہمیت سے واقف نہیں تھا، چند افراد جن کا تعلق مکہ سے تھا، معمولی پڑھے

لکھنے اور پڑھنے اور لکھنے سے کسی قدر آشنا تھے، وہ مکہ جو حجاز کا سب سے بڑا عبادتی، سیاسی اور اقتصادی مرکز تھا (بعض اہل دانش کے بقول) ان پڑھے لکھے افراد کی تعداد بیس تک بھی نہیں پہنچتی تھی، ایسے ماحول میں قلم کی قسم کھانا، کس قدر عظمت اور شان و شوکت رکھتا ہے؟!

قرآن کے قسم کھانے کی حکمت اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان امور کی رغبت دلائی جائی جن کی قسم کھائی جارہی ہے، اور اس آیت میں بھی یہی ہے کہ یہ افکار پڑھنے لکھنے، کتابیں لکھنے دوسروں کی کتابوں کے ترجمے اور عالم اسلام میں علوم کی نشر و اشاعت کا سبب ثابت ہوئے۔ ہمارے زیر بحث دوسری آیت، قول مشہور کے مطابق وہ پہلی آیت ہے، جو جبل النور کی بلندی پر غار حرا میں رسول اکرمؐ کے قلب اطہر پر نازل ہوئی اور یہ وحی کی سب سے پہلی چنگاری تھی، قدرتی طور پر یہ آیہ شریفہ اہم مسائل کی طرف اشارہ کرتی ہے، جب آیات قرآن کی تلاوت کا حکم رسول کو دیتی ہے تو یوں ارشاد ہوتا ہے:

''پڑھ کے تیرا پروردگار سب سے زیادہ بزرگوار ہے، وہ (وہی ہے) جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا''

"اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ"

اس ترتیب کے مطابق خداوند اپنی ربوبیت و کرامت کو بیان کرنے کے بعد قلم کے ذریعے تعلیم کو بیان کرتا ہے جو "مَا لَمْ يَعْلَمْ" کا سرچشمہ ہے۔ اس طرح وحی کا آغاز قلم سے پیدا ہونے والی حرکت سے ہوتا ہے۔ اور یہ بات نہایت بامعنیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر مسلمان کے لئے سبق آموز ہے۔ انہی تعبیرات و بیانات کی وجہ سے مسلمانوں کی مسلسل اور عمیق توجہ کتاب و کتابخانے اور تعلیم علوم کی طرف مبذول ہوئی اور اگر احادیث میں یہ آیا ہے کہ ''مداد علماء'' (علماء کے قلم کی سیاہی) ''دماء شہیداء'' (شہیدوں کے خون) پر فوقیت رکھتی ہے تو یہ اسی وجہ سے ہے کہ خون شہید کی بنیاد وہ عقائد و معارف ہیں جو زیادہ تر قلم سے ظاہر ہوئے ہیں، علاوہ ازیں خون شہداء کی بقا بھی علماء کے قلم کی سیاہی (روشنائی) ہی کی وجہ سے ہے۔

اصولی طور پر انسان اور افکار کی منتقلی کے درمیان تفاہم و ہم آہنگی کے صرف دو طریقے ہیں: بیان و قلم؛ اس فرق کے ساتھ کہ بیان ایک زمانے میں اور ایک جگہ حاضر افراد کے درمیان و تعلق پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن قلم کے ذریعے ہر زمانے میں، ہر انسان کے دوسرے انسان اور حال، ماضی اور آئندہ کی نسلوں کے آپس کے تعلقات برقرار ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک دانشور کا قول ہے:

"بَیانُ اللِّسانِ تُدْرِسُهُ الاَعْوامُ وَ ما تُثْبِتُهُ الاَقْلامُ باقٍ عَلَی مَرِّ الاَیّامِ"

''زبان کے ذریعے بیان سالوں کے گذرنے کے ساتھ ہی پرانا اور فراموش ہو جاتا ہے لیکن جو کچھ قلم ثبت کرتا ہے، ہمیشہ باقی رہتا ہے۔''

اسی بناء پر اہل علم و دانش کے درمیان یہ مطلب معروف رہا ہے کہ قلم کی نوک بناتے وقت جو چھلکے گرتے ہیں ان کو پاؤں کے نیچے نہ گرائیں کیونکہ یہ بھی قابل احترام ہیں! قابل توجہ بات یہ ہے کہ جس طرح ''بیان'' انسان کی خصوصیت ہے قلم بھی اس کی خصوصیات

میں سے ہے، بلکہ یہ بیان سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے اور یہ بعید نہیں کہ خدا کی طرف سے تعلیم، خواہ تعلیم مستقیم یعنی انبیاء مثلاً آدم - یا ادریس - کے ذریعے ہوئی ہو یا غیر مستقیم طریقے سے، یعنی نوع بشر کو پڑھنے اور لکھنے کی استعداد بطور عطیۂ الٰہی اور اس کی بخشش کے طور پر ہو ایک عظیم ترین نعمت شمار ہے اور وحی کے آغاز کے ساتھ ہی اس پر اعتماد کرنا اور عظمت خدا کو بیان کرنے کے بعد اس کی طرف اشارہ کرنا اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

تیسری آیت میں جو قرآن مجید کی طولانی تریں آیات میں سے ایک ہے، جو لوگوں کے درمیان اسناد کی تنظیم وتشکیل سے متعلق ہے، اس میں قلم کی طرف ایک خاص توجہ دی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: کوئی لکھنے والا عادلانہ انداز میں (قرضے کی سند کو) تحریر کرے:

"وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ"

بعد از اں اللہ تعالیٰ مزید ارشاد فرماتا ہے: وہ شخص جو لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے حق حاصل نہیں کہ وہ لکھنے سے انکار کرے، اسی طرح جیسے خدا نے اسے تعلیم دی ہے (اور اس سے اجتناب نہیں کیا)۔ "وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللهُ فَلْيَكْتُبْ" یہاں بھی لکھنے کی صلاحیت کو قرآن ایک عطیہ الٰہی شمار کرتا ہے اور جسے خدا نے یہ صلاحیت دی ہے اسے تاکید کرتا ہے کہ وہ ان پڑھ لوگوں کے حق کو ثابت کرنے کے لئے ان کی مدد کرے اس صلاحیت کو ان کے لئے تحریر لکھنے میں استعمال کرے۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی آیت کے دوران ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شاہد اور کاتب کو (اس کی دیانت داری کی وجہ سے) کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے: "وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ" اس آیت کو جو ایک خاص صورت (قرض کی اسناد کو لکھنے) کے بارے میں نازل ہوئی اگر ہم وسعت دین اور اس خاص صورت سے قطع نظر کریں تو دوسرے موارد اور صورتوں، کو اس خصوصیت کے ساتھ ملحق کریں جن سے اس قلم کے عطیے کے ذریعے، افراد بشر کی مدد کا استفادہ کیا جا سکتا ہے، اور اسی طرح لکھنے والوں سے عدم تعرض اور دوسرے لفظوں میں آزادی قلم کو اس وسیع مفہوم میں داخل کریں تو ہم ایک ایسے نقطے پر پہنچتے ہیں جس پر بشریت صدیوں بعد پہنچی ہے اگر چہ ابھی تک عملی طور پر کافی مشکلات ہیں۔

ہمارے موضوع کی پانچویں آیت میں قرآن مجید آیات الٰہی کے مخالفین کی سرزنش کرتا ہے کہ آخر وہ کون سی قابل قبول دلیل کی بنیاد پر حق کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں لہٰذا ارشاد فرماتا ہے: ہم نے اس سے پہلے کوئی کتاب انھیں نہیں دی جسے وہ پڑھیں (اور اس پر اعتماد کر کے آپؐ کو جھٹلائیں) اور آپؐ سے پہلے ہم نے کوئی رسول بھی ان کی طرف نہیں بھیجا:

"وَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ"

یہاں اگر چہ کتب سے مراد کتب آسمانی ہیں، لیکن کتاب اور درس وتدریس اور حصول علم کا موضوع انبیاء کے مبعوث ہونے کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ لہٰذا یہ دوسری معتبر دلیلوں میں سے ایک معروف دلیل کے طور پر کتاب کی اہمیت اور اس کے کردار کو روشن کرتی ہے اسی قسم کا مفہوم سورۂ قلم آیت ۳۷ میں منکرین اسلام کی سرزنش اور ان کے مواخذ کے بارے میں بھی موجود ہے، ارشاد فرماتا ہے: "أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ" کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جسے تم پڑھ کر حفظ کرتے ہو اور اس پر اعتقاد کی مخالفت کرتے ہو؟!

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کتاب بہت سی صورتوں میں ایک معتبر دلیل وسند کے لحاظ سے قابل استفادہ ہے۔ اصولی طور پر قرآن کا انبیاء کی کتب آسمانی کے بارے میں مسئلہ کتاب وکتابت پر اس قدر اعتماد کرنا، خواہ دنیا کے معاملات میں ہو یا قیامت کی عدالت اور نامہ اعمال کے بارے میں، اسلام وقرآن کے کی نظر میں اس موضوع کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔

احادیث میں کتاب وقلم کی اہمیت

کتاب وکتابت کے بارے میں بکثرت احادیث رسول اکرمؐ وائمہ معصومینؑ کی طرف سے ہم تک پہنچتی ہیں اور ان کے چند نمونے اور مثالیں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔رسول اکرمؐ نے ایک حدیث میں فرمایا: "قَیِّدُوا الْعِلْمَ" علم کو زنجیریں پہنادو (تاکہ تم سے فرار نہ کرسکے)۔ کسی نے عرض کیا: "وَمَا تَقْيِيدُهُ؟" کیسے اسے زنجیروں میں جکڑیں؟! آپؐ نے فرمایا: "كِتَابَتُهُ" لکھ کر۔[۱]

۲۔آپؐ نے ایک اور حدیث میں فرمایا:

"اُكْتُبُوا الْعِلْمَ قَبْلَ ذَهَابِ الْعُلَمَاءِ وَاِنَّمَا ذَهَابُ الْعِلْمِ بِمَوْتِ الْعُلَمَاءِ"

علم ودانش کو لکھ لو اس سے قبل کہ علماء تمہارے درمیان سے اٹھ جائیں، کیونکہ اگر لکھو گے نہیں تو علماء کی موت کے ساتھ علم ودانش بھی تم سے رخصت ہوجائیں گے۔[۲]

۳۔امام جعفر صادقؑ نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص سے فرمایا:

"اُكْتُبْ وَبُثَّ عِلْمَكَ فِي اِخْوَانِكَ فَاِنْ مِتَّ فَوَرِّثْ كُتُبَكَ بَنِيكَ، فَاِنَّهُ عَلَى النَّاسِ زَمَانُ هَرَجٍ مَا يَاْنِسُونَ فِيهِ اِلَّا بِكُتُبِهِمْ"

"لکھو اور اپنے علم کو اپنے بھائیوں میں پھیلاؤ اور جب دنیا سے جانے لگو تو اپنی کتابیں اپنے فرزندوں کے لئے بطور وراثت چھوڑ جاؤ کیونکہ فتنوں سے پر ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں لوگ فقط اپنی کتابوں سے مانوس ہوں گے۔"[۳]

۴۔آپؑ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"مَنَّ اللّٰهُ عَلَى النَّاسِ بَرِّهِمْ وَفَاجِرِهِمْ بِالْكِتَابِ وَالْحِسَابِ وَلَوْلَا ذٰلِكَ لَتَغَالَطُوا"

---

[۱] بحار الانوار، ج۲، ص۱۵۱۔

[۲] کنز العمال، حدیث ۲۸۷۳۳۔

[۳] بحار، ج۲، ص۱۵۰۔

خدا تعالیٰ نے نیکوں اور بدوں پر لکھنے اور حساب کے ذریعے احسان کیا ہے اگر کتاب و کتابت نہ ہوتی تو لوگ غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے۔[1]

۵۔امام علیؑ ایک دلچسپ تشبیہ کے ساتھ ایک مختصر کلام میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلْکُتُبُ بَساتینُ الْعُلَماءِ"

یعنی :''کتابیں علماء کے باغات ہیں۔''[2]

باغ مختلف مناظر،لطیف ہوا،انواع واقسام کے پھلوں،مختلف پتوں، پھولوں اورادویات کےطور پر استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں پر مشتمل ہوتا ہے،بعینہ کتابیں بھی ان سارے فوائدوآثار کی حامل ہوتی ہیں۔

۶۔ایک اور حدیث میں رسول اکرمؐ بڑے دلچسپ الفاظ میں فرماتے ہیں جن میں آپؐ کتاب و کتابت کی اہمیت کو حیرت انگیز انداز میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ثَلاث تَخْرُقُ الحُجُبَ، وَتَنْتَهِی اِلی ما بَیْنَ یَدَیِ اللهِ: صَرِیرُ اَقْلامِ الْعُلَماءِ، وَوَطْئُ اَقْدامِ الْمُجاهِدِینَ، وَ صَوْتُ مَغازِلِ الْمُحْصَناتِ:

''تین صدائیں ایسی ہیں جو پردوں کو پھاڑ کر خدا کی بارگاہ میں جا پہنچتی ہیں؛قلم کی حرکت کرنے کی آواز (کاغذ یا تختے پر لکھتے وقت) اور مجاہدین کے چلنے کی آواز (میدان جہاد میں) اور پاکدامن خواتین کے چرخہ چلانے (کاتنے) کی آواز۔''[3]

اگرچہ یہ صدائیں بظاہر بہت آہستہ ہوتی ہیں لیکن باطن میں پرشوروغوغا،اوران میں سے ہر ایک انسانی معاشروں کے ایک بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کررہی ہے:یعنی''علم و کتابت''،''جہاد''اور''کام اورکوشش''۔

۷۔امام صادقؑ توحید مفضل میں نوع بشر پر خدا کی نعمتوں کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"وَ کَذٰلِکَ الْکِتابَةُ الَّتی بِها تُقَیَّدُ اَخْبارُ الْماضِیْنَ لِلْباقینَ وَ اَخْبارُ الْباقینَ لِلْآتینَ وَبِها تُخَلَّدُ الْکُتُبُ فِی الْعُلُومِ وَالآدابِ وَغَیْرِها وَبِها یَحْفِظُ الاِنْسانُ ذِکْرَ ما یَجْری بَیْنَهُ وَ بَیْنَ غَیْرِهِ مِنَ الْمُعامِلاتِ وَالْحِسابِ، وَلَوْلاهُ لانْقَطَعَ اَخْبارُ بَعْضِ الاَزْمِنَةِ عَنْ بَعْضٍ، وَاخْبارُ الْغائبینَ عَنْ اَوْطانِهِم، وَ دَرَسَت الْعُلُومُ وَ ضاعَتِ الآدابُ،

---

[1] فروغ کافی،ج۵،ص۱۵۵۔

[2] غررالحکم۔

[3] الشہاب فی الحکم الآداب،ص ۲۲۔

وَعَظُمَ ما یَدْخُلُ عَلَی النّاسِ مِنَ الْخَلَلِ فی اُمُورِهِمْ وَ مُعامِلاتِهِمْ، وَ مایَحْتاجُونَ اِلَی النَّظَرَ فیهِ مِنْ اَمْرِ دینِهِمْ وَ مارُوِیَ لَهُمْ مِمّا لا یَسَعُهُمْ جَهْلُهُ"

اسی طرح ایک اور نعمت الٰہی کتابت ہے کہ جس کے ذریعے گزشتہ لوگوں کے حالات و واقعات اور موجودہ لوگوں کے احوال آئندہ آنے والوں کے لئے محفوظ کئے جاتے ہیں اور اس طرح مختلف علوم و آداب پر مشتمل ان کتابوں کے وسیلے سے وہ علوم ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں اور پھر اسی کتابت کے ذریعے وہ معاہدے، معاملات اور حساب کتاب جو انسانوں کے مابین طے پاتے ہیں، محفوظ ہوجاتے ہیں اور اگر کتابت نہ ہوتی تو ایک زمانے کا دوسرے زمانے کے بارے میں رابطہ منقطع ہو جاتا، وطن سے دور افراد کا رابطہ بھی اپنے اہل وطن سے کٹ جاتا، علوم وفنون، آداب ورسوم اور سنن وقوانین ضائع ہو جاتے، لوگوں کے امور و معاملات اور دین کے ضروری امور اور ان کے لئے بیان کی گئی روایات جن سے ان کی آ گاہی لازم تھی سب ایک شدید خلل کا شکار ہوجاتے۔"[1]

۸۔اس بحث کو ایک اور حدیث پر ختم کیا جاتا ہے جو علمی آثار (کتابوں) کو باقی رکھنے کو غیر معمولی اہمیت دیتی ہے اور اہل علم ودانش کو بے مثل و بے نظیر ترغیبات کے ذریعے اس کام (کتابت) کی طرف دعوت دیتی ہے۔اس حدیث میں رسول اکرمؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"اَلْمُؤمِنُ اِذا ماتَ وَ تَرَکَ وَرَقَةً واحِدَةً عَلَیْها عِلْم، تَکُونَ تِلْکَ الْوَرَقَةُ یَوْمَ الْقِیامَةِ سِتْراً فیما بَیْنَهُ وَ بَیْنَ النّارِ وَاَعْطاهُ اللهُ تَبارَکَ وَتَعالی بِکُلِّ حَرْفٍ مَکْتُوبٍ عَلَیْها مَدینَةً اَوْسَعُ مِنَ الدُّنْیا سَبْعَ مَرّاتٍ"

"مومن دنیا سے رخصت ہوتے وقت اگر ایک ورق جس پر علمی باتیں تحریر ہوں، یادگار کے طور پر چھوڑ جائے تو وہ ورق قیامت کے دن اس کے اور دوزخ کے درمیان حائل ہو جائے گا اور خدا تعالیٰ اسے اس ورق پر لکھے ہوئے ہر حرف کے بدلے میں ایک شہر عطا کرے گا جو اس دنیا سے سات گنا بڑا ہوگا!"[2]

اسلامی حکومتوں کو چند اہم تاکیدات

مذکورہ بالا آیات وروایات سے مجموعی طور پر یہ نکتہ واضح ہوجاتا ہے کہ اگر مسلمان ظہور اسلام کی ابتدائی صدیوں میں حیرت انگیز

---

[1] بحار، ج ۵۸، ص ۲۵۷۔

[2] بحار الانوار، ج ۱، ص ۱۹۸۔

تیز رفتاری کے ساتھ علوم وفنون کی طرف توجہ کرتے اور اس علمی، نشاۃ کہ جس کی حدود یورپ تک پہنچ چکی تھیں اور جو اسلامی ثقافت کی بنیاد پر استوار تھی، تو واضح ہے کہ اسلامی حکومتیں اس مسئلے کو بے حد اہمیت دیتیں جو معاشرے کی حیات اور دین و دنیا کے پھلنے پھولنے کا باعث ہیں۔ اسی طرح جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ درج ذیل اُصولوں کو بروکار لائے اور ان پر عملدرآمد کرے۔

۱۔ لکھنا پڑھنا میں اس قدر عام ہو جائے کہ کوئی ایک بھی ان پڑھ شخص باقی نہ رہے اور سب کے سب پڑھنے اور لکھنے کی نعمت سے بہرہ مند ہوں اور اس سلسلے میں ہر قسم کی کوتاہی اور سہل انگاری کی حکومت اسلامی ذمہ دار ہے۔

۲۔ عوام الناس اور اہل دانش کے لئے عمومی اور خصوصی کتابخانوں اور لائبریریوں جو مختلف علوم وفنون کی کتابوں پر مشتمل ہوں، کا قیام بھی حکومت کی ذمہ داری ہے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی سرمایہ کاری نہ صرف شریعت کے مدنظر ہے بلکہ مسلمانوں کی طاقت وقدرت کا وسیلہ اور انفرادی ومعاشرتی خرابیوں کے خلاف جنگ کا بھی سبب ہے اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کی ترقی بھی اسی کی مرہون منت ہے۔

۳۔ حکومت اسلامی میں ذرائع ابلاغ کو فقط اخباری، سیاسی اور دیگر مشاغل اور سرگرمیوں کے لئے ہی مختص نہیں ہونا چاہیے بلکہ (ذرائع ابلاغ) کا ایک بڑا حصہ ان علوم کی نشر واشاعت کے لئے بھی مخصوص ہونا چاہیے جنھیں ایسے انداز میں نشر کیا جائے کہ وہ تمام لوگوں کی طبیعت اور مزاج کے موافق ہوں اور جدید سائنسی دریافتیں ایک وسیع انداز میں اسلامی معاشرے میں نشر کی جانی چاہئیں تاکہ اس طرح مسلمانوں کی پسماندگی کی روک تھام کی جا سکے۔

۴۔ حکومت اسلامی کو چاہیے کہ وہ اہل قلم، دانشوروں، علماء اور تمام محققین کی حوصلہ افزائی کے لئے ہر قسم کے وسائل سے استفادہ کرے اور اس کے اسباب فراہم کرے، نئی اور بدیع علمی کتابوں کے مصنفین کے لئے خصوصی انعامات رکھے جائیں اور علماء دانشوروں اور اہل تحقیق افراد کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا جائے کہ تمام لوگ علم ودانش کے شائق اور گرویدہ ہو جائیں۔

۵۔ مدارس اور یونیورسٹیوں کی وسعت اور ان کے نصابی لائحہ عمل پر غور وفکر کرتے ہوئے چھان بین کی جائے اور اسلامی وغیر اسلامی محققین کی نئی اور جدید تحقیقات سے استفادہ اسلامی حکومت کے لائحہ عمل میں سرفہرست ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں اسلام کا پسندیدہ کام انجام پائے، جس کو آیات وروایات میں پیش کیا گیا ہے۔ جدید مصنوعات اور ٹیکنالوجی سے آگاہی بھی اس امر سے جدا نہیں، کیونکہ فقہ اسلامی میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ تمام امور جو اسلامی معاشرۂ کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں انھیں حاصل کرنا ہر شخص پر واجب ہے اور کسی مسلمان کے لئے ان امور سے غفلت کرنا جائز نہیں۔

لائبریریوں کا قیام

مسئلہ تعلیم وتربیت سے متعلق حکومت اسلامی کے اہم فرائض میں سے ایک فریضہ پبلک لائبریریاں قائم کرنا ہے، کیونکہ اکثر لوگ زیادہ کتابیں فراہم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے جبکہ وہ علم ودانش کے طالب اور خواہاں ہوتے ہیں، بالفرض اگر استطاعت رکھتے

بھی ہوں تو ضروری نہیں کہ ایک بڑا سرمایہ ہر گھر میں (کتابوں کے انبار کی صورت میں) بیکار پڑا رہے کیا ہی خوب ہے کہ (یہ علمی سرمایہ) کتابخانوں کی شکل میں محفوظ کیا جائے اس طرح اخراجات میں بھی کافی کمی آئے گی اور عوام بھی، خواہ امیر ہوں یا غریب، چھوٹے ہوں یا بڑے، انواع واقسام کی کتب مثلاً دینی، علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی وغیرہ تک دسترسی حاصل کر پائیں گے۔ قدیم زمانے سے لوگ اس مقصد کی خاطر کتابیں جمع کرتے تھے اور لائبیریاں بناتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہزاروں سال قبل دنیا کے مختلف مقامات پر کتب خانے قائم کئے جاتے رہے ہیں اگرچہ بعض کی صورت اور حالت ابتدائی اور نہایت سادہ ہوتی تھی۔

اسلامی معاشروں میں اسلام کی علم ودانش پر خصوصی تاکید کی وجہ سے دوسری صدی ہجری میں عظیم اور شان وشوکت حامل لائبریریوں کی بنیاد رکھی گئی، جن کے بارے میں غیر اسلامی مورخین بھی اپنی حیرت زدگی کو پنہاں نہیں رکھ سکتے۔ جرجی زیدان مشہور عیسائی مؤرخ نے بغداد، اندلس اور مصر وغیرہ کے کتب خانوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جو اس بات کا شاہد ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں کا علم کس قدر پیش رفتہ تھا۔ ان اہم کتابخانوں میں سے جن بعض کا اس نے تذکرہ کیا ہے ایک کتابخانہ ''بیت الحکمۃ'' ہے جو بغداد میں تھا قوی امکان ہے کہ اسے ہارون الرشید نے بنوایا تھا اور علم طب، علوم اسلامی اور دوسرے علوم میں مدون کتابیں اس جگہ جمع کی گئی تھیں۔[۱]

بغداد کی بہت سی شخصیات نے بیت الحکمۃ کی پیروی میں کئی دوسرے کتابخانے بھی قائم کئے اور ان میں ہزاروں کتابیں جمع کیں۔ مامون الرشید اسلامی ممالک میں کتابخانہ کی بنیاد رکھنے والوں میں پیش قدم تھا اور اس امر میں اس کی اقتداء کرنے والے اندلس کے بعض حکمران تھے، جن میں سے ایک ''المستنصر باللہ'' بھی تھا جس نے چوتھی صدی ہجری میں اس معاملے کو بہت زیادہ اہمیت دی، اس نے شہر قرطبہ میں ایک کتب خانہ بنوایا جس میں دنیا بھر سے کتابیں اکٹھی کیں، اس نے تاجر لوگوں کو ایک خطیر رقم دے کر اس بات پر مامور کر رکھا تھا کہ وہ دنیا میں گردش کریں اور علمی کتب جمع کریں، بعض حضرات نے اس کتاب خانے میں موجود کتابوں کی تعداد چار لاکھ بتائی ہے۔[۲]

یہ تعداد بہت عظیم اور قابل توجہ وستائش ہے۔ چونکہ اس زمانے میں کتابیں مخطوطات کی صورت میں ہوتی تھیں (یعنی ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں) اور ایک کتاب لکھنے کے لئے کئی ہفتے یا کئی ماہ وسال لگ جاتے تھے، اندلس کے بہت سے سرداروں نے اس کی پیروی میں اس ملک کے دوسرے شہروں میں بھی کتابخانے قائم کئے یہاں تک، کہا جاتا ہے کہ صرف ''غرناطہ'' میں سات عمومی کتب خانے تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ لوگ کتابوں کے بہت زیادہ شائق تھے، یہاں تک کہ کتابیں جمع کرنا اور کتب خانے قائم کرنا عظمت اور شخصیت کی علامت سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ وہ سردار جو پڑھنے لکھنے سے نابلد تھے ان کی بھی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے گھر میں قابل قدر وقیمت کتب خانہ قائم کریں۔

''فاطمیون مصر'' کے عصر میں بھی بڑے بڑے کتب خانوں کی بنیاد رکھی گئیں جن میں سے بعض کو ''خزانۃ الکتب'' کا نام دیتے تھے اور مختلف قسم کی کتابیں جمع کرنے کے لئے وافر مقدار میں مال خرچ کیا جاتا تھا اور بسا اوقات ایک ہی کتاب کے کئی نسخے مختلف خطوں

---

[۱] تاریخ تمدن، جرجی زیدان، ج۳، ص۲۲۸۔

[۲] تاریخ تمدن، جرجی زیدان، ج۳، ص۲۰۳۔

اور مختلف قسم کی آرائش وزیبائش کے ساتھ تیار اور جمع کیے جاتے تھے، یہاں تک کہ لکھا گیا ہے کہ ایک کتب خانے میں جسے ''یعقوب بن کلس'' نے بنوایا تھا قرآن مجید کے ۲۴۰۰ نسخے اور تاریخ طبری کے ۱۲۰۰ نسخے موجود تھے اور اس کتب خانے کی کتابوں کا مجموعہ سولہ لاکھ تھا کہ جن میں صرف ۶۵۰۰ کتابیں، ستارہ شناسی ہندسہ اور فلسفہ پر مشتمل تھیں۔[1]

ویل ڈورانٹ اپنی کتاب تاریخ تمدن میں لکھتا ہے: خلفاء فاطمی کا کتب خانہ نقوش سے مزین سینکڑوں کتابوں پر مشتمل تھا جن میں ۲۴۰۰ نسخے قرآن مجید کے تھے۔ قاہرہ میں خلیفہ کا کتب خانہ ''الحاکم بامراللہ'' کے دور میں ایک لاکھ اور ''المستنصر'' کے دور میں دو لاکھ کتابوں پر مشتمل تھا۔[2]

اگر ہم کتابوں کی اس تعداد کا موازنہ آج کے کتب خانوں کی کتابوں کی تعداد سے کریں جو آج کل بہت سے شہروں میں ہیں تو ہمیں ایک واضح فرق نظر آئے گا، اس کے باوجود کہ آج کل چھاپ خانوں اور صنعت کی پیشرفت غیر معمولی ہے اور کتاب چھاپنے کا مسئلہ نہایت آسان ہے، جبکہ ماضی میں فقط ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں ہوتی تھیں۔ اس لحاظ سے مذکورہ اعداد وارقام غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، ہم اس گفتگو کو مشہور مؤرخ ویل ڈورانٹ کے ایک جملے کے ساتھ ختم کرتے ہیں، وہ کہتا ہے: ''اکثر مساجد میں کتب خانہ ہوا کرتا تھا، بیشتر شہروں میں بھی پبلک لائبریریاں تھیں جن میں بکثرت کتابیں موجود ہوتی تھیں اور ان کے دروازے طالبان علم کے لئے کھلے رہتے تھے......، فقط ''ری'' کی پبلک لائبریری کی کتابوں کی فہرست دس ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی اور بصرہ کے کتب خانے میں جو لوگ مطالعہ کرتے تھے، انھیں ایک قسم کا وظیفہ اور امداد بھی دی جاتی تھی!

''یاقوت حموی'' مشہور جغرافیہ دانہ تین سال تک اپنی کتاب ''معجم البلدان'' کے لئے معلومات جمع کرنے کے لئے مرو اور خوارزم کے کتب خانوں میں مشغول رہا، جب منگولوں نے بغداد کو تباہ کیا، چھتیس پبلک لائبریریاں وہاں موجود تھیں، اور یہ تعداد ان بے شمار لائبریریوں کے علاوہ ہے جو خصوصی تھیں چونکہ اُس دور میں مالداروں کے ہاں کافی تعداد میں کتابیں جمع کرنے کا رواج تھا۔ ''امیر بخاری'' نے ایک طبیب کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی، اس نے دعوت قبول نہ کی اور کہا کہ مجھے اپنی کتابیں لادنے کے لئے چارسو اونٹوں کی ضرورت ہے، جب ''واقدی'' دنیا سے رخصت ہوا تو اس نے کتابوں سے بھرے ہوئے چھ سو صندوق اپنے بعد چھوڑے، ہر صندوق کو اٹھانے کے لئے دو مرد لازم تھے!

صاحب بن عباد جیسے بعض بزرگان کے پاس یورپ کے تمام کتب خانوں جتنی کتابیں تھیں، ''مینگ ہوانگ'' کے دور میں چین کے علاوہ دنیا کے کسی دوسرے ملک میں آٹھویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی (دوم تا پنجم ہجری) تک اسلامی ممالک میں جو ذوق وشوق کتابوں کے بارے میں نظر آتا وہ کہیں اور دکھائی نہیں دیتا تھا اور ان چار صدیوں میں مسلمانوں کی تمدنی

---

[1] تاریخ تمدن، جرجی زیدان، ج۳، ص۲۳۱۔

[2] تاریخ تمدن ویل ڈورانٹ، ج۴، ص۳۶۷۔

اور ثقافتی زندگی اوج کمال پر پہنچ گئی۔[1]

کئی صدیوں تک خاص طور پر قرون وسطیٰ میں جب اہل یورپ تاریک ترین دور سے رہے تھے، اسلامی ممالک علم، تمدن اور ثقافت کا گہوارہ تھے۔ ہم اپنے اصل مطلب سے دور نہ ہو جائیں، مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ تعلیمات اسلام کس حد تک تعلیم وتربیت، کتب خانوں کے قیام اور علم ودانش کی پیش رفت میں موثر رہی ہیں اور یہیں سے اس اہم اور حیات بخش مسئلے کے بارے میں اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں بھی واضح ہوجاتی ہیں۔

☆☆☆☆

[1] تاریخ تمدن ویل ڈورانٹ، ج ۴، ص ۳۰۴۔

دفاع اور مسلح افواج

اشارہ

اگر دنیا جاہ طلب ظالموں، طاقت کی زبان بولنے والے تجاوزگر حکمرانوں سے پاک ہوتی تو ملکی سرحدوں کی حفاظت کے لئے کسی فوجی اور عسکری طاقت کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، اور دنیا کے تمام لوگ اپنے ملکوں میں امن وامان کے ساتھ زندگی گزارتے اور ایک دوسرے کے ساتھ صحیح وسالم ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی روابط قائم کرتے۔ لیکن بعض افراد اور قوموں میں ظلم وتجاوزگری پائی جاتی ہے جس کے باعث اکثر ایک فرد کسی دوسرے فرد پر یا کوئی قوم کسی دوسری قوم پر چڑھائی کردیتی ہے۔ اس قسم کے حالات میں سب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور بنائیں تاکہ پُر امن فضا میں سکون کا سانس لے سکیں، کیونکہ افسوس کے ساتھ آج کل کمزوروں کو پاؤں تلے روندا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے مسلح افواج کا وجود ضروری ہوجاتا ہے۔

درست ہے کہ ان افواج کی موجودگی بھی اس قابل نہیں ہوسکتی کہ وہ تجاوز وتعدی کی راہ میں رکاوٹ بنے لیکن یہ کسی حد تک ماضی میں بھی رکاوٹ رہی ہیں اور اب بھی ہیں چونکہ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ حملہ آور قوتیں اندھا دھند اور خطرناک انداز میں حملہ کردیتی ہیں اور یہ حملے، جوئے کی بازی کی مانند ہوتے ہیں جن میں ہار جیت کا پتہ نہیں چلتا یا انھیں اپنی کامیابی کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے اور یہی چیزیں بسا اوقات تجاوز کی راہ میں بھی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔ اس سے قطع نظر وہ ملت اور قوم جو کسی تہذیب وتمدن کی مالک اور آزادی کی خواہاں ہوتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کی ثقافت دنیا کے دوسرے لوگوں پر بھی اثر انداز ہو، اس کے لئے بھی اپنے مشن کی تبلیغ کے لئے طاقت پر بھروسہ کئے بغیر ایک آزاد ماحول میں رہنا ممکن نہیں، اور یہ مسلح افواج کی تشکیل کا دوسرا فلسفہ اور مقصد ہے۔

اگر ہم اس مسئلے کو ایک وسیع تناظر میں دیکھیں تو ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ زندگی ''جہاد'' کے بغیر ممکن نہیں چونکہ ہر زندہ اور ذی روح موجود کو اپنی زندگی جاری اور باقی رکھنے کے لئے کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو زندگی کے ہر لمحے اس کے سامنے نظر آتے ہیں اور اگر یہ زندہ مخلوق کسی دفاعی اسلحے سے لیس نہ ہو تو جلد ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ انسان کا بدن جو بذات خود ایک چھوٹا جہان (عالم صغیر) ہے اور سارا جہان کبیر (کائنات) بصورت خلاصہ اس میں موجود ہے، اس مسئلے کی ایک واضح مثال ہے کیونکہ (انسانی زندگی) تمام مدت، دن رات چاروں طرف (سانس کے ذریعے، کھانے پینے اور بدن پر کسی زخم کے لگنے) سے مختلف قسم کے جرثوموں (virus) کا نشانہ بنتی ہے اور اگر بدن کے اندر ایک مضبوط دفاعی نظام موجود نہ ہو تو یہ مختصر سی مدت میں انواع واقسام کی بیماریوں کا شکار ہوکر ختم ہوجائے۔

جی ہاں! خون کے سفید خلیے (White cells) جسم میں داخل ہونے والے ہر بیرونی دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں اور طبیعاتی اور کیمیائی جنگ کے ذریعے اس کا مقابلہ کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر وقتی طور پر یہ بیرونی دشمن (وائرس وغیرہ کامیاب بھی ہوجائیں اور انسان بیمار پڑ جائے تو پھر بھی یہ (سفید خلیے) دشمن کے مغلوب ہونے اور انسان کے صحت مند ہونے تک ان کے خلاف جنگ جاری رکھتے ہیں۔

ان مسلح دفاعی سپاہیوں کی تعداد کئی ملین بتائی گئی ہے اور ان کا مطالعہ اور طرز عمل انسان کو تخلیق کے اسرار سے آگاہ کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ بے اختیار اپنے خالق کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے۔ انسانی معاشرہ اور دنیا کے مختلف ممالک بھی اس عمومی قانون سے مستثنیٰ نہیں اور اپنی زندگی کی بقاء کے لئے ایک مسلح عسکری طاقت کے محتاج ہیں۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں جہاد، اس کے فلسفے (مقصد) اور احکام نیز اس کے آثار و نتائج کے بارے میں بکثرت آیات ذکر ہوئی ہیں جن میں سے گیارہ آیات کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ؀ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ؀ (سورۂ حج/۳۹ تا ۴۰)

۲۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰي لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ؀ (سورۂ انفال/۳۹)

۳۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ؀
(سورۂ انفال/۶۰)

۴۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ؀
(سورۂ صف/۴)

۵۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَي الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ؀ (سورۂ انفال/۶۵)

۶۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ؀ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؀ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ؀ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؀ (سورۂ صف/۱۰ تا ۱۳)

۷۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۗ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾ (سورۂ توبہ/۱۱۱)

۸۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

(سورۂ آل عمران/۲۰۰)

۹۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ (سورۂ توبہ/ ۷۳۔ سورۂ تحریم/۹)

۱۰۔ لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾

(سورۂ نساء/ ۹۵)

ترجمہ:

۱۔ وہ لوگ جن پر جنگ مسلط کی گئی ہے انھیں جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے، وہی لوگ جنھیں ان کے گھروں سے بغیر کسی وجہ سے نکالا گیا ہے، سوائے اس کے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر خدا بعض لوگوں (کے شر) کو بعض دوسرے لوگوں کے ذریعے دفع نہ کرے تو دیر و کلیسا و صومعات عبادت گاہیں (یہود و نصاریٰ کی) اور وہ مساجد جن میں کثرت کے ساتھ ذکر خدا ہوتا ہے، ویران ہو جائیں اور خدا تعالیٰ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے (جو اپنے دین کا دفاع کریں) خداوند قوت والا اور شکست ناپذیر ہے۔

۲۔ ان کے ساتھ جنگ کرو تا کہ فتنہ گری اور (شرک و آزادی سے محرومی) کی بساط لپیٹ دی جائے اور سارا دین فقط خدا کے ساتھ مخصوص ہو اور اگر وہ لوگ (فتنہ انگیزی) اور مخالفانہ امور سے باز آجائیں تو (خدا ان کی توبہ قبول کرے گا) اور خدا جو عمل وہ انجام دیتے ہیں اس سے باخبر اور اسے دیکھنے والا ہے۔

۳۔ ہراس چیز کی جس کی استطاعت رکھتے ہواس کودشمن کے ساتھ مقابلے کے لئے تیار رکھو!اور(اسی طرح) سدھائے ہوئے گھوڑے بھی (میدان جنگ کے لئے) تا کہ اس (سب) کے ذریعے خدا کے دشمن اور اپنے دشمن کوخوفزدہ کرو۔

۴۔خدا تعالیٰ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جواس کی راہ میں قتال کرتے ہیں اورسیسہ پلائی دیوار ثابت ہوتے ہیں!

۵۔اے رسولؐ مؤمنوکو جنگ کی رغبت اورشوق دلاؤ!تمہارے بااستقامت بیس افراددشمن کے دوسوافراد پر بھاری ہوں گے،اورسوافرادکفار کے ہزارافراد کے مقابلے میں کامیاب ہوں گے کیونکہ کفارایک نافہم اور بےسمجھ گروہ ہے۔

٦۔اے ایمان والو! کیا میں تمہاری راہنمائی ایسی تجارت کی طرف نہ کروں جوتمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟!خدااوراس کے رسول پرایمان لاؤاوراپنے مال وجان کے ساتھ راہ خدامیں جہادکرو،اگرتم یہ جان لوتوتمہارے لئے ہر چیز سے بہتر ہے۔(اگرتم لوگ ایسا کروگے)تو وہ تمہارے گناہ بخش دے گااورتمہیں جنت کے باغوں میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور بہشت جاودانی کے پاک وپاکیزہ مساکن میں جگہ دے گااور یہ عظیم کامیابی ہے!اورایک اور(نعمت) جسےتم پسند کرتے ہوتمہیں عطا کرے گااور وہ خدا کی نصرت ومدداورعنقریب ملنے والی کامیابی ہےاورمومنوں کواے رسولؐ (اس عظیم کامیابی کی)بشارت دےدو۔

۷۔اے ایمان والو!(مشکلات اور ہواوہوس کے مقابلے میں)استقامت کا مظاہرہ کرواوردشمنوں کے مقابلے میں ڈٹے رہواپنی سرحدوں کی نگرانی کرواورخدا کی نافرمانی سے بچوتا کہ کامیابی سے بہرہ مند ہوسکو!

۸۔خدا تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جان ومال خرید لئے ہیں تا کہ(اس کے مقابلے میں)ان کے لئے جنت قراردے(ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ)راہ خدامیں قتال کرتے ہیں،قتل کرتے اورقتل ہوتے ہیں، یہ خدا کا برحق وعدہ ہے جسےتورات،انجیل اورقرآن میں اس نے ذکرفرمایاہےاورخدا سے بڑھ کرکون اپنے وعدے کا پاس کرنے والا ہے؟!جومعاملہ تم نے خدا سے کیا ہےاس کی تمہیں بشارت (اورمبارک)ہواور یہی ہےوہ عظیم کامیابی!

۹۔اے رسولؐ! کافروں اورمنافقوں کے ساتھ جہادکرواوران کے ساتھ سختی سے پیش آؤ،ان کا ٹھکانہ

دوزخ ہے اور کیا ہی برا انجام ہے ان کا۔

۱۰۔ وہ مومن افراد جو بیماری اور کسی پریشانی کے بغیر جہاد سے کترائیں ہرگز راہ خدا میں جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے والوں کے ہم پلہ نہیں ہیں، خدا تعالیٰ نے جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو قاعدین (جہاد کو ترک کرنے والوں) پر برتری عطا کی ہے اور ان دو گروہوں میں سے ہر ایک کے ساتھ خدا تعالیٰ نے (ان کے نیک اعمال کے مطابق) اچھے بدلے اور پاداش کا وعدہ کیا ہے اور مجاہدین کو پیچھے رہ جانے والوں پر برتری بخشی ہے۔

تشریح

جہاد کی روح دفاع ہے نہ فوجی یلغار

ان آیات میں سے پہلی آیت، مفسرین کی ایک جماعت کی رائے کے مطابق، جہاد کے بارے میں پہلی آیت ہے، اس آیت میں جہاد کے ایک اہم مقاصد سے پردہ اٹھا کر مسلمانوں کے خلاف مسلح قیام اور جہاد کی اجازت دی گئی ہے، کہ جن کے شدید دباؤ کا وہ شکار ہو چکے تھے۔ ارشاد ربانی ہے:

''جن لوگوں پر ظلم و ستم روا رکھا گیا اور ان پر جنگ مسلط کی گئی ہے، انھیں جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔''

"اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ"

اس مقام پر مسلمانوں کو جہاد کی اجازت کے ہمراہ خدا تعالیٰ نے کامیابی کے وعدے سے بھی سرافراز فرمایا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ دشمن نے ظالمانہ انداز میں جنگ کی ابتدا کی ہے اور اس کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرنا غلط ہے، کیونکہ یہ خاموشی مخالفین کی جرأت اور جسارت اور دوستوں کی کمزوری اور ناامیدی کا باعث بن سکتی ہے۔

مرحوم طبرسی تفسیر مجمع البیان میں کہتے ہیں: مشرکین عرب، مسلمانوں کو مسلسل اذیتوں کا شکار بنائے رکھتے تھے اور زخمی افراد ہمیشہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں آتے اور ان کی شکایت کرتے تھے ان کی حالت زار کو دیکھ کر آپؐ فرماتے: ''صبر کرو مجھے ابھی جنگ کی اجازت کا حکم نہیں ملا'' یہاں تک کہ آپؐ نے ہجرت فرمائی اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور یہ سب سے پہلی آیت ہے جو

مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دیتی ہے[1]۔

قابل توجہ یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت میں قرآن مجید فرماتا ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ یُدافِعُ عَنِ الَّذینَ آمَنُوا"

یعنی: "خدا تعالیٰ اہل ایمان کا دفاع کرتا ہے۔"

یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی گوشے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور خدا کی طرف سے دفاع کا انتظار کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی روش اور طریقہ یہ ہے کہ وہ مومنوں کا دفاع تب کرے گا جب وہ دشمن کے خلاف جہاد کے سلسلے میں ذمہ داری پوری کریں گے پس وہی لوگ خدا کی مدد کو اُمید رکھ سکتے ہیں جو جہاد کے بارے میں اپنی ذمہ داری کو ترک نہ کریں۔اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعد والی آیت (سورۂ حج/۴۰) میں اللہ تعالیٰ اس مقدس دفاع کی رغبت وشوق دلاتے ہوئے فرماتا ہے:

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن دشمنوں نے تمہیں خدا پر ایمان کے جرم میں تمہیں تمہارے گھروں سے نکال باہر کیا ہے، اگر ان کے خلاف قیام نہ کرو تو تمہاری دنیا بھی خطرے میں ہے اور دین و ایمان اور مساجد و معابد بھی۔

چونکہ جہاد کا حکم ہجرت کے بعد صادر ہوا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں جہاد کی بنیاد کو تشکیل دینے والا عامل صرف دشمن کے مقابلے میں اپنا دفاع ہے، کیونکہ پورے تیرہ سال مسلمانوں نے ہر قسم کی اذیتوں عہد شکنی اور مار پیٹ اور زخم کھانے کے باوجود اسلحے کو ہاتھ تک نہیں لگایا کہ شاید دشمنوں کو عقل آ جائے۔لیکن آخر کار یہ صبر و تحمل اور اجتماعی دربدری ہجرت کی صورت میں رونما ہوئی جبکہ انواع واقسام کی معاشرتی اور اقتصادی پابندیوں اور شدید حالات کا سامنا جاری تھا یہاں تک کہ ہجرت کے بعد بھی مشرکین مکہ کی یہ ظالمانہ کاروائیاں جاری رہیں، کیا ایسی صورتحال میں کسی بھی صاحب عقل کے نزدیک جائز ہے کہ اہل ایمان بیٹھے رہیں اور دشمن کی بے رحمی اور سنگدلی کا نشانہ بنتے رہیں؟!

دوسری آیت، پہلی آیت میں مذکورہ مقصد کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔جو ہر زمانے اور ہر مقام پر جہاد کو ضروری قرار دیتی ہے۔"ان کے ساتھ قتال کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ وفساد (اہل شرک کا دباؤ، اور آزادی سے محرومی کی فضا) کا خاتمہ ہو جائے اور دین و دیانت (اور عبادت خدا ہی کے لئے) مخصوص ہو کر رہ جائے:

"وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ"

---

[1] جن لوگوں نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ یہ اولین آیت جہاد ہے ان میں سے علامہ طباطبائیؒ المیزان میں برسوی، روح البیان میں، علامہ مشہدی، کنزالدقائق اور آلوسی روض المعانی میں اسی رائے کے قائل ہیں اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک "وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ ......" (سورہ بقرہ/۱۹۰) اور بعض کے نزدیک "إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ......" (توبہ/۱۱۱) جہاد کے بارے میں پہلی آیت ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید کا اسی آیت کے ذیل میں صراحت کے ساتھ فرما رہا ہے:

''اگر وہ لوگ فتنہ انگیزی سے دستبردار ہوجائیں تو آپ بھی ان سے معترض نہ ہوں، خدا تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔''

''فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ''

فتنہ گروں کے خلاف جنگ سے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین نے فتنہ کو شرک کے ساتھ تعبیر کیا ہے، لیکن بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دباؤ ڈال کر اہل ایمان کو شرک کی طرف پلٹانا ہے۔ تفسیر المیزان میں لفظ فتنہ کی اصل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے وہ سب امور مراد لئے گئے ہیں جن کے ذریعہ لوگوں کو آزمایا جاتا ہے، یہ امور قدرتی طور پر لوگوں کے لئے مشکل اور سخت ہوتے ہیں اور غالباً فتنہ، امن وامان اور صلح وآتشی کے ختم ہوجانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم نے تفسیر نمونہ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ کے ذیل میں آیات قرآنی سے استدلال کے کرتے ہوئے اس لفظ ''فتنہ'' کے پانچ معانی بیان کئے ہیں:

۱۔ آزمائش

۲۔ فریب دینا

۳۔ مصیبت اور عذاب

۴۔ شرک اور بت پرستی

۵۔ گمراہ کرنا اور گمراہی

لغت کی بعض کتابوں مثلاً لسان العرب میں بھی ان میں سے اکثر معانی کو بیان کیا گیا ہے۔ واضح ہے کہ موضوع بحث آیت میں فتنہ، آزمائش یا فریب وبلا کے معنی میں نہیں ہوسکتا لہٰذا اس کا مطلب شرک ہے یا مشرکین کا دوسرے لوگوں کو گمراہ کرنا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے ایک وسیع تر مفہوم سمجھا جائے، اس صورت میں یہ (فتنہ) شرک اور مشرکین کی ظالمانہ کاروائیوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے، ایسی صورتحال میں جب تک کفار کی جانب سے مسلمانوں کو اپنا عقیدہ تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اس وقت تک ان کے اس عمل کے باعث ان کے خلاف جنگ کرنا جائز ہے اور آزادی کے حصول اور دشمن کی ظالمانہ کاروائیوں کی روک تھام کے لئے، مسلمانوں کو جہاد کی آزادی اور اجازت ہے، لیکن جب وہ اپنی جابرانہ کاروائیوں سے دستبردار ہوجائیں تو جنگ تمام ہوجائے گی، لہٰذا فتنے کے خلاف جنگ بھی ایک قسم کا دفاعی جہاد ہے۔

تیسری آیہ شریفہ میں مسلمانوں کو دشمن کے خلاف جنگ کے لئے ہر قسم کی طاقت کو تیار رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد قرآنی ہے:

''وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ''

بعد ازاں اس زمانے میں ایک اہم جنگی ضرورت کو بطور نمونہ ومثال پیش کیا گیا ہے، لہٰذا ارشاد قرآنی ہے: ''میدان جنگ کے لئے تربیت

یافتہ گھوڑے آمادہ کرو"؛ "وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ" اور اس کے بعد والے جملے میں قرآن مجید طاقت کو تیار رکھنے کے حقیقی مقصد کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس کا اور مقصد یہ ہے کہ اس (طاقت) کے ذریعے تم لوگ دشمنان خدا اور اپنے دشمنوں کو ہراساں کرو" "تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ"، پس قوت اور طاقت کے ساتھ تیاری اور اس کا مظاہرہ کسی پر حملے کی خاطر نہیں بلکہ مقصد دشمن کو خوفزدہ کرنا ہوتا ہے اور یہی خوف وحشت جنگ سے بچنے کا باعث بنتی ہے۔

درحقیقت دفاعی بنیاد کی تقویت ہمیشہ ایک موثر دفاع اور دشمن کے حملے سے بچاؤ کا ذریعہ رہی ہے اور یہ ایک عالی شان مقدس اور عقل ومنطق کے مطابق مقصد ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ رہے کہ اس آیہ شریفہ کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے، جو ہر قسم کی معنوی، مادی، عسکری، اقتصادی اور ثقافتی قوت وطاقت کی فراہمی کے مفہوم کو اپنے اندر شامل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، خاص طور پر (یہ مفہوم) ہر زمانے کے مناسب وسائل (طاقت کی فراہمی) پر اعتماد کرتا اور اس کی تاکید کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو ہرگز آرام اور سکون کے ساتھ نہیں بیٹھ جانا چاہیے بلکہ انھیں کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے زمانے کے جدید اور پیچیدہ ترین اسلحے تک دسترسی پیدا کریں یہاں تک کہ اس امر میں دوسروں پر سبقت حاصل کریں، لیکن ان سب امور کا اصل مقصد کسی پر حملہ نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس طرح فتنوں کی آگ کو دباتے ہوئے ہر طرح کے ظالمانہ رویے اور دشمن کے امکانی حملے کی روک تھام کی جاسکے۔

چونکہ پیشرفتہ اسلحہ کی فراہمی عظیم اخراجات کے ہی باعث ممکن ہے اور لوگوں کی عمومی شرکت کے بغیر امکان پذیر نہیں، لہٰذا مذکورہ بالا آیت کے آخری جملے میں ارشاد ہے: "اور جو کچھ تم راہ خدا میں خرچ کروگے وہ تمہاری طرف ہی لوٹا دیا جائے گا اور تمہارے اوپر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔"

"وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ"

یہ نکتہ بھی قابل اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کی آیت (انفال/٦١) میں صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

"اگر وہ لوگ صلح کی جانب مائل ہوں تو آپ بھی ان کے ساتھ صلح کا اظہار کریں اور خدا پر اعتماد کریں، بے شک وہ سننے اور جاننے والا ہے۔"

"وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ"

وہ آیت جو طاقت فراہم کرنے کا حکم دیتی ہے اس کے بعد اس آیت کا ذکر بہت ہی بامعنی اور اسلام کی صلح پسندانہ روح پر تاکید کی حیثیت رکھتی ہے یعنی اگر آیہ شریفہ مسلمانوں کو بہترین اور عالی ترین اسلحہ اور عسکری قوت کی فراہمی کا حکم دیتی ہے تو اس سے مراد صلح کے ارکان کو مضبوط کرنا ہے نہ کہ کسی پر حملہ کرنا ہے۔

چوتھی آیہ شریفہ میں قرآن مجید مسئلہ جہاد کی ترغیب وتشویق دلاتے ہوئے اسے مقدس مقاصد کی شرط کے ساتھ مشروط قرار دیتا ہے اور اس کے بعد مسلمین کی صفوف میں وحدت پر زور دیتا ہے، جو دشمن کے خلاف جنگ میں کامیابی کا ایک بے حد اہم عامل ہے، لہٰذا اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے: "خدا تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوطی کے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔"

"إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنيَانٌ مَرْصُوصٌ"

جہاد کے بارے میں بیان شدہ آیات میں فِي سَبِيلِهِ (راہ خدا میں) کی تعبیر اختیار کرنا، اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ جہاد کو خودغرضی، وسعت طلبی، حصول برتری، دوسروں کے حقوق اور سرزمینوں کے غصب یا انتقامی جوئی اور خواہشات نفس کی بنیاد پر استوار نہیں ہونا چاہیے بلکہ اُسے فقط حق وعدالت اور خدا کی خوشنودی کی خاطر انجام دینا چاہئے، بہت ساری آیات میں ان الفاظ کی تکرار ایسی جنگوں کی روک تھام کے لئے ہے جن کے محرکات مادی اور شیطانی ہوتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو اسلام کی مسلح عسکری قوت کو دوسری (غیر اسلامی عسکری قوتوں سے) ممتاز کرتی ہے۔ (غور فرمائیں)

بُنيَانٌ مَرْصُوص میں "بنیان" کا مطلب ہے بنیاد، اور مرصوص کا مادہ "رصاص" یعنی سیسہ ہے۔ پس بُنيَانٌ مَرْصُوص کے الفاظ استعمال کرنا، استحکام اور اتحاد کو بیان کرنے کے لئے ہے کیونکہ گزشتہ دور میں سیسے کو پگھلا کر اسے گارے کی طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور شاید بنیان مرصوص سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ دشمن سیلاب کی طرح تباہ کن ہوتا ہے اور مسلمانوں کی صفیں اس سیلاب کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ان کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس آہنی رکاوٹ کی طرف اشارہ ہو جسے ذوالقرنین نے یاجوج، ماجوج جیسی خونخوار اور خون ریز قوم کے حملوں سے حفاظت کے لئے تعمیر کرایا تھا اور یہ ہر اس رکاوٹ کے لئے کنایہ ہے جسے کسی حملہ آور سے بچاؤ کے لئے بنایا جاتا ہے۔

دونوں صورتوں میں اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی جہاد صرف دفاعی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ سد اور رکاوٹیں تاریخ میں ہر قسم کے یاجوج وماجوج کے سیلاب کے مقابلے میں ایک مؤثر دفاع کا وسیلہ رہی ہیں چونکہ کوئی سد یا رکاوٹ کسی حملے کو علامت نہیں بلکہ دفاع کی علامت ہے۔ جس طرح ان رکاوٹوں میں اگر کوئی خلل واقع ہو جائے تو یہ بکھر جاتی ہیں اسی طرح اگر مجاہدین اسلام کی صفوں میں بھی اختلاف وانتشار پیدا ہو جائے تو اس کے سبب سے وہ دشمن کے مقابلے میں شکست کھا جائیں گے، جبکہ اللہ تعالیٰ ایسی صفوف کو پسند کرتا ہے جن کے درمیان مکمل اتحاد واتفاق اور پوری ہم آہنگی ہو۔

پانچویں آیہ کریمہ میں رسول اکرمؐ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آپؐ دشمن کے خلاف مسلمانوں کو جنگ کا شوق اور رغبت دلائیں اور یہ آیت ان آیات کے بعد ہے جن میں دشمن کو ڈرانے اور جنگ کی روک تھام کے لئے اپنی قوت اور طاقت کو آمادہ رکھنے کی ترغیب لائی گی ہے، اسی طرح یہ آیت اس آیت کے بعد ہے، جو صلح کی ترغیب وتشویق دلاتی ہے۔ درحقیقت جنگ دشمنوں کے حملوں کو روکنے کا آخری حربے کے طور پر جائز قرار دی گئی ہے، پہلے عسکری تیاری، پھر قوی اور طاقتور انداز میں صلح کی دعوت اور آخر کار جنگ کا حکم صادر ہوتا ہے لہٰذا ارشاد ہوتا ہے:

"اے رسولؐ اہل ایمان کو دشمن کے خلاف جنگ کی ترغیب دو"

"يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ"

اس کے بعد کامیابی کے سب سے اہم عامل یعنی استقامت اور پامردی کی طرف اشارہ کرکے فرماتا ہے: "اگر تم میں سے بیس با استقامت

افراد ہوں تو وہ دوسو افراد پر بھاری ہوں گے اور اگر سو افراد ہوں تو وہ کفار کے ہزار افراد پر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ کفار ایسے لوگ ہیں جو فہم وفراست سے خالی ہیں۔''

"إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ"

ایک طرف سے وہ (کفار) اس قدر جاہل اور نادان ہیں کہ عقل و منطق کی راہ اُنہیں سجائی ہی نہیں دیتی وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں جبکہ دوسری طرف سے ان کے ضعف اور ناتوانی کا سبب میدان جنگ میں ہے یعنی وہ جم کر مقابلے کی سکت نہیں رکھتے اور وہ اس لئے کہ ان کی جنگوں میں ان کے سامنے کوئی خاص ہدف اور مقصد نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان میں سے ایک فرد با استقامت وآ گاہ کفار کے دس افراد اور بیس افرادان کے دوسو افراد پر غالب آ سکتے ہیں! راغب اصفہانی اپنی کتاب المفردات میں لکھتے ہیں:

''تحریض کا لغوی مفہوم کسی چیز کو مزین کرنا اور اس کی راہ کی رکاوٹیں دور کر کے، اس کی ترغیب دینا ہے، اور حقیقت میں خدا پر اور روز آخرت پر ایمان، اسی طرح مجاہدین اور راہ خدا میں شہید ہونے والوں کو عظیم اجر وثواب عطا کرنا وغیرہ کے ذریعے اسلامی جانبازوں کے راہ کی تمام رکاوٹیں برطرف کر کے اس بہت سخت عمل کو ان کے لئے آسان بنا دیا جاتا ہے۔ یہ آیت ظاہری اور مادی قوتوں کے باہمی موازنے کے افسانے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے پاس بعض ایسی روحانی اور معنوی قوتیں بھی ہیں جن پر اعتماد کر کے وہ دشمن کے بظاہر بہت بڑے لشکر کو بھی شکست دے سکتے ہیں۔

چھٹی آیہ شریفہ ایک دوسرے طریقے سے جہاد کی ترغیب دلاتے ہوئے جہاد کو ایک نفع بخش تجارت کے ساتھ تشبیہ دیتی ہے جو عذاب الیم سے نجات اور دنیا وآخرت کی کامیابی کا باعث ہے، ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! کیا میں تمہاری ایسی تجارت کی طرف راہنمائی نہ کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے آزادی بخشے، خدا اور رسول پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو، یہ تمہارے لئے ہر چیز سے بہتر ہے۔''

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ • تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ"

اس کے بعد، آیات میں قرآن مجید مجاہدین کو مغفرت، جنت کے باغات میں داخلے، جنات عدن کی پاک وپاکیزہ رہائش گاہوں، نجات اور دنیا میں عنقریب واقع ہونے والی کامیابی کی نوید سناتا ہے۔''

"يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي

جَنّٰتِ عَدۡنٍ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۙ وَاُخۡرٰى تُحِبُّوۡنَهَا نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتۡحٌ قَرِيۡبٌ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ"

ان آیات میں نفع بخش تجارت کا سرمایہ جو دنیا و آخرت کی آزادی اور نجات کا سبب ہے، ایمان اور جہاد کا باہمی مرکب ہے؛ یعنی "عقیدہ" اور "جہاد" اس کے دو بنیادی ارکان ہیں وہ جہاد جو مال کے ذریعے بھی انجام پاتا ہے اور جان کے ساتھ بھی کیونکہ سامان جنگ کی فراہمی، جو مجاہدین کی کامیابی کا ایک اہم ذریعہ ہے، مال و منال خرچ کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ جہاد کے نتیجے کو صرف مغفرت و بخشش اور جاودانی اور ہمیشہ رہنے والی نعمتوں ہی میں منحصر نہیں کرتا بلکہ اس دنیا میں قریب الوقوع کامیابی کو بھی اس کا ایک بلند پایہ نتیجہ قرار دیتا ہے۔ (غور فرمائیں)

تجارت کے ساتھ تعبیر کرنے میں یہ نکتہ بھی مضمر ہے کہ انسان بہرحال کچھ نہ کچھ سرمایہ رکھتا ہے اور یہ دنیا ایک ایسی تجارت گاہ ہے جہاں اس فانی سرمائے کو جاودانی اور باقی رہنے والے سرمائے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان خدا کے ساتھ معاملہ اور لین دین کرے اس ذات پاک کے ساتھ کہ ہر خیر و برکت اور سعادت اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس کے ساتھ تجارت، کرامت، عطا اور ہر قسم کی بخشش کا باعث ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب مومنین ہیں اور اس کے باوجود انھیں ایمان لانے کی دعوت دی جارہی ہے، حقیقت میں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ ایمان کے ابتدائی اور ظاہری مراحل کو عبور کر کے اس کے عالی درجات تک رسائی حاصل کریں جن تک رسائی اعمال صالحہ اور جہاد ہی کے ذریعے ممکن ہے اس لئے کہ ایمان ایک ثمر بخش درخت ہے جس کی ابتدا چھوٹے سے پودے سے ہوتی ہے اور پھر اس کی شاخیں آسمانوں میں پھیل جاتی ہیں اور وہ انواع و اقسام کے پر برکت پھلوں سے لد جاتا ہے، یہ عمل کمال کے مختلف درجوں کو طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

ساتویں آیت میں اس پہلی آیت کے مضمون کو ایک دوسرے لباس میں پیش کیا گیا ہے، جو ایک ایسے معاملے کی منظر کشی کرتی ہیں جس میں خریدار خدا تعالیٰ اور فروخت کرنے والے مؤمنین ہیں اور سامان تجارت اہل ایمان کے جان و مال ہے اور اس کا معاوضہ دائمی جنت جاوداں اور اس کی سند اور تحریر تین عظیم آسمانی کتابیں تورات، انجیل اور قرآن ہیں، ارشاد حق تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَــنَّةَ ‌ؕ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ‌ وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا فِى التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ‌ ؕ وَمَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ

یہ نفع بخش تجارت اپنے چاروں ارکان اور مضبوط اسناد (دستاویز) اور وثیقوں کے ساتھ ایک ایسی اہم تجارت ہے جو ممکن ہے ایک شخص کے لئے ساری عمر جاری رہے، یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ فوراً اور بلا فاصلہ مؤمنین کو اس سودمند معاملے کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ معاملہ جو تم نے خدا کے ساتھ کیا ہے تمہیں مبارک ہو، اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔"

فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ الَّذِىۡ بَايَعۡتُمۡ بِهٖ‌ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۱۱﴾

جی ہاں! یہی وہ الٰہی ترغیبات تھیں جو اسلامی سپاہ کے عزم و ہمت کو عالی ترین سطح پر لانے کا سبب بنیں، اور وہ افراد کی کمی اور بے سروسامانی کے باوجود جلد ہی مشرق و مغرب میں موجود دشمنوں پر چھا گئی۔

آٹھویں آیہ کریمہ میں پھر مومنین سے خطاب کر کے انھیں دشمن کے حملوں کے مقابلے میں صبر و ہمت اور آمادگی کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

''اے اہل ایمان! صبر کا مظاہرہ کرو اور دشمن کے مقابلے میں استقامت و پامردی اختیار کرو، سرحدوں کی نگرانی بھی انجام دو اور خدا کی معصیت اور نافرمانی سے اجتناب کرو تاکہ تم کامیاب قرار پاسکو۔''

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾

اس آیہ شریفہ میں اہل ایمان کو چار اہم حکم دیئے گئے ہیں جن پر عمل کرنا ان کی سربلندی، کامیابی اور عزت کا ضامن ہے۔

پہلا حکم مختلف حوادث اور خواہشات نفس کے مقابلے میں صبر و استقامت کو اختیار کرنا ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے: اصْبِرُوا (صبر کرو) کیونکہ حقیقت میں صبر ہی تمام کامیابیوں کا اصلی سبب ہے۔ اس کے بعد مصابرہ (جو باب مفاعلہ سے ہے) یعنی دشمن کے مقابلے میں صبر و استقامت کا اظہار، دوسرے الفاظ میں اس (مصابرہ) کا مفہوم یہ ہے کہ جس قدر مشکلات زیادہ شدید ہوں اسی قدر تمہارے صبر کو بھی زیادہ ہونا چاہیے اور جتنی دشمن کی استقامت زیادہ ہو اس سے کہیں زیادہ تمہاری پامردی اور استقامت ہو تاکہ دشمن مغلوب ہوجائے۔ (وَصَابِرُوا)

تیسرے حکم کا تعلق ''مرابطہ'' کے ساتھ ہے، ارشاد ہے کہ ''وَرَابِطُوا'' اس جملے کا مادہ اور ماخذ ''رباط'' ہے جس کا مطلب کسی چیز کو کسی جگہ باندھنا ہے۔ (مثلاً کسی جگہ گھوڑے کو باندھنا) اور یہ آمادگی کی طرف اشارہ ہے اور اس کا واضح نمونہ اور روشن مثال آمادگی اور سرحدوں کی نگرانی ہے، چونکہ اہل لشکر اس مقام پر اپنی سواریوں اور جنگی وسائل و آلات کو جمع کر کے ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض مفسرین نے اس کی تفسیر گھوڑوں اور سواریوں کو سرحدوں پر جمع کرنے اور دشمن کے مقابلے میں آمادی سے کی ہے، اور انھوں نے یہاں تک کہا ہے کہ اس کے وسیع مفہوم کے دائرے میں آج کل کے آلات جنگ بھی آتے ہیں خواہ وہ بری، بحری اور ہوائی آلات ہوں یا دوسرے آلات جنگ ہوں۔ [1]

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آیت شریفہ عقیدتی اور ثقافتی سرحدوں کے بیان پر مشتمل نہیں کیونکہ ''رابطوا'' کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ دشمن سے دفاع کے لئے ہر قسم کی آمادگی اس میں داخل ہوسکتی ہے، لہٰذا بعض روایات میں علماء کو سرحدوں کے محافظ قرار دیا گیا ہے جو ابلیس کے لشکر کے سامنے سینہ سپر ہو کر ان لوگوں کو اس لشکر کے حملوں سے بچاتے ہیں جو اپنے دفاع سے قاصر ہوتے ہیں۔ امام جعفر صادق -فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر مراغی، ج۴، ص۱۷۲۔

"عُلَمٰءُ شیعَتِنا مُرابِطُونَ فِی الثَّغرِ الَّذی یَلی اِبْلِیسَ وَ عَفاریتَهُ وَ یَمْنَعُونَهُ عَنِ الْخُرُوجِ عَلٰی ضُعَفاءِ شیعَتِنا وَعَنْ اَنْ یَتَسَلَّطَ عَلَیْهِمْ اِبْلیسُ"

ہمارے شیعہ علماء وہ سرحدی محافظ ہیں جو ابلیس کے لشکر کے سامنے صف آراء اور ضعیف شیعوں پر اس لشکر کے حملے سے ان کا دفاع کرتے ہیں۔[1] یہاں تک کہ حضرت علیؑ سے مروی بعض روایات میں ''رابطوا'' سے یکے بعد دیگرے نمازوں کا انتظار مراد لیا گیا ہے۔[2]

کہ یہ بھی درحقیقت لشکر شیطان کے مقابلے میں تیار رہنے کی ایک صورت ہے۔(غور فرمائیں) چوتھا حکم تقویٰ الٰہی اختیار کرنا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صبر واستقامت اور مرابطہ سب تقویٰ، اخلاص اور پرہیزگاری کے ہمراہ ہوں اور انھیں ہر قسم کے دکھلاوے، اور ریا کاری سے پاک ہونا چاہیے۔ نویں آیت یہ حکم دیتی ہے کہ دشمنوں کے خلاف دو محاذوں پر جنگ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ، داخلی دشمنوں یعنی منافقین اور دوسرے بااثر عناصر کے خلاف جو مسلمانوں کے درمیان کسی نہ کسی جگہ موجود ہوتے ہیں اور اسلامی حکومت کو کمزور کرنے کے لئے ہر موقعے سے استفادہ کرتے ہیں اور بیرونی دشمنوں کے خلاف جن کی طرف کفار کے عنوان سے اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

''اے رسولؐ کفار و منافقین کے خلاف جنگ کرو اور ان کے ساتھ شدت سے پیش آؤ، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور کیا ہی برا انجام ہے ان کا!''

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ

البتہ جہاد ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جس کے دائرے میں مسلح جنگ، ثقافتی اور معاشرتی جنگیں، سختی، تلخ کلامی اور دھمکی وغیرہ سبھی آجاتے ہیں اس بنیاد پر اگر روایات میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے منافقین کے خلاف مسلحانہ طور پر جنگ نہیں کی (جیسا کہ امام جعفر صادقؑ کی روایت میں آیا ہے کہ اِنَّ رَسُولَ اللہِ لَمْ یُقاتِلْ مُنافِقاً قَطُّ)[3] تو یہ بات مذکورہ آیت کے منافی نہیں۔

آیت کریمہ میں جو کچھ ذکر ہوا ہے ایک حکم کلی ہے کہ اگر منافقین مقرر شدہ حدود کی خلاف ورزی نہ کریں تو ان کے خلاف فقط غیر مسلح اقدامات کئے جائیں گے، لیکن اگر ان کی سازشیں خطرناک حد تک بڑھ گئی ہوں تو ان کے خلاف مسلحانہ جہاد کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں، جیسا کہ حضرت علیؑ کے دور میں کئی دفعہ یہ صورتحال پیش آئی۔ دوسرے الفاظ میں اگرچہ رسول اکرمؐ کا منافقین کے ساتھ نرم رویہ تھا،

---

[1] بحار، ج۲، ص۵۔

[2] مجمع البیان، ج۱۱ور۲، ص۵۶۲۔

[3] مجمع البیان، ج۱۰، ص۳۱۹۔

لیکن کتاب فی ظلال القرآن میں سید قطب شہید کے مطابق نرمی کا اپنا مقام ہے اور شدت وسختی کا اپنا اور ان میں سے ہر ایک اگر اپنی جگہ استعمال نہ ہو تو نقصان دہ ثابت ہوگی۔ بنابریں پر کوئی مشکل نہیں کہ خاص حالات میں ان کے ساتھ نرم رویہ اپنایا جائے اور دوسرے حالات میں نہ صرف سختی بلکہ مسلح اقدامات بھی کئے جائیں۔[1]

دسویں اور آخری آیت میں مجاہدین اور اسلام کی عسکری طاقتوں کے بلند مرتبے اور دوسروں پر ان کی واضح برتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

''وہ مؤمنین جو کسی بیماری، پریشانی یا قابل قبول عذر کے بغیر جہاد سے پہلو تہی کرتے ہیں، ان مجاہدین کے برابر نہیں جو راہ خدا میں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرتے ہیں؛ بلکہ خدا تعالیٰ نے جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے والے ان مجاہدین کو گھروں میں بیٹھے رہنے والوں پر اہم فضیلت عطا کی ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ (ان کے نیک اعمال کی مناسبت سے) ثواب کا وعدہ کیا ہے، لیکن مجاہدین کو قاعدین پر ایک خاص اور عظیم فضیلت بخشی ہے۔''

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾

اس طریقے سے قرآن مجید مسلمانوں کو مجاہدین اور پیچھے رہ جانے والوں کے دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے اور پھر قاعدین کے بھی دو حصے بنا دیتا ہے: ''ناتواں اور معذور افراد'' اور ''توانا و صحیح و سالم افراد'' جنھوں نے سستی اور کاہلی کے باعث جہاد میں شرکت سے اجتناب کیا۔ بعد ازاں عظیم درجات، فضل کبیر اور اللہ کی رحمت و مغفرت کو صرف مجاہدین کے شامل حال قرار دیتا ہے۔ یہیں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آج کل معمولاً دشمن کے خلاف جنگ ایک خاص گروہ (فوج) کا فریضہ سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس اسلام میں یہ ہر اس فرد کا فرض ہے جو اسلحہ اٹھانے اور دشمن کے خلاف لڑنے کی طاقت رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں کوئی فوج تشکیل نہیں دی گئی تھی اور جنگ کے موقع پر اسلحہ اٹھانے کی طاقت رکھنے والے افراد قرآن مجید کی ہدایت اور اس کے حکم کے مطابق اسلحہ اٹھا کر میدان جنگ کا رخ کرتے تھے یعنی آج کل کی اصطلاح میں سب سے رضاکارانہ طور پر جنگ میں شرکت کرتے تھے اور یہی چیز مسلمانوں کی عظیم عسکری طاقت کا راز تھی۔

[1] فی ظلال القرآن، ج ۴، ص ۲۵۵۔

مسلح افواج اور عوامی رضا کار

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ بہت ساری دوسری آیات سے بھی، حکومت اسلامی میں فوج اور اس کی خصوصیات کامل طور پر روشن ہو جاتی ہیں اور اسلامی عسکری نظام اور دوسرے معاشروں میں موجود عسکری اور فوجی نظام کے مابین فرق اور امتیاز نمایاں ہوجاتا ہے۔

البتہ ہم چونکہ ایک ایسے زمانے میں ہیں جس میں عسکری فنون بہت پیچیدہ ہو چکے ہیں اور ان کے بارے میں خصوصی مہارت درکار ہوتی ہے لہٰذا ان فنون میں ماہر افراد اور خصوصی مہارت رکھنے والے پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ افسران سے استفادہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس طرح لازم ہے کہ کچھ افراد مسلح افواج کے طور پر موجود رہیں جورات دن اہم دفاعی امور پر غور وفکر کریں اور ہر وقت دشمن کے مقابلے کے لئے آمادہ رہیں، لیکن اس کے باوجود عوامی رضا کاروں کا کردار اپنی جگہ پر محفوظ ہے اور ان کی اہمیت مسلم ہے بلکہ ان کے بغیر فوج بھی مطلوبہ نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی، چنانچہ آٹھ سالہ ایران وعراق کی باہمی جنگ میں اس عظیم قوت کے کردار کا بخوبی مشاہدہ ہو چکا ہے کہ اگر یہ رضا کار نہ ہوتے تو ایران کا ایک بڑا حصہ عراقی حملے کے نتیجے میں ہاتھ سے نکل جاتا، یہی رضا کار فوج تھی جس نے صدام کی سپار کو، جسے سپر طاقتوں کی حمایت حاصل تھی، پیچھے دھکیل دیا تھا اور ان کے منصوبے خاک میں ملا دیئے تھے۔

لہٰذا اگر کہا جائے رضا کار فوج ایک خاص زمانے، مثلاً زمانۂ رسول اکرمؐ کے ساتھ مخصوص تھی، چونکہ اس زمانے میں آج کی طرح پیچیدہ فنون عسکری موجود نہیں تھے تو ایسے لوگوں کی یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ آج بھی عوامی رضا کار فوج کا اسلامی ممالک کے دفاع میں کردار قابل انکار نہیں۔

اس بات کا دوسرا شاہد فلسطینی سپاہی ہیں، ہم جانتے ہیں کہ مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے والی یہی رضا کار فوج ہے، ایک ایسی فوج جس میں چھوٹی عمر کے نوجوان شریک ہیں اور جو اسلحے سے محروم ہونے کی وجہ سے پتھروں سے استفادہ کرتے ہیں! اگر ہم اس مطلب کا چشم دید مشاہدہ نہ کرتے تو یہ بات ناقابل یقین تھی کہ پیچیدہ اسلحہ، ایٹمی بم، پیشرفتہ میزائل جن کی رسائی ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک ہے، کے اس زمانے میں لوگ پتھر کے اسلحے کے ساتھ میدان میں آئیں اور انہی پتھروں کے ساتھ دشمن کو بے بس کردیں! مقبوضہ فلسطین میں اسرائیل کے مقابلے میں کوئی منظم فوج نہیں، جو کچھ ہے یہی رضا کار ہیں جنھوں نے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کافی تجربات حاصل کر لئے ہیں اور میدان عمل میں ایک تربیت یافتہ لشکر کی طرح لڑ رہے ہیں اور بعض افراد اس ابتدائی انداز کی جنگ میں مشغول ہیں اور دشمن جو پاؤں سے لے کر سر تک مسلح ہے، کو بے چارگی اور بے بسی کا نمونہ بنا دیتے ہیں!

بنابریں حکومت اسلامی کو رضا کار فوج سے استفادہ کرنے کی اسلامی سنت سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ اگر رضا کار افراد دنیا میں کم نظر آتے ہیں اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ حکومتیں ان (رضا کاروں) سے استفادہ نہیں کرسکتیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عظیم فریضۂ الٰہی کے عنوان سے جہاد کے واجب ہونے کا عقیدہ ان کے ہاں نہیں، وہ جنگ کو صرف حکومت کی ذمہ داری سمجھتے ہیں لیکن اسلام میں یہ ہر ایک فرد کی ذمہ داری ہے۔ شہادت کی اعلیٰ قدر وقیمت اور شہداء کی انتہائی عظمت ایک ایسی چیز ہے کہ اسلام کے علاوہ اس کا کہیں اور نام ونشان موجود نہیں، یہی وجہ ہے کہ رضا کاروں جیسی جان نثاری وفدا کاری دوسروں کے پاس نہیں، لیکن یہی جذبہ مسلمانوں میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔

البتہ وہ ممالک جن پر یہ ثقافت حکم فرما نہیں، جب انتہائی مجبور ہو جاتے ہیں اور ان کا ملک تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت ممکن ہے کہ عوامی رضا کار فوج تشکیل دیں، لیکن اسلام میں ہمیشہ اور ہر حال میں ایسی رضا کار طاقت موجود رہی ہے۔ لہٰذا حکومت اسلامی کو چاہیے کہ وہ اس دینی ثقافت کی مزید قدر و قیمت کی قائل ہو اور عوامی رضا کار فوج کو حالت صلح میں بھی غیر معمولی اہمیت دے، بلکہ رضا کاروں کو مرحلہ وار ترقی یافتہ فنونِ جنگ کی تربیت دے تا کہ خطرے کی صورت میں تمام تربیت یافتہ افراد کو میدان جنگ کی طرف روانہ کیا جا سکے۔

شہداء کی تعظیم و تکریم اور ان کے خاندان کا احترام اور اس کی مادی و معنوی قدردانی اسلامی احکام کا ایک حصہ ہے اور ان تدبیروں میں سے ہے جن کی وجہ سے اسلامی رضا کاروں کا عزم و حوصلہ محفوظ اور قائم رہتا ہے اور اگر اس بات کو بھلا دیا جائے تو یہ اسلامی رضا کاروں کے عزم و ہمت کی کمزوری کا باعث ثابت ہوگی۔ کس قدر خوبصورت ہے کہ ہماری مساجد کے ساتھ رضا کاروں کے مرکز بھی تشکیل دیئے جاتے ہیں اور رضا کاروں کی سرگرمیاں نماز کی طرح عبادت کی حیثیت رکھتی ہے، یہ ایسے امور ہیں جو فقط عقیدے اور مذہبی ثقافت کے زیر سایہ ہی ممکن ہیں۔

فوجی تربیت

آیت شریفہ

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (سورۂ انفال/۶۰)

جس کی وضاحت گذشتہ بحث میں بیان ہو چکی ہے، اسے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ امن و امان کی حالت میں بھی اپنی فوجی طاقت کی حفاظت کریں اور آئے دن فنون جنگ میں جو ترقی ہو رہی ہے اس کے مطابق مسلسل فوجی تربیت میں بھی جدت کا مظاہرہ کریں، اسی طرح جدید ترین جنگی آلات کو ہر قیمت پر حاصل کریں اور اس بات کے پیش نظر کہ آیت کریمہ میں مذکور لفظ **قوۃ** تمام معنوی، مادی، انسانی اور غیر انسانی قوت و طاقت پر مشتمل ہے، لہٰذا ان سب قوتوں کے لحاظ سے آمادہ رہیں۔ سورۂ نساء کی آیت ۷۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا﴿۷۱﴾

''اے ایمان والو! دشمن کے مقابلے میں اپنی استعداد اور آمادگی کی حفاظت کرو حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور دشمن کے طرف ایک دستے یا کئی دستوں کی صورت میں حرکت کرو''

اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ حِذر (جو خضر کے وزن پر ہے) کا مطلب خطرے کے مقابلے میں بیداری، ہوشیاری اور آمادگی ہے اور کبھی اس وسیلے اور آلہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس کی مدد سے خطرے کا مقابلہ کیا جاتا ہے، اس لحاظ سے بھی مسلمانوں کی دشمن کے مقابلے میں دائمی آمادگی کی ضرورت بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔ جملہ ''**فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِانْفِرُوْا جَمِيْعًا**'' میں اگر ''نفر کہ جو کوچ کرنے کے

معنیٰ میں ہے کو مد نظر رکھا جائے تو یہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ مسلمانوں کو غافل نہیں رہنا چاہیے کہ دشمن ان پر حملہ کردے بلکہ انھیں چاہیے کہ دشمن کے حملے سے قبل اس پر حملہ کردیں اور اس امر کے لئے مختلف طریقوں سے استفادہ کیا جائے، کبھی پراگندہ اور بکھرے ہوئے گروہوں کی صورت میں اور کبھی ایک منظم لشکر کی طرح دشمن پر حملہ کریں، بہر حال یہ سب کچھ وقت کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔

سبق و رمایہ (سواری اور تیراندازی کا مقابلہ)

اسلام میں عسکری اور فوجی تربیت کے سلسلے میں نہ صرف تیراندازی اور گھڑسواری کی ترغیب دلائی گئی ہے بلکہ مقابلے اور ہار جیت کی شرط لگانے کی بھی اجازت دی گئی ہے، باوجود اس کے اسلام جوئے اور ہار جیت میں شرط بندی کے سخت خلاف ہے اور اسے گناہ کبیرہ شمار کرتا ہے لیکن اس موضوع کو بعض مخصوص مقاصد کی خاطر حرمت کے دائرے سے خارج قرار دیا گیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْمَلائِکَةَ لَتَنْفِرُ عِنْدَ الرِّھانِ، وَتَلْعَنُ صاحِبَہُ ما خَلاالْحافِرَ وَالْخُفَّ وَالرِّیشَ وَالنَّصلَ"

فرشتے ہار جیت کی شرط بندی کے وقت دور ہو جاتے اور اس عمل سے نفرت کرتے ہیں اور شرط لگانے والوں پر ان کی لعنت ہوتی ہے، لیکن گھڑسواری اور تیراندازی پر شرط بندی اس سے مستثنیٰ ہے۔[۱]

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قسم کے مقابلے رسول اکرمؐ کی موجودگی میں اور کبھی آپؐ کے مالی تعاون کے ذریعے انجام پاتے تھے، امام زین العابدین -ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ رَسُولَ اللہِ(ص) اَجْرَی الْخَیْلَ وَجَعَلَ سُبَقَھا اَواقِیَ مِنْ فِضَّةٍ"

رسول اکرمؐ نے گھڑسواری کے مقابلے کا حکم دیا اور مقابلے کے مال کے طور پر کئی اوقیہ چاندی مقرر فرمائی (یعنی مقابلہ جیتنے والے کے لئے یہ انعام مقرر فرمایا)۔ حتیٰ کہ بعض روایات کے مطابق آپؐ نے بعض مقابلوں میں ذاتی طور پر شرکت فرمائی![۲]

---

[۱] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۴۷، حدیث ۶، باب ۱ (کتاب سبق و رمایہ) بعض علماء نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ لفظ "نصل" کا فقط تیر ہی معنی نہیں بلکہ اس کے دائرے میں تمام تیز نوک والے آلات آجاتے ہیں جیسے نیزہ و خنجر وغیرہ کہ انھیں دور پھینکنے کا مقابلہ ہوتا تھا، اسی طرح لفظ "خف" شتر سواری اور ہاتھی کی سواری کے مقابلے پر بھی مشتمل ہے اور "حافر" گھوڑے کے علاوہ تمام سم دار چارپایوں پر بھی مشتمل ہے۔ "ریش" پر کے معنی میں ہے جو تیر کی طرف اشارہ ہے چونکہ عام طور پر تیروں کے پچھلے حصے میں "پر" لگاتے تھے تاکہ تیر کی حرکت کو منظم کرے۔

[۲] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۴۹، حدیث ۵، اور ص ۳۵۱، حدیث ۴۔

آداب جہاد

کسی مکتب کی اصلیت اور حقیقت کو جاننے اور پرکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دشمن کے خلاف خاص طور پر میدان جنگ میں اور اس کے بعد جنگی قیدیوں کے ساتھ، اس کے سلوک اور جنگی نتائج و عواقب کے مقابلے میں اس کے طرز عمل کی تحقیق کی جائے۔ قرآنی آیات اور احادیث، آداب جنگ کے ضمن میں اس حقیقت کو واضح انداز میں ثابت کرتی ہیں کہ اسلام نے سخت ترین ماحول یعنی میدان جنگ میں بھی اخلاقی اور انسانی مسائل کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اور ہر جگہ قہر و غضب کو لطف اور سختی و تندی کو رحمت و شفقت کے ساتھ مخلوط کیا ہے، یقینی طور پر حکومت اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان آداب کو' جو اسلام سے بیگانہ افراد کی طرز قضاوت پر گہرے نقوش چھوڑتے ہیں اور جن (آداب) میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اسلام کی طرف توجہ مبذول کرانے اور اس کے بارے میں تجدید نظر کا باعث بن سکیں' عمل میں لائے اور ان کو عملی جامہ پہنائے۔ قرآنی آیات میں کئی بار عدالت اور دشمن کے مقابلے میں معقول اور انسانی حدود سے تجاوز نہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ایسی آیات میں سے ایک سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۰ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾

''وہ لوگ جو تم سے جنگ کرتے ہیں ان کے خلاف اللہ کی راہ میں (اس کی خاطر) جنگ کرو اور حد سے تجاوز اور تعدی نہ کرو بے شک خدا تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اس آیت شریفہ میں درحقیقت تین نکتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؛ پہلا نکتہ یہ کہ جنگ کو خدا کے لئے اور اس کی راہ میں ہونا چاہیے نہ کہ جاہ طلبی اور انتقام کی خاطر۔ دوسرا نکتہ یہ کہ جنگ کو تجاوز کرنے والوں کے خلاف ہونا چاہیے یعنی جب تک جنگ تم پر ٹھونسی نہیں جاتی اس وقت تک اسلحہ اٹھانے سے گریز کرو۔ تیسرا نکتہ یہ کہ میدان جنگ میں حد سے تجاوز نہ کرو اور اخلاقی اصول کا لحاظ رکھو، بنابریں اگر دشمن اپنا اسلحہ زمین پر رکھ کر جنگ سے دستبردار ہو جائے تو اس پر حملہ نہ کرو، اسی طرح ان لوگوں کو ہرگز نہ چھیڑا جائے جو جنگ کی طاقت سے محروم ہیں مثلاً بوڑھے افراد، بچے اور عورتیں وغیرہ باغات اور کھیتوں کو تباہ کرنا، قابل استفادہ گھروں کو مسمار و ویران کر دینا، ایسا اسلحہ استعمال کرنا جس کے باعث لوگوں کے گروہ کے گروہ قتل ہو جائیں یہ سب بے گناہوں پر ظلم وستم اور غیر انسانی طریقوں کی مثالیں ہیں جو اسلام کی نظر میں ممنوع ہیں۔ اسی سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۴ میں اسی چیز پر مزید تاکید کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٩٤﴾

''جو کوئی تم پر تجاوز کرے اسی طرح سے تم بھی اس پر تجاوز کرو اور خدا سے ڈرو (حد سے زیادہ تجاوز سے

پرہیز کرو)اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔''

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم خدا کی مدد اور نصرت کے خواہاں ہو تو ضروری ہے کہ ظلم و تعدی سے میدان جنگ میں بھی اجتناب کرو۔ اسی معنی پر ایک دوسری شکل میں سورۂ مائدہ کی آیت ۲ میں تاکید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ

''وہ لوگ جنہوں نے (صلح حدیبیہ کے موقع پر) تمہیں مسجد الحرام میں داخل ہونے سے منع کیا ان کے ساتھ خصومت اور عداوت اس بات کا باعث نہیں بنی چاہیے کہ تم ان پر ظلم و ستم اور تجاوز کرو (اور دشمن کے حدیبیہ میں سخت گیرانہ رویے کی وجہ سے تمہارا انتقامی جذبہ تم پر غالب نہیں آنا چاہیے)

احادیث میں بھی دشمن کے خلاف میدان جنگ میں اور جنگ کے خاتمے کے بعد اصول انسانی کی رعایت کے سلسلے میں مختلف بیانات کی صورت میں بکثرت احکام موجود ہیں جن میں انسانی جذبات اور صلح پسند روح بخوبی نظر آتی ہے۔ صاحبان سیر نے حضور اکرمؐ کی سیرت کے بارے میں لکھا ہے کہ جب آپؐ کسی لشکر کو جنگ کی طرف روانہ کرتے تو لشکر کے سرداروں کو مع لشکر طلب فرماتے اور انھیں ارشاد و نصیحت کرتے ہوئے فرماتے: ''خدا کا نام لے کر چل پڑو اور خدا سے مدد مانگو اور اس کے لئے اور دین رسول خداؐ کا لئے جہاد کرو، اے لوگو مکر و فریب نہ کرنا اور جنگی مال غنیمت سے چوری کو جائز نہ سمجھنا اور دشمن کے قتل ہونے کے بعد اس کے اعضاء نہ کاٹنا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، غاروں اور ویرانوں میں پناہ گزین عابدوں اور راہبوں کو قتل کرنے سے پرہیز کرنا۔

درختوں کو جڑ سے نہیں اکھاڑنا مگر مجبوری کی صورت میں، کھجور کے درختوں کو مت جلانا اور نہ ہی انھیں دریا برد کرنا، پھلدار درختوں کو اکھاڑنے سے پرہیز کرنا، زراعت کو آگ نہیں لگانا چونکہ تم خود بھی اس کے محتاج ہو سکتے ہو، حلال گوشت جانوروں کو نہیں مارنا مگر اسی قدر جو تمہاری غذائی ضرورت پوری کر سکے، دشمن کے پانی کو زہر آلود نہ کرنا اور کسی حیلے اور فریب سے کام نہ لینا۔'' آنحضرتؐ نے خود بھی دشمنوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا، دشمن پر کبھی شبخون نہیں مارا اور آپؐ نفس امارہ کے خلاف جہاد کو ہر چیز سے بالاتر سمجھتے تھے۔[1]

مندرجہ بالا احکامات پر غور و فکر جن میں نہایت باریک بینی کا لحاظ رکھا گیا ہے سے بخوبی ظاہر کرتا ہے کہ اسلام نے جنگ سے متعلق کسی اخلاقی مسئلے سے صرف نظر نہیں کیا اور رسول اکرمؐ بذات خود ان اخلاقی مسائل کا خیال رکھتے تھے، آپؐ کا رویہ ان لوگوں کی طرح نہیں تھا جو زبانی طور پر تو خوب حقوق انسانی اور رعایت حقوق بشری کا دم بھرتے ہیں، لیکن عملی طور پر ان کی باتیں صدا بصحرا ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ نفس کے خلاف جہاد' جو بہترین جہاد ہے' اس نکتے پر تاکید اور اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ حقیقی مسلمان وہی ہے جو میدان جنگ میں انسانی اصولوں کی رعایت کرتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ نکتہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کیمیائی اسلحہ اور ہر اس اسلحے کے خلاف ہے جو کئی لوگوں کے بیک وقت

[1] منتھی الآمال، ج۱، ص۱۶ (رسول اکرمؐ کے فضائل کے باب میں)، علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں اسی کے مشابہ مطلب کو جلد ۹۷، صفحہ ۲۵ پر بیان کیا ہے۔

قتل کا باعث بنے اور اسے ممنوع قرار دیتا ہے لہٰذا اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ اس قسم کے اسلحوں سے مکمل طور پر پرہیز کرے۔ایک اور حدیث میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"فَإِذَا كَانَتِ الْهَزِيمَةُ بِإِذْنِ اللهِ فَلَا تَقْتُلُوا مُدْبِراً وَلَا تُصِيبُوا مُعْوِراً وَلَا تُجْهِزُوا عَلَى جَرِيحٍ وَلَا تُهِيجُوا النِّسَاءَ بِأَذًى وَإِنْ شَتَمْنَ أَعْرَاضَكُمْ وَسَبَبْنَ أُمَرَائَكُمْ"

''جب خدا تعالیٰ کے اذن سے انھیں شکست دے دو تو میدان سے بھاگنے والوں، ناتواں افراد اور مجروحین کو قتل نہ کرو اور عورتوں کو اذیتوں کے ذریعے ھیجانی کیفیت سے دوچار نہ کرو اگرچہ وہ تمہیں گالیاں ہی کیوں نہ دیں اور تمہارے سرداروں کی بدگوئی ہی کیوں نہ کریں۔[1]

رسول اکرمؐ کی مذکورہ بالا حدیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے کہ آپؐ ہمیشہ جنگ سے پہلے سرداران لشکر اور اہل لشکر کو جو تاکیدی نصیحت فرماتے؛اس کے پیش نظر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جہاد اور دشمن کے خلاف جنگ کے یہ احکامات اسلام کے اصلی دستور العمل کا حصہ ہیں جسے زندہ رکھنے کے لئے اسلامی حکومت کو سرتوڑ کوشش کرنی چاہیے۔

جہاد کی اقسام

اگرچہ بعض محققین اسلامی جہاد کو دو قسموں ابتدائی جہاد اور دفاعی جہاد میں تقسیم کرتے ہیں اور یہ دو قسمیں آگے مزید قسموں میں تقسیم ہو جاتی ہیں، لیکن درحقیقت جہاد ابتدائی بھی جہاد دفاعی کی ایک قسم ہے جو آئندہ آنے والی توضیحات سے واضح ہو جائے گا، اس اشارے کے بعد دوبارہ ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جہاد کی انواع و اقسام کے قرآنی بیان کو موضوع بحث بناتے ہیں:

ا۔ جہاد ابتدائی

سورۂ حج کی آیت ۳۹ میں جو بعض حضرات کی رائے میں جہاد کی سب سے پہلی آیت ہے، میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿۳۹﴾

''وہ لوگ جو دشمن کے حملوں کا نشانہ بنے ہیں انھیں جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے، اور خدا تعالیٰ ان کی نصرت پر قادر ہے۔''

اس کے بعد اس آیت کے بعد مطلب کی وضاحت کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللهُ"

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۱۴۔

''وہی لوگ جو بلاوجہ اپنے گھروں سے نکالے گئے (ان کا قصور اگر تھا تو یہی) کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب فقط اللہ ہے۔''

یہ آیت جس کی ابتدا ''اذن'' کے لفظ کے ساتھ کی گئی ہے ان لوگوں کی رائے کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے جو اسے پہلی آیت جہاد قرار دیتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے قبل ایسا کوئی اذن موجود نہیں تھا۔ بہر حال اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ حکم جہاد جس کی مشروعیت اور جواز کا حکم دیا گیا ہے وہ دشمن کے مقابلے میں دفاعی جہاد ہی ہے، وہی دشمن جنھوں نے مسلمانوں کو ہجرت اور اپنے گھروں کو بغیر کسی گناہ کے، چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہاں! اگر ان کا کوئی گناہ تھا تو یہی کہ وہ توحید کے معتقد اور یکتا پرست تھے۔ بعض دوسرے مفسرین کی رائے میں پہلی آیت جہاد سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۰ ہے جو یہ کہتی ہے کہ

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ

''وہ لوگ جو تمہارے ساتھ برسر پیکار ہیں ان کے خلاف راہ خدا میں قتال کرو۔''

اگر ہم اس رائے کو مان لیں تو پھر بھی جہاد دشمن کے حملوں کا منہ توڑ جواب دینے کی اساس پر قائم ہے اور ہر صاحب عقل انسان جانتا ہے کہ خونخوار دشمن کے حملوں کے جواب میں خاموش رہنا کوئی عقلی اور منطقی عمل نہیں۔ "فِي سَبِيلِ اللهِ" سے تعبیر کرنا اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اسلام کا دفاع بھی خواہشات نفس کی پیروی اور جاہ طلبی کی بجائے خدا کے لئے اور الٰہی معیار کے محور پر گھومتا ہے! یہ اسلام میں جہاد کی پہلی شکل ہے لیکن دفاعی جہاد کا ہرگز یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ حکومت اسلامی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے، یہاں تک کہ دشمن اہل اسلام کے گھروں پر حملہ کر دیں اور پھر وہ دفاع کی غرض سے اٹھ کھڑی ہو، بلکہ اس کے برعکس جب وہ محسوس کرے کہ دشمن جنگ کے لئے تیار ہے اور اس کا قصد اسلامی فوج پر حملہ کرنا ہے تو ضروری ہے کہ اسلامی حکومت پہل کرتے ہوئے ایسا کام کرے جس سے دشمن میں حملے کی طاقت ہی نہ رہے۔

۲۔ فتنہ کی آگ کو بجھانے کے لئے جہاد

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ میں ارشاد الٰہی ہے:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴿۱۹۳﴾

''اور ان (دشمنوں) کے خلاف جنگ کرو تا کہ فتنے کی آگ بجھ جائے اور اگر وہ رک جائیں اور فتنہ پردازی سے دستبردار ہو جائیں تو ان کے ساتھ مزاحمت نہ کریں اس لئے کہ ستم گروں کے علاوہ کسی پر تعدی (چڑھائی) کرنا جائز نہیں۔''

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''فتنہ'' کی تفسیر میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، لیکن فتنہ کی ہم جو بھی تعبیر کریں چاہے اس سے مراد فساد پیدا کرنا یا مؤمنین کو اذیتوں کا نشانہ بنانا ہو، یا وہ شرک اور بت پرستی جو دوسروں پر اپنا عقیدہ مسلط کرنے کے ساتھ مخلوط ہو اور چاہے اس کا مطلب اہل ایمان کو فریب میں مبتلا کر کے انھیں گمراہ کرنے کی کوشش ہو، جو کچھ بھی ہو دشمن کی طرف سے حملہ شمار ہوتا ہے، لہٰذا اس (فتنہ) کے مقابلے میں بھی جہاد دفاعی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جملہ ''فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ'' بھی بخوبی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مقصد فقط ظالموں کے ظلم وستم کا خاتمہ کرنا ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ اسی سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۱ میں ہے:

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

''انھیں جہاں پاؤ قتل کر دو اور انھیں وہیں سے باہر نکالو جہاں سے انھوں نے تمھیں باہر نکالا ہے اور فتنہ قتل وغارتگری سے بدتر ہے۔''

یہ آیت، گزشتہ آیت کے پیش نظر کہ جس میں حملہ کرنے والے مشرکین کا ذکر ہے، واضح طور پر ان لوگوں کے خلاف جنگ کی دعوت دیتی ہے جنھوں نے مجرمانہ انداز میں حملے کر کے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا خاص طور پر وہ جو مسلمانوں کو اپنا دین تبدیل کرنے کے لئے ان پر دباؤ ڈالتے اور سخت اذیتوں کا نشانہ بناتے تھے، قرآن نہ صرف ان لوگوں کے خلاف جنگ کو جائز بلکہ واجب قرار دیتا ہے۔

اگر چہ بعض روایات اور مفسرین کی عبارات میں ''فتنہ'' سے مراد شرک لیا گیا ہے؛ لیکن آیۂ شریفہ اور اس کے قبل وبعد کی آیات میں ایسے قرائن موجود ہیں جو بخوبی ظاہر کرتے ہیں کہ اس سے مراد ہر قسم کا شرک اور بت پرستی نہیں بلکہ مراد مشرکین مکہ کے اعمال کی طرح کے اعمال ہیں، یعنی وہ مسلسل مسلمانوں کو اپنا عقیدہ تبدیل کرنے کے لئے اپنے جبر کا نشانہ بناتے تھے۔ تفسیر المنار میں آیت کا مفہوم یوں بیان ہوا ہے:

''حَتّٰى لَا تَكُونَ لَهُمْ قُوَّةٌ يَفْتِنُونَكُمْ بِهَا وَ يُؤْذُونَكُمْ لِأَجْلِ الدِّينِ وَ يَمْنَعُونَكُمْ مِنْ إِظْهَارِهِ أَوِ الدَّعْوَةِ إِلَيْهِ''

ان کے خلاف جنگ جاری رکھو تاکہ دین کی تبدیلی اور اسلام کے اظہار اور اس کی طرف دعوت سے باز رکھنے کے لئے وہ تم پر ظلم وستم ڈھانے کی طاقت سے محروم ہو جائیں۔[1]

یقینی طور پر ایسا فتنہ اور آزادی سے محروم کرنا اور عقیدے کی تبدیلی کے لئے ہر قسم کا ظلم وستم روا رکھنا قتل سے بدتر ہے۔ بنا برایں جملہ: ''وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ'' اس بات کی طرف اشارہ ہوگا کہ ''فتنہ'' کی برطرفی اس میں ہے کہ ہر کوئی آزادی کے ساتھ خدا کی عبادت کرے اور کسی چیز اور کسی انسان سے نہ ڈرے، نہ یہ کہ مشرکین آزاد ہوں تاکہ خانہ کعبہ کو بت کدے میں تبدیل کر دیں اور پاک دل مسلمان علانیہ طور پر ''اللہ اکبر'' اور ''لا الہ الا اللہ'' بھی نہ کہہ سکیں۔ بہر حال اس سورہ کی آیات ۱۹۰، ۱۹۱ اور ۱۹۳ جو سب آپس میں

[1] المنار، ج۲، ص۲۱۱۔

مرتبط ہیں بخوبی ظاہر کرتی ہیں کہ فتنے کی آگ کو بجھانا جہاد اسلامی کے لئے ایک ہدف کے عنوان سے حقیقت میں دفاعی پہلو کا حامل ہے جو مسلمانوں کو ثقافتی، معاشرتی اور عسکری دشمنوں کے حملوں سے بچاتا ہے۔

۳۔ مظلومین کی حمایت کی خاطر جہاد

سورۂ نساء کی آیت ۷۵ مسلمانوں کو مظلوموں کی حمایت اور ظالموں سے مقابلے کی دعوت دیتی ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝

''راہ خدا میں اور ان مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنھیں ضعیف و ناتواں بنادیا گیا ہے، کیوں جہاد نہیں کرتے وہی مظلوم لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اے خدا! ہمیں اس شہر (مکہ) سے جس کے رہنے والے ظالم و ستمگر ہیں، باہر کردے اور ہمارے لئے اپنی طرف سے یار و مددگار مقرر فرما!''

اس آیت کریمہ میں پہلے راہ خدا میں جہاد کی بات کی گئی ہے اور پھر فوراً ہی ان مظلوموں کا تذکرہ کیا گیا ہے جنھیں سنگدل دشمن نے اس قدر اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑنے پر راضی ہو گئے ہیں، ہماری رائے میں دونوں کی برگشت ایک ہی معنی کی طرف ہے؛ کیونکہ اس قسم کے مظلومین اور لاچار لوگوں کی مدد جہاد فی سبیل اللہ کا واضح اور روشن نمونہ ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ''مستضعف'' اور ضعیف کے درمیان ایک واضح فرق ہے، ضعیف، ناتواں اور کمزور شخص کو کہتے ہیں، لیکن مستضعف وہ ہوتا ہے جو اہل جور و ستم کے ظلم کے باعث ضعیف ہوا ہے، چاہے یہ تضعیف (کمزور کرنا) فکری و ثقافتی ہو یا معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی۔ (غور فرمائیں) واضح ہے کہ جہاد کی یہ قسم بھی دفاعی ہے، ظالموں کے مقابلے میں ان مظلومین کا دفاع، مذکورہ بالا تین مقاصد جہاد اسلامی کے حقیقی اور اصلی مقاصد ہیں، اگرچہ اسے جہاد ابتدائی اور جہاد دفاعی دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، لیکن روح و حقیقت سب کی جہاد دفاعی ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں ہمیں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ جس سے ظاہر ہو کہ کفار مسلمانوں کے ساتھ صلح و مسالمت پر راضی اور آمادہ ہوں اور مسلمانوں نے ان کی اس خواہش کو ٹھکرا دیا ہو۔

آج بھی حکومت اسلامی کو کسی سے کوئی پرخاش نہیں اور جب تک جنگ اس پر ٹھونس نہیں دی جاتی وہ کسی کے ساتھ جنگ نہیں کرتی، لیکن مظلومین کے دفاع کو یہ اپنی اصلی ذمہ دار سمجھتی ہے اور دشمن کی طرف سے مرعوب کرنے، وحشت زدہ کرنے، ہر قسم کی پابندی، دباؤ اور آزادی سے محرومی کو ایک قسم کا اعلان جنگ سمجھتی ہے لہٰذا اپنے آپ کو دفاع کا ذمہ دار شمار کرتی ہے۔ ایک بار پھر ہم دہراتے ہیں کہ مفہوم دفاع یہ نہیں کہ انسان بیٹھ کر دشمن کے حملے کا انتظار کرے اور حملے کے بعد اسے اپنے دفاع کی سوجھے، بلکہ دشمن کی نقل و حرکت کو محسوس کرے اور جنگی آمادگی کو خاص طور پر نازک صورتحال میں محفوظ رکھے اور قبل اس کے غفلت کے عالم میں دشمن کے حملے کا نشانہ بنے، دشمن پر کاری ضرب لگا کر اس کے عزائم خاک میں ملادے۔

حکومت اسلامی اور مسئلہ صلح

بلاشبہ جنگ اور خونریزی نہ صرف یہ کہ انسان کی فطرت سلیم کے ساتھ سازگار نہیں بلکہ کائنات کی تمام مخلوقات کے قوانین کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ظالمانہ اہداف تک رسائی کے لئے جنگ ایک قسم کی بیماری، انحراف اور شدت وسختی کا ذریعہ ہے، یہاں تک کہ حق وعدالت کی خاطر برپا کی جانے والی مقدس اور دفاعی جنگیں بھی صراط مستقیم سے کسی گروہ کے انحراف کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی ہیں اور گاہے سالم افراد اور اقوام پر بھی مسلط کردی جاتی ہیں۔ جنگ کا نتیجہ ہمیشہ انسانوں اور سرمایہ کا ضیاع، شہروں اور آبادیوں کی ویرانی اور دشمنی وخصومت میں شدت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب تک ممکن ہو اس سے پرہیز کیا جائے بلکہ انسانوں اور ان کی خدا داد صلاحیتوں کو معاشروں کی فلاح و بہبود کے لئے صرف ہونا چاہیے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان کے اندر ایک دائمی جنگ برقرار ہے جو بیماریاں پیدا کرنے والے بیرونی جراثیموں کے خلاف ہے، خون کے سفید جسیمے جو بدنی مملکت کے ہوشیار دفاعی سپاہی ہیں ان کا مقابلہ اور جنگ ان مختلف قسموں کے جراثیموں کے ساتھ ہوتا ہے جو پانی، ہوا، غذا اور جسم پر لگے زخموں کے ذریعے بدن میں داخل ہوجاتے ہیں۔ یہ جنگ بھی درحقیقت ایک دفاعی جنگ ہے اور اگر ہمیں ایسا ماحول میسر آجائے جس میں یہ جراثیم بدن کی مملکت پر حملہ نہ کرسکیں تو یہ جنگ بھی ختم ہوجائے گی۔وہ صاحبان فکر ونظر جو استعماری طاقتوں کے مفادات میں کام کرتے ہیں، بعض اوقات کوشش کرتے ہیں کہ جنگ کو ایک ایسی چیز ثابت کریں جو انسانی فطرت کے موافق ہے اور تجاوز کرنے والوں کو یہ اجازت دیں کہ وہ طاقت کے ذریعے اپنی وسعت طلبی کے مقاصد واہداف تک رسائی حاصل کریں۔

یہ لوگ ڈارون ازم کے چار اصولوں میں سے ایک اصل یعنی بقاء کی جنگ کو اس بات کو ثابت کرنے کے لئے اپنی دلیل اور بہانہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: انسانوں کے درمیان جنگ وتنازع ہمیشہ برقرار رہنا چاہیے اور اگر ایسا نہ ہو تو جمود اور سستی روئے زمین پر چھا جائے گی اور نسل بشر زمانہ قدیم کی طرف پلٹ جائے گی! لیکن دائمی جنگ اس بات کا باعث بنتی ہے کہ طاقتور زندہ رہیں اور کمزور چلتے بنیں، اس طرح انتخاب اصلح صورت پذیر ہوتا ہے!

بعض اوقات یہ لوگ قرآنی آیات کی اپنی رائے کے مطابق غلط اور انحرافی تفسیر کر کے اس سے اپنا مقصد پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن ان کی یہ دلیل بہت کمزور ہے کیونکہ بالفرض اگر ہم ''اصل تنازع بقاء'' کو درندوں کے بارے میں قبول کرلیں۔کہ یہ بھی ڈارون ازم کے چاروں اصولوں پر تنقید کرنے والے دانشوروں کی رائے کے مطابق ناقابل قبول ہے، تو اس کا عالم انسانیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، چونکہ انسان، تعاون بقاء اور سالم رقابت (مقابلے) کے ذریعے جس طرح آج کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ صنعتی اور سیاسی میدان میں مختلف گروہوں کے درمیان مقابلے کی فضاء میں انسان اپنی بقاء کو قائم رکھے ہوئے ہے اور امن وامان کے ماحول میں ان کی زندگی باقی اور جاری ہے، لہٰذا انسانوں کی زندگی کی اساس باقی رہنے میں تعاون ہے نہ باقی رہنے کے لیے جنگ ونزاع ہے۔

بہرحال ہمیں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جو جنگ کی خوبی کو ثابت کرے، وہ بھی ایسی جنگ کی خوبی کو جس کے نقصانات صدیوں تک

قابل تلافی نہیں، چاہے وہ انسانی جانوں کے ضائع کی صورت میں ہو، یا صنعتی اور زرعی نقصان کی صورت میں جیسا کہ ہمارے زمانے کی جنگیں ایسی ہی ہیں۔ فقط ایک بیمار ذہن ہی اس قسم کی تباہ کُن جنگوں کی حمایت کرسکتا ہے۔ اس اشارے کے ساتھ ہم اب قرآن مجید کی طرف رجوع کر کے حکومت اسلامی میں صلح طلبی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں:

۱۔ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (بقرہ/۲۰۸)

۲۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(انفال/۶۱)

۳۔ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (نساء/۹۰)

۴۔ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْۗءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَاۗءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (حجرات/۹)

۵۔ "وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" (نساء/۱۲۸)

۶۔ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (بقرہ/۲۰۵)

۷۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ (نساء/۹۴)

ترجمہ:

۱۔ اے ایمان والو! سب کے سب صلح وآشتی میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ رکھو کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔

۲۔ اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف میلان ظاہر کرو اور خدا پر توکل کرو کہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

۳۔......پس اگر وہ لوگ تم سے کنارہ گیری کر کے تمہارے ساتھ جنگ سے باز آجائیں اور صلح کی درخواست کریں تو خدا تعالیٰ تمہیں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

۴۔ جب کبھی مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں اُلجھ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ اور اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر تجاوز کرتا ہے تو تجاوز گر کے ساتھ قتال کرو تا کہ وہ حکم خدا کی طرف واپس آ جائے اور جب جنگ سے برگشت کے لئے زمین ہموار ہو جائے تو ان کے درمیان عادلانہ انداز میں صلح کراؤ اور وانصاف سے کام لو کیونکہ خدا عدل وانصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۵۔اور صلح بہتر ہے۔

۶۔ جب وہ منہ پھیر لیتے ہیں اور آپؐ کے پاس سے اٹھ جاتے ہیں تو زمین پر فساد (اور خون ریزی) کی کوشش کرتے ہیں اور زراعت اور چوپایوں کو برباد کرتے ہیں (حالانکہ جانتے ہیں) کہ خدا تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

۷۔...... جو اظہار صلح ودوستی کرے اسے مت کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔

شرح وخلاصہ

پہلی آیت میں تمام دنیا کے اہل ایمان کو صلح وآشتی اور امن وامان کے ساتھ رہنے کی دعوت دی گئی اور جنگ کو شیطان کے اقدامات قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ''اے ایمان والو! سب صلح وآشتی میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ رکھو کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

اس آیۂ شریفہ میں ایک طرف سے اہل ایمان سے خطاب ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ صلح وسلامتی صرف سایۂ ایمان ہی میں میسر ہے۔

اور دوسری طرف سے لفظ ''كافة'' (سب) پر اعتماد اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ قانون صلح میں کوئی استثناء موجود نہیں جبکہ بغیر مجبوری کے جنگ اسلام اور قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔

اور تیسری طرف سے ''خطوات الشيطان'' سے تعبیر کرنا، اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ جنگ کے عوامل واسباب رفتہ رفتہ فراہم ہوتے ہیں اور جن وانس میں موجود شیاطین انسان کو قدم بقدم اس آگ کی طرف لے جاتے ہیں اور عربی کی ایک معروف ضرب المثل کے مطابق

''اِنَّ بَدْوَ الْقِتالِ اللِّعامُ!'' ایک خونی جنگ کا آغاز ایک طمانچے سے ہوتا ہے؛ لہٰذا جنگ کو پہلے مرحلے میں ہی ختم کر دینا

ضروری ہے۔

اور چوتھی طرف سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ ہر وہ کام جو صلح و امن کو ختم کرنے میں مددگار ثابت ہو ایک شیطانی عمل ہے؛ اور ایسا ہو بھی کیوں نہ؟ حالانکہ جنگ وہ آتش سوزاں ہے جو تمام مادی و معنوی، انسانی اور غیر انسانی قوتوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، خاص طور پر ہمارے زمانے کی جنگیں جو ہر زمانے کی جنگوں کی نسبت زیادہ وحشت ناک، تباہ کن اور مہنگی جنگیں ہیں اور اعداد و شمار جمع کرنے والوں کے مطابق ایک خونی جنگ کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کی تلافی بعض اوقات پورے سو سال میں بھی پوری نہیں ہوتی، وہ بھی مالی تلافی، ورنہ جانی تلافی ناممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں آدمؑ کو پیدا کرنا چاہتا ہوں تو فرشتوں نے اس مخلوق کے جس اہم عیب کی طرف اشارہ کیا وہ زمین پر خون ریزی اور فساد ہی تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر ان کی نظر میں کوئی عیب نہیں تھا:

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ' (بقرہ/۳۰)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ صاحبان لغت کے مطابق ''سلم''اور''سَلم ''ہر دو صلح کے معنی میں ہے کیونکہ اس کی ذات پاک صلح و امن اور سلامتی کا سرچشمہ ہے اور کتاب التحقیق کے قول کے مطابق مادہ سِلم (یعنی سلامت) خصومت کی ضد اور اس کے مقابلے میں ہے۔ جس کا لازمہ آفات و مصائب سے رہائی اور سلامتی و عافیت تک رسائی ہے اور اسلام کو اس وجہ سے اسلام کہتے ہیں کہ جو دنیا و آخرت میں صلح و سلامتی کا سرچشمہ ہے اور''سُلَّمْ ''جس کا معنی سیڑھی ہے، ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے انسان ایک بلند سطح پر جا کر سلامتی کے ساتھ واپس اتر سکتا ہے! حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے آیت کے لفظ''سِلم ''کے معنی کے کئی احتمالات بیان کئے ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی آیت کے ظاہری معنی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔

دوسری آیت ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو مسلمانوں کے ساتھ برسر پیکار ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اگر وہ لوگ صلح کرنے پر مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو اور خدا پر اعتماد کرو کہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۶۱

قابل توجہ امر یہ ہے کہ سورۂ انفال میں یہ آیت ایک ایسی آیت کے بعد واقع ہوئی ہے جو مسلمانوں کو ہمیشہ جنگ کے لئے تیار رہنے اور دشمن کو خوفزدہ کرنے کی خاطر ہر قسم کی طاقت و توانائی فراہم کرنے کا حکم دیتی ہے، یعنی آخری ہدف اور مقصد جنگ نہیں بلکہ یہ بھی صلح کی تقویت اور اس کی اساس کو مضبوط کرنے کی ایک صورت ہے کیونکہ اگر جنگ کی پوری تیاری نہ ہو تو دشمن کی برتری کی طلب اور کشور کشائی کی ہوس کو لگام نہیں دی جا سکتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ''جَنَحُوا''کا مادہ''جَناح''ہے جس کا مطلب خضوع، میلان اور کسی چیز کی طرف حرکت کرنا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ صلح کی ابتدائی گفتگو کا بھی خیر مقدم کرو۔ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ یعنی خدا پر بھروسہ کرو، جیسے الفاظ گویا اس نکتے

کی طرف اشارہ ہیں کہ جب دشمن صلح پر مائل ہوتا ہے تو بعض افراد منفی باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں اور صلح کی جانب ہر قسم کے میلان کو فریب اور مکر و حیلہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی بھر پور مخالفت کرتے ہیں تاکہ کم از کم ان کے اندر وسوسہ ہی پیدا کر دیا جائے۔ قرآن فرماتا ہے: جب صلح طلبی کی معقول علامتیں دشمن کی طرف سے ظاہر ہوں تو انھیں مثبت جواب دو اور خدا پر توکل کرو اور احتیاط کو پیش نظر رکھ کر کسی قسم کے وسوسے کی پروا نہ کرو!

یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو صلح طلبی کو ایک بنیادی اصل کے طور پر حکومت اسلامی کے سپرد کرتی ہے اور اسے اس اصل پر عمل کرنے کی تاکید کرتی ہے اور یہ جو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیت، آیات جہاد کے ذریعے منسوخ ہو چکی ہے۔ [1]

فقط ایک خیال ہے، جس پر کوئی دلیل موجود نہیں چونکہ آیات جہاد اور اس آیت کے درمیان کوئی تضاد نہیں اور نسخ پر اعتقاد کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ تیسری آیت میں کفار کے ایک جنگجو گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

''اگر وہ (کفار) تم سے کنارہ گیری کر کے جنگ سے دستبردار ہو جائیں اور صلح کی تجویز پیش کریں تو خدا تمھیں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔''

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝۹۰

''خدا تعالیٰ نے ان کے خلاف تمہارے لئے کوئی راہ مقرر نہیں کی'' کے الفاظ سے تعبیر کرنا، دشمن کی طرف سے دعوت صلح کو قبول کرنے کی پوری تاکید ہے، ایسی صلح جو شرافت اور سچائی پر مبنی ہو نہ کہ ذلت اور جھوٹ پر۔

قابل توجہ یہ ہے کہ اس آیت کے شان نزول کے بارے میں ذکر ہوا ہے کہ یہ ''اشجع'' نامی گروہ کے بارے میں نازل ہوئی، جب ان میں سے کچھ لوگوں نے مسعود بن رجیلہ کی سرکردگی میں مدینہ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ رسول اکرمؐ نے اپنے کچھ نمائندے ان کی طرف بھیجے تاکہ ان کے سفر سے متعلق باخبر ہوں، انھوں نے کہا: ہم اس لئے آئے ہیں تاکہ محمدؐ کے ساتھ دشمنی ترک کرنے کا پیمان باندھیں (عہد کریں) (اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تمہارے جھگڑوں میں غیر جانبدار رہیں)، رسول اکرمؐ نے کافی مقدار میں کھجوریں ان کے لئے تحفہ کے طور پر لے جانے کا حکم دیا اور ان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کے پیمان پر آپؐ نے دستخط فرمائے۔

واضح ہے کہ آیت کا مفہوم ایک عمومی اور دائمی قانون پر مشتمل ہے اگر چہ شان نزول کوئی خاص واقعہ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ معلوم ہے کہ شان نزول آیات کے عام اور غیر محدود مفہوم کو خاص اور محدود نہیں کرتا۔ چوتھی آیت میں گفتگو ان جنگوں کے بارے میں ہے جو کبھی کبھار اسلامی مملکت کے اندر، دو مخالف گروہوں کے درمیان چھڑ جاتی ہیں یعنی مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں برسر پیکار ہو جائیں تو اس آیت کی رو سے تاکید ہے کہ ان کے درمیان صلح و صفائی کرائی جائے اور اگر صلح کے تمام راستے بند ہو جائیں تو باغی اور ظالم گروہ کے خلاف صلح

[1] تفسیر فخر رازی، ج۱۵ص۱۸۷۔

کی برقراری کے لئے جنگ کرنا واجب ہے۔اس ضمن میں ارشاد الٰہی ہے: جب کبھی اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں جنگ ونزاع کریں تو ان کے درمیان صلح برقرار کرو۔

وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: پس اگر ان دو میں سے ایک دوسرے پر تجاوز (ظلم) کرے تو ظالم گروہ کے خلاف قتال کرو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف لوٹ آئے۔

فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ

اور پھر آخر میں مسئلہ صلح کی طرف دوبارہ رجوع کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: پس اگر ظالم گروہ ظلم وجنگ سے باز آجائے تو ان دونوں کے درمیان عادلانہ انداز میں صلح برقرار کرو اور عدل وانصاف کو بروئے کار لاؤ کیونکہ خدا تعالیٰ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۝۹

آغاز آیت سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کے اندر صلح کی برقراری اور اختتام جنگ بھی ایک بنیادی قانون ہے کہ جس پر عمل کرانے کے لیے آخری کوشش کے طور پر جنگ تک کی جاسکتی ہے۔اور ذیل آیت سے بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ صلح کو عدل پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ ظلم اور ذلت پر، چونکہ غیر عادلانہ قسم کی صلح ہمیشہ متزلزل اور ناپائیدار ہوتی ہے اور اپنے اندر جنگی جراثیم کو پروان چڑھاتی ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ کہ اس آیت شریفہ میں کبھی عدل اور کبھی قسط کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔مفردات میں راغب اصفہانی کے بقول ''عدل'' ایک ایسا لفظ ہے جس سے مساوات کا مفہوم ملتا ہے اور ''قسط'' عادلانہ حصے اور نصیب کے معنی میں ہے (البتہ اگر یہ لفظ ''قسط'' ثلاثی مجرد کی صورت میں استعمال ہو تو دوسروں کا حصہ لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس سے ظلم کا معنی سمجھا جاتا ہے، اور کبھی باب افعال یعنی اقساط کی صورت میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو ان کا حصہ دے دینا اور اس صورت میں اس سے عدل وعدالت کا معنی مراد لیا جاتا ہے)

راغب کے اس بیان اور دیگر بیانات کی رو سے کلمہ ''قسط'' اور ''عدل'' معنی ومفہوم کے اعتبار سے یکساں ہیں، لیکن ممکن ہے کہ ان کے درمیان یہ فرق موجود ہو کہ لفظ ''قسط'' و ''اقساط'' ایسی صورت میں استعمال ہوتے ہیں کہ جب بہت سے لوگ ایک چیز میں شریک ہوں، اگر ہر ایک کا حصہ کامل طور پر اسے دے دیا جائے تو یہ عمل ''قسط'' ہے لیکن اگر بعض کو بعض پر ترجیح دی جائے، تو یہ ظلم وستم ہے۔لیکن عدالت کا مقابل ظلم ہے، یہ ایک وسیع تر مفہوم پر مشتمل ہے شرکت اور غیر شرکت کے ساتھ ساتھ دیگر صورتوں کے لئے بھی مستعمل ہے لہٰذا اگر کوئی مال کسی کا مسلم حق ہو اور وہ اسے دے دیا جائے تو عدالت اور اگر اسے نہ دیا جائے (یا اس سے اسے محروم کر دیا جائے) تو ظلم ہے۔[1]

[1] حقیقت میں ان دونوں کے درمیان عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔''قسط'' کا ایک خاص مفہوم ہے کہ جو صرف شرکت کی صورتوں پر مشتمل ہے جبکہ عدالت کا مفہوم وسیع تر ہے جو شرکت اور غیر شرکت دونوں پر مشتمل۔

پانچویں آیت میں ذاتی اور خصوصی اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ اگر مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان اختلاف رونما ہوجائے تو ان کے درمیان صلح کرادو، اس ضمن میں ارشاد ہے: اگر عورت (زوجہ) کو شوہر کی زیادتی، اس کی بے توجہی یا روگردانی کا خوف ہو تو ان کے آپس میں صلح کر لینے میں کوئی حرج اور مانع نہیں (اور ہر ایک صلح کی خاطر اپنے بعض حقوق سے چشم پوشی کرے) بعد ازاں اضافہ کرتا ہے کہ "صلح بہتر ہے" "وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ" درست ہے کہ اس جملے کا تعلق خاندانی اختلافات کی صورت کے ساتھ ہے، لیکن جملے کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

جو دو افراد، دو گروہوں، دو قوموں یا دو ملکوں کے باہمی اختلاف کو بھی شامل ہوسکتا ہے۔ (غور فرمائیں) قابل توجہ یہ ہے کہ ان آیات میں جو یکے بعد دیگرے ذکر کی گئی ہیں، صلح کی تین صورتوں پر تاکید کی گئی ہے: مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان ہونے والی صلح جس کے دشمن خواہاں ہوں۔ مسلمانوں کے بعض گروہوں کے درمیان ہونے والی جنگ کے خاتمے کے لئے صلح۔ اور ایسے دو افراد کے درمیان صلح جو باہم نزاع و اختلاف کا شکار ہوں۔ عادلانہ اور آبرومندانہ انداز میں واقع ہونے والی صلح بہرحال مطلوب ہے اور اسلام اس کی حمایت کرتا ہے۔ حکومت اسلامی کی ذمہ داری بھی یہی ہے کہ وہ تینوں مرحلوں میں صلح کے ستونوں کو مضبوط کرے!

چھٹی آیت جو براہ راست صلح کی طرف اشارہ تو نہیں کرتی لیکن ایک واضح پیام ضرور دیتی ہے کیونکہ یہ بعض منافقین کے بارے میں یوں کہتی ہے: (وہ ایک پرفریب اور پرکشش ظاہر کا مالک ہے لیکن) جب تم سے روگردانی کرتا (اور تمہارے پاس اٹھ کر چلا جاتا) ہے تو زمین پر فساد برپا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور زراعت کو اجاڑتا اور چوپایوں کو ہلاک کرتا ہے اور خدا تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الۡاَرۡضِ لِيُفۡسِدَ فِيۡهَا وَيُهۡلِكَ الۡحَـرۡثَ وَالنَّسۡلَ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الۡفَسَادَ۝۲۰۵

اور اس کے بعد والی اسی سورۂ بقرہ کی آیت میں اس قسم کے لوگوں کو جہنم کے سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ واضح ہے کہ جنگیں زمین پر فساد، مال و وسائل کی بربادی، زراعت اور مویشیوں کی تباہی کے علاوہ اور کیا دیتی ہیں، اسی وجہ سے اسلام کی نظر میں یہ (جنگیں) قابل نفرت ہیں اور جب تک جنگ کا حقیقی سبب پیدا نہ ہو اس وقت تک اس سے بہرطور گریز کرنا چاہیے، دوسرے الفاظ میں صلح ایک بنیادی قانون اور جنگ ایک استثنائی صورت ہے۔

نتیجہ

مجموعی طور پر مذکورہ بالا آیات سے بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ حکومت اسلامی صلح وصفائی اور دوستی کے ستونوں پر استوار ہے، اور قرآن میں یہ ایک معروف قانون کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ قانون اپنوں کے لئے بھی ہے اور اغیار کے لئے بھی یہاں تک کہ گھر کے افراد اور تمام عام افراد بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں بنابرایں اسلام اس وقت تک کسی کو جنگ کی اجازت نہیں دیتا جب تک یہ جنگ اس پر مسلط نہ کردی جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان جنگ کی آمادگی سے دستبردار ہوجائیں تاکہ ان کی خاموشی سے دشمن کی حوصلہ

افزائی ہواور وہ ان پرحملہ آور ہوجائیں اوراسی طرح یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ آیات، ذلت آمیزاور کمزور صلح کی تاکید کررہی ہیں کیونکہ یہ دونوں صورتیں جنگ کے عوامل واسباب میں سے ہیں اور عادلانہ صلح کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔

احادیث میں بھی انسانی معاشرے کے اندر صلح وسلامتی کی خاطر ہر قسم کی کوشش کوسراہا گیاہے اوراس کی تاکید کی گئی ہے یہاں تک کہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ

"اَجْرُ الْمُصْلِحِ بَیْنَ النّاسِ کَالْمُجاهِدِ فی سَبیلِ اللّٰهِ"

لوگوں کے درمیان صلح وصفائی کرانے والے کا اجروثواب راہ خدامیں جہاد کرنے والوں کے برابر ہے۔"

یعنی یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ راہ خدامیں جہاد کرنے والوں کا جواجر عظیم بیان ہوا ہے وہ صلح کرانے والوں کوشامل حال نہیں ہوگا، بلکہ صلح کرانے کی کوشش کرنے والے لوگ میدان جہاد میں مورچوں میں بیٹھے ہوئے مجاہدین کی طرح ہیں۔ایک اور حدیث شریف میں امیرالمؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:

"مِنْ کَمالِ السَّعادَةِ السَّعی فی صَلاحِ الْجُمْهُور"

"عوام الناس کی اصلاح کی کوشش کرنا خوش بختی سعادت کی انتہاہے۔"[1]

ممکن ہے کہ یہ حدیث ایک وسیع مفہوم کی حامل ہوجس کی وجہ سے ہر قسم کی معاشرتی صلاح کوشامل ہوجائے،لیکن اس کے جنگ کے مقابلے میں صلح پرمشتمل ہونے میں کوئی شک نہیں۔جناب مالک اشتر کودیئے گئے فرمان میں، جوحکومت اسلامی سے متعلق موضوعات کی بنیاد ہے، صلح کی طرف میلان (مائل ہونے) کے بارے میں کچھ اس طرح بیان ہوا ہے:

"وَلا تَدْفَعَنَّ صُلْحاً دَعاكَ اِلَیْهِ عَدُوُّكَ وَلِلّٰهِ فیهِ رِضیً فَاِنَّ فِی الصُّلْحِ دَعَةً لِجُنُودِكَ وَ راحَةً مِنْ هُمُومِكَ وَاَمْناً لِبِلادِكَ"

"وہ صلح جس کی تجویز دشمن کی طرف سے پیش کی جائے اور خدا کی رضا بھی اس میں ہو، اسے مت ٹھکرانا، کیونکہ یہ صلح تمہاری سپاہ کے آرام اورتجدید قوت اورتمہارے لئے غم واندوہ سے نجات اورتمہاری مملکت کے لئے امن وامان کا باعث ہے!"

اس مقام پر امام علیؑ نے صلح کے چار اہم فلسفے بیان فرمائے ہیں: لوگوں کے لئے امن وامان، لشکر کے لئے تازہ دم ہونے اوراپنی قوتوں کو یکجا کرنے کی فرصت اور ملک کے سربراہ کے لئے سکون اورراحت کا حصول۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ امامؑ کی نظر میں ہر صلح مفید نہیں بلکہ وہ صلح مفید ہے جوخدا کی رضا کی خاطر ہویعنی جومسلمانوں کی عزت وآبرو کا باعث اورعدل وانصاف کی وسعت واشاعت کا سبب ہو۔لیکن اس کے ساتھ ہی مالک اشتر کو یہ حکم بھی دیتے ہیں کہ صلح کے پیمان کے بعد دشمن پر کڑی نظر رکھی جائے کیونکہ بعض اوقات دشمن کا صلح

---

[1] غررالحکم (منقول از میزان الحکمۃ، ج۵،ص ۳۶۳)۔

سے مقصد غافل کرنا ہوتا ہے لہٰذا احتیاط اور دور اندیشی سے کام لیا جائے بلکہ یہاں حسن ظن بھی درست نہیں:

"وَلٰكِنَّ الْحَذَرَ مِنْ عَدُوِّكَ بَعْدَ صُلْحِهِ فَإِنَّ الْعَدُوَّ رُبَّمَا قَارَبَ لِيَتَغَفَّلَ فَخُذْ بِالْحَزْمِ وَاتَّهِمْ فِي ذٰلِكَ حُسْنَ الظَّنِّ"[1]

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

جنگی قیدی

اشارہ

ہمیشہ جنگوں میں کچھ لوگ قید ہو جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات سپاہی ایسے حالات میں گھر جاتے ہیں کہ جن کے باعث جنگ جاری رکھنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا مثلاً کبھی ان کا جنگی سامان یا راشن ختم ہو جاتا ہے یا وہ دشمن کے محاصرے میں آجاتے ہیں ایسی صورتحال میں ان کا جنگ جاری رکھنا خودکشی کے مترادف ہوتا ہے پس ایسے حالات میں وہ مجبوراً جنگ سے دستبردار ہو جاتے اور اپنی شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔عقل و منطق کا فیصلہ یہ ہے کہ ان اسیروں کو قتل نہ کیا جائے بلکہ انھیں میدان جنگ سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر زیر نگرانی رکھا جائے کیونکہ اس عمل سے دشمن کی بعض طاقت میدان جنگ سے خارج ہو جاتی ہے اس کے علاوہ ان کے ذریعے قیدیوں کے تبادلے کے طور پر اپنے قیدیوں کو دشمن کی قید سے چھڑایا جا سکتا ہے یا پیمان صلح کے وقت خصوصی مراعات حاصل کرنے، جنگ کے مزید جاری رہنے کو روکنے اور انھیں جیل میں ڈال کر دشمن پر نفسیاتی اثر ڈالنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ خونریزی کی آخر کوئی وجہ ہونی چاہیے لہذا جب دشمن اپنی شکست تسلیم کر لے تو اس صورت اس کا خون بہانے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ان وجوہات کے پیش نظر ہمیشہ جنگوں میں قیدی بنانے کا مسئلہ در پیش رہا ہے اور اسلام میں بھی جنگی قیدیوں کے بارے میں وسیع اور اہم احکام نظر آتے ہیں جن پر جنگی قیدیوں کے سلسلے میں عمل کرنا اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم دوبارہ قرآن کی طرف رجوع کر کے اس بارے میں قرآنی نقطۂ نظر سے آگاہی حاصل کرتے ہیں:

۱۔فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (محمد/۴)

۲۔مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۶۷﴾ (انفال۶۷)

۳۔يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۷۰﴾ (انفال۷۰)

ترجمہ:

۱۔جب میدان جنگ میں (حملہ آور) کفار کا سامنا کرو تو ان کی گردنیں مار دو (اور یہ کام جاری رکھو) یہاں تک کہ دشمن گھٹنے ٹیک دے، اس موقع پر اسیروں کو مضبوطی سے باندھ دو پھر یا تو ان پر احسان کرتے ہوئے

انھیں آزاد کردو یا ان سے ان کی آزادی کے بدلے میں فدیہ لو۔

۲۔ کسی نبی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ (دشمن) پر مکمل کامیابی حاصل کئے بغیر اسیر اور قیدی بنائے (اور زمین پر اپنے قدم مضبوط کرے) تم لوگ دنیا کی ناپائیدار متاع کے طالب ہو لیکن خدا تمہارے لئے آخرت کا خواہاں ہے اور خدا تعالیٰ قادر اور حکیم ہے!

۳۔ اے رسولؐ! جو قیدی تمہارے قبضے میں ہیں ان سے کہو: اگر خدا تمہارے دلوں میں کوئی خیر دریافت کرے (اور تمہاری نیتیں پاک ہوں) تو وہ جو تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں عطا کرے گا اور تمہیں بخش دے گا اور خدا تعالیٰ بخشندہ و مہربان ہے۔

تشریح:

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مخاطب اور ان کی قاطعیت اور استقامت کو لازم قرار دے کر فرماتا ہے: جب میدان جنگ میں تم کفار کا سامنا کرو تو پوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ کرو اور ان کی گردنیں کاٹ ڈالو؛

فَاِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ ؕ

واضح ہے کہ ''لقیتم'' میں ''لقاء'' جنگ کے معنی میں ہے نہ کہ اس سے مراد ہر قسم کی لقاء یعنی ملاقات ہے۔ آیت کا آخری حصہ جس میں جنگی قیدیوں کے بارے میں گفتگو ہے؛ اس بات کا بہترین شاہد ہے۔

اسلام میں جنگیں ہمیشہ مجبوری کی حالت میں کی جاتی ہیں؛ لہٰذا مذکورہ بالا حکم کا منطقی اور عقلی ہونا بالکل واضح ہے، اس لئے کہ اگر دشمن کے مقابلے میں طاقت پر مبنی اور قاطعانہ رویہ نہ اپنایا جائے تو شکست سے دچار ہونا یقینی ہو جاتا ہے، ہر انسان جو میدان جنگ میں دشمن کا سامنا کرتا ہے اگر دشمن پر کاری ضرب نہ لگائے تو گویا وہ اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کے بعد آیت مزید کہتی ہے: یہ کاری ضربیں اسی طرح لگاتار ہونی چاہیں یہاں تک کہ دشمن گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے۔ اور اس کے بعد قیدی بنانے کا موقع آجاتا ہے انھیں قید کر کے مضبوطی سے باندھ دیا جائے۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡہُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ ٭

بہت سارے مفسرین نے اس جملے کی تفسیر شدت و کثرت کے ساتھ دشمن کے قتل اور کشت و خون سے کی ہے، لیکن چونکہ یہ جملہ جو ''ثخن'' سے لیا گیا ہے جس کا مطلب سختی اور صلابت ہے، لہٰذا کہ اس سے مراد دشمن پر مکمل تسلط، واضح غلبہ اور آشکار کامیابی ہے، یعنی جنگ کو پوری قوت و طاقت کے ساتھ جاری رکھا جائے یہاں تک کہ دشمن مکمل طور پر مغلوب ہو جائے۔ (لہٰذا مقصد بہت زیادہ کشت خون اور قتل

وخونریزی نہیں بلکہ دشمن پر غلبہ حاصل کرنا ہے)۔

بہر حال مذکورہ بالا آیت ایک اہم جنگی حکم پر مشتمل ہے اور وہ یہ کہ دشمن کی شکست کے بغیر جنگ روکنا اور قیدی بنانا درست نہیں؛ کیونکہ ایسا عمل انجام دینا جنگ میں مسلمانوں کی حیثیت کو متزلزل کرنے کا باعث اور قیدیوں کے امور کی نگرانی اور انھیں محاذ جنگ کے پیچھے کسی مقام پر منتقل کرنے کا عمل مسلمانوں کے اصلی ہدف تک پہنچنے میں مانع بنے گا۔اس بات کی طرف توجہ رہے کہ ''شدوا الوَثاق'' میں ''وَثاق'' سے مراد رسی یا ہر وہ چیز ہے جس کے ساتھ کسی کو باندھا جائے اور یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ قیدیوں کو مضبوطی سے باندھ کر انھیں اپنی زیر نگرانی رکھنا لازم اور ضروری ہے تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر کاری ضرب لگا سکیں۔

اس کے بعد جنگی قیدیوں کا حکم بیان کرتے ہوئے یہ آیت کہتی ہے: یا تو ان پر احسان کر کے (عوض کے بغیر) رہا کردو یا ان سے فدیہ لے کر آزاد کردو! ''فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً''۔ یہاں مسلمانوں کو قیدیوں سے متعلق دو امور میں سے ایک کو اختیار کرنے کا حق دیا گیا ہے؛ بغیر کسی شرط کے رہا کرنا اور فدیہ لے کر آزاد کرنا، فدیہ سے مراد وہ جرمانہ ہے جو دشمن اپنے قیدیوں کی رہائی کے بدلے میں ادا کرتا ہے، درحقیقت یہ جرمانہ جنگ کے نتیجے میں ہونے والے بعض نقصانات کے بدلے میں ادا کیا جاتا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ فقہاء نے روایات کی پیروی میں جنگی قیدیوں سے متعلق ایک تیسری راہ کا بھی ذکر کیا ہے اور وہ قیدیوں کو غلام بنانا ہے، لیکن چونکہ قیدیوں کو غلام بنانے کا مسئلہ اس زمانے میں عام طور پر رائج تھا، آیت شریفہ میں اس کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں، شاید آیت میں اس حکم کو بیان نہ کرنے کی وجہ یہ ہو کہ ''غلامی'' جس کا ہم نے اپنے مقام پر تفصیلی ذکر کیا ہے، ایک خاص زمانے کا حکم تھا جو مخصوص حالات میں انجام دیا جاتا تھا، اور اس کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر یہ تھا کہ غلام رفتہ رفتہ آزاد ہو جائیں یہاں تک کہ مسئلہ غلامی کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہے، یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں فقط قیدیوں کی بلاشرط رہائی یا جرمانہ لے کر آزاد کرنے کی بات ہوئی ہے (دونوں طرف سے قیدیوں کا تبادلہ بھی اپنے قیدیوں کی رہائی کے مقابلے میں ایک قسم کا جرمانہ اور غرامت ہی ہے)۔

اسی طرح کتب فقہی میں ایک چوتھا حکم بھی قیدیوں کے بارے میں موجود ہے (اور وہ ہے قیدیوں کو قتل کرنا) اس کا بھی آیت شریفہ میں کوئی ذکر نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ قیدیوں کا قتل، قیدیوں کے بارے میں اصلی احکام میں سے کوئی حکم نہیں بلکہ یہ ایک استثناء ہے یعنی یہ ثانوی حکم سب قیدیوں کے لیے نہیں بلکہ ان قیدیوں کے بارے میں ہے جو خطرناک جنگی مجرم ہوں۔[1]

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت شریفہ کا حکم منسوخ نہیں ہوا اور اس کے منسوخ ہونے پر کوئی دلیل بھی ہمارے پاس نہیں اور اگر بعض احکام کا آیت شریفہ میں ذکر نہیں ہوا تو بہر حال اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔ دوسری آیت میں قیدی بنانے کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کسی نبی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی جگہ (پوزیشن) کو کافی حد تک مضبوط کئے بغیر (اور دشمن پر کاری ضرب لگا کر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کئے بغیر) کسی کو قیدی بنائے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ

''يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ''

---

[1] فخر رازی نے اس آیت کی تفسیر میں عدم قتل اور غلامی کے بارے میں جو گفتگو کی ہے وہ ہمارے بیان کے ساتھ قدرے مشابہ ہے: تفسیر فخر رازی، ج ۲۸ ص ۴۴

کے ساتھ تعبیر کرنے سے، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، بہت زیادہ کشت وخون مراد نہیں بلکہ "فِي الْأَرْضِ" کے پیش نظر مضبوط کرنا، دشمن پر کامل طور پر برتری حاصل کرنا اور علاقے پر مکمل تسلط حاصل کرنا ہے اور بالفرض اس سے مراد خونریزی ہو تو یہ اس وقت تک ہے جب تک دشمن اپنی شکست تسلیم نہیں کر لیتا۔

درحقیقت یہ تعبیر ذیل آیت میں مذکور بیان کے بالکل مشابہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے: ''حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اوزارَھا'' یہاں تک کہ جنگ اپنے بھاری بوجھ کو زمین پر رکھ دے۔ اور اس سے ہماری پیش کردہ تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو جنگی مقاصد کے حصول سے پہلے جنگی قیدی بنانے سے پرہیز کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض نومسلم حضرات کا بڑا مقصد جنگی قیدی بنانا ہوتا تھا، تاکہ وہ قیدی جب اپنی آزادی کا فدیہ ادا کریں تو اس مال میں سے انھیں بھی کچھ مل جائے اور یہ کام بعض اوقات اس بات کا سبب بنتا تھا کہ وہ جنگی خطرات سے چشم پوشی کریں اور غیر اہم مسائل کی طرف پوری طرح توجہ دیں جس کی وجہ سے اسلامی لشکر دشمن کی کاری ضرت کا نشانہ بن جائے، بالکل ویسے ہی جیسے جنگ احد میں مال غنیمت سمیٹنے کے نتیجے میں جو کچھ پیش آیا۔ لہٰذا ذیل آیت میں ارشاد الٰہی ہے:

''تم لوگ دنیا کے ناپائیدار مال ومتاع کے طلبگار ہو جبکہ خدا تعالیٰ تمہارے لئے آخرت کا خواہاں ہے اور خدا عزیز اور حکیم ہے۔''

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

ضمناً اس آیت سے یہ استفادہ بھی ہوتا ہے کہ جنگ میں قیدی بنانا نہ صرف رسول اکرمؐ کے زمانے میں بلکہ گذشتہ انبیاء کے زمانوں میں بھی رائج اور معمول رہا ہے البتہ اس آیت شریفہ میں تاکید کی گئی ہے کہ قیدی بنانے کا عمل سود جوئی اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہیں ہونا چاہیے بسا اوقات مسلمانوں کی مصلحت قیدیوں کو فدیہ لئے بغیر آزاد کر دینے میں ہوتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن بعد والی آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کرتا ہے جو جنگ کے اہم مقاصد کو اپنے ذاتی منافع پر قربان اور معاشرے کی اہم مصلحتوں کو خطرے میں ڈال دیتے، اس ضمن میں فرماتا ہے: اگر خدا کا سابقہ فرمان نہ ہوتا (کہ حجت کے بغیر کسی قوم کو سزا دے) تو اس چیز کی وجہ سے جو تم نے انجام دی ہے، (مال دنیا تک رسائی کی خاطر اسلامی ضوابط کے خلاف قیدی بنانے پر) تمھیں ضرور بڑی سزا ملتی۔ ان سارے بیانات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اولاً قیدی بنانے کا اقدام دشمن پر مکمل تسلط کے بعد ہو (اگرچہ یہ غلبہ کسی مخصوص جنگی محاذ پر ہی کیوں نہ ہو) ثانیاً یہ کہ قیدی بنانا کسی مادی فائدے یعنی فدیے وغیرہ کی خاطر نہ ہو، چونکہ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ انسانی ہمدردی اور مسلمانوں کی مصلحت کی خاطر انھیں فدیہ کے بغیر آزاد کرنا پڑتا ہے، اس قسم کی صورتحال میں وہ افراد جو مادی اہداف کی خاطر دشمنوں کو قید کرتے ہیں مشکل ہی سے اس حکم الٰہی کو تسلیم کرتے ہیں۔

موضوع بحث تیسری آیت میں قرآن مجید قیدیوں کو تسلی دیتا اور ان کی دلجوئی کرتا ہے، ایسی دلجوئی جو ان کی حیثیت کے احترام اور ان کے درد اور پریشانیوں سے آگاہی کی علامت ہے، فرماتا ہے: اے رسول! جو قیدی تمہاری زیر نگرانی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر خدا

تمھارے دل میں موجود کسی نیک امر سے آگاہ ہوجائے (یعنی اگر تمھاری نیت ٹھیک ہو) تو وہ تمھیں اس سے بہتر عطا کرے گا جو کچھ تم سے لے لیا گیا ہے اور اپنی مغفرت کو تمھارے شامل حال کرے گا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

پہلے جملے میں لفظ ''خَيْرًا'' اسلام، ایمان اور پیروی حق کی طرف اشارہ ہے اور جملہ دوم میں ''خَيْرًا'' سے مراد خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا ہونے والے وہ معنوی اور مادی ثواب ہیں جو خدا پر ایمان کے زیر سایہ انھیں نصیب ہوں گے اور یہ فدیئے کے عنوان سے ادا شدہ مال یا جس چیز سے وہ میدان جنگ میں محروم ہوئے ہیں، کی نسبت کئی گنا زیادہ ہیں۔ جملہ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ (اگر خدا جان لے) جیسا کہ کئی بار کہا جا چکا ہے۔ کا مطلب معلوم چیز کا عالم خارج میں موجود ہونا ہے، وگرنہ خدا ازل سے ہر چیز کو جانتا ہے اور اس کے علم میں کسی نئی چیز کا اضافہ ممکن نہیں، فقط معلومات ہیں جو وقت گذرنے کے ساتھ موجود ہوتی ہیں جیسے فلاں قیدی کے دل میں فلاں نیت کا پیدا ہونا۔

اس اجر و ثواب کے علاوہ قیدیوں کے بارے میں خدا کا ایک اور لطف ان کے ان گناہوں کی مغفرت ہے جو ایمان لانے کے بعد یقینی طور پر ان کی فکر کی بے چینی کا سبب اور روح کی اذیت کا باعث بن سکتے ہیں اور خدا کی مغفرت اس اذیت و بے چینی کے خاتمے کی ضامن ہے۔ یہ تھی ان آیات کی مختصر تفسیر جو قرآن مجید میں قیدیوں کے سلسلے میں بیان ہوئی ہیں۔

قیدیوں کے بارے میں احادیث

جنگی قیدیوں کے ساتھ مہربانی اور ان کے بارے میں اصول انسانی کی رعایت کے سلسلے میں ائمہ طاہرینؑ سے بکثرت احادیث نقل کی گئی ہیں جو اس ضمن میں اسلامی تعلیمات کی عظمت کو ظاہر کرتی ہیں۔

۱۔ جب عبدالرحمن بن ملجم نے جب امیر المؤمنین -کے سر اقدس پر تلوار کی ضرب لگائی اور اسے گرفتار کر لیا گیا تو آپؑ نے امام حسن -اور امام حسینؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اِحْبِسُوا هٰذَا الْاَسِيْرَ، وَاَطْعِمُوْهُ وَاسْقُوْهُ وَاَحْسِنُوْا اِسَارَهُ''

اس اسیر کو قیدی بنالو، اسے پانی سے سیراب اور غذا سے سیر کرو اور قید کے دوران اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔[1]

۲۔ امیر المؤمنین -سے ہی مروی ایک حدیث میں آپؑ نے فرمایا:

''اِطْعَامُ الْاَسِيْرِ وَالْاِحْسَانُ اِلَيْهِ حَقٌّ وَاجِبٌ وَاِنْ قَتَلْتَهُ مِنَ الْغَدِ!''

''قیدی کو کھانا کھلانا اور اس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرنا ایک واجب حق ہے اگرچہ وہ قتل کا مستحق ہو اور

---

[1] مستدرک الوسائل، ج ۲، ص ۲۵۷۔

تم اسے قتل ہی کیوں نہ کردو۔''[1]

یہ حکم ہر قسم کے قیدیوں کے لیے ہے چاہے وہ مومن ہوں یا کافر، لہٰذا امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک اور حدیث میں آپؑ نے صراحت کے ساتھ فرمایا:

"اِطْعامُ الْاَسیرِ حَق عَلٰی مَنْ اَسَرَهُ وَاِنْ کانَ یُرادُ مِنَ الْغَدِ قَتْلُهُ فَاِنَّهُ یُنْبَغی اَنْ یُطْعَمَ وَیُسقی وَیُرْفَقَ بِهِ کافِراً کانَ اَوْ غَیْرَهُ"

اسیر کو کھانا کھلانے اسیر کرنے والے پر ایک مسلم حق ہے اگر چہ اسے اگلے دن ہی قتل کر دے، یہاں بھی اس کا حق ہے کہ اسے کھانا پانی دیا جائے اور اس کے ساتھ نرمی برتی جائے خواہ مومن ہو یا کافر۔[2]

حضرت علیؑ کے قاتل ابن ملجم کی اسیری کی قید کے واقعے کے بارے میں کچھ اور روایات بھی ہیں جو حضرت علیؑ کی قیدیوں کے بارے میں (خواہ وہ جنگی قیدی ہوں یا غیر جنگی) انتہا درجے کی محبت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث میں ہے کہ: جب حضرت علیؑ بستر شہادت پر تھے تو آپؑ نے امام حسن مجتبیٰ -کو مخاطب کرکے فرمایا: میرے بیٹے! اپنے قیدی کے ساتھ نرم رویہ رکھنا، اس پر ترس کھانا اور اس کے ساتھ نیکی کرنا اور اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا۔ اسی اثنا میں آپؑ بیہوش ہوگئے، جب دوبارہ ہوش آیا تو امام حسن -نے دودھ سے بھرا ایک پیالہ آپؑ کی خدمت میں پیش کیا، آپؑ نے تھوڑا سا دودھ نوش کیا اور پیالے کو منہ سے ہٹالیا اور فرمایا: اسے اپنے قیدی کے لئے لے جاؤ، پھر مزید فرمایا:

"وَحَقّی عَلَیْكَ یابُنَیَّ! اِلاّ ما طَیَّبْتُمْ مَطْعَمَهُ وَ مَشْرَبَهُ وَارْفِقُوا بِهِ اِلی حینَ مَوْتی وَتَطْعِمُهُ مِمّا تَاْکُلَ وَتُسْقیه مِمّا تَشْرَبُ:"

''اے میرے بیٹے! میں تمہیں اپنے حق کی قسم دیتا ہوں کہ اس کے کھانے پینے کی اشیاء کو پاک و پاکیزہ رکھنا، اور میری موت واقع ہونے تک اس سے نرمی کرنا، جو خود کھاتے ہو اسے وہی کھلانا اور جو خود پیتے ہو اسے وہی پلانا۔''[3]

یہ نکتہ بھی قابل اہمیت ہے کہ قیدیوں کی رہائی کے بدلے جو غرامت (جرمانہ) ان سے وصول کی جائے وہ ان کے حال کے مناسب ہونی چاہیے، بالکل ویسے ہی جس طرح رسول اکرمؐ نے بدر کے جنگی قیدیوں کے سلسلے میں رعایت فرمائی، بلکہ ایک ثقافتی اور تمدنی عمل کے عوض بھی انھیں آزاد کیا جا سکتا ہے، چنانچہ تاریخ میں مذکور ہوا ہے کہ جنگ بدر کے بعد ایک اہم تاریخی اقدام کے طور پر رسول اکرمؐ نے

---

[1] وسائل، ج ۱۱، ص ۶۹۔

[2] وسائل، ج ۱۱، ص ۶۸۔

[3] مستدرک الوسائل، ج ۳، ص ۲۵۸، حدیث ۴، چاپ قدیم۔

اعلان فرمایا کہ اسیروں میں جو لوگ پڑھے لکھے ہیں وہ مسلمانوں کے دس بچوں کو پڑھانے لکھانے کے بدلے میں آزاد کر دیئے جائیں گے۔[1] یہ سب اس وقت ہوا کہ بعض دیگر قیدیوں نے اپنی آزادی کے لئے چار چار ہزار درہم ادا کئے تھے اور محتاج و نادار افراد کو فدیہ لئے بغیر آزاد کر دیا گیا تھا۔

---

[1] سیرۂ حلبی، ج۲، ص ۱۹۳۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کا باہمی تعلق

حکومت اسلامی اور مذہبی اقلیتیں

اشارہ

اسلامی حکومت سے متعلق بعض اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ اس کے طرز عمل اور رویئے کا مسئلہ ہے؟ لیکن یہ مخصوص صورتحال مسئلے کی پیچیدگی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے دو سبب ہیں: پہلا سبب بہت سارے افراد کی اسلامی تعلیمات اور قوانین اسلام سے نا آگاہی اور بے بنیاد تعصّبات کے چنگل میں اسیر ہونا ہے اور دوسرا یہ کہ دشمن کا اپنے غلط پروپیگنڈے اور تبلیغ کے ذریعے اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو آئین اسلام سے دور کرنا ہے، چونکہ اسے معلوم ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اس قدر کشش اور جاذبیت ہے کہ اگر دوسرے ادیان کے ماننے والے ان سے آگاہ ہو جائیں تو وہ بہت جلد ان سے اثر قبول کرلیں گے۔

اسی وجہ سے دشمنان اسلام ہمیشہ انھیں (اپنے ہم عقیدہ افراد کو) مسلمانوں سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ دوستانہ روش کے ساتھ پیش آتا ہے اور انھیں آپس میں مل جل کر صلح وصفائی کی زندگی گزارنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی وضاحت آئندہ صفحات میں آئے گی۔ اس اشارے کے بعد اب ہم دوبارہ قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور پہلے آیات کا تذکرہ اور اس کے بعد ان روایات کی تفسیر میں نقل ہونے والی روایات پیش کی جائیں گی۔

۱۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (ممتحنہ/ ۸و۹)

۲۔ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰي يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (توبہ/ ۲۹)

۳۔ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ ڰ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰـهُنَا وَاِلٰـهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

(عنکبوت/۴٦)

۴۔ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ (آل عمران/ ٦۴)

۵۔ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ (مائدہ/ ۸۲)

ترجمہ:

۱۔ خدا تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور عدالت کرنے سے منع نہیں کرتا جو دین کے معاملے میں تمہارے ساتھ برسر پیکار نہیں اور جنھوں نے تمہیں تمہارے گھروں اور دیار سے باہر نہیں نکالا، کیونکہ خدا عدالت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں فقط ان لوگوں کے ساتھ دوستی سے منع کرتا ہے جنھوں نے امر دین میں تمہارے ساتھ جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال باہر کیا، یا تمہیں تمہارے گھروں سے نکالنے میں مدد کی، ایسے لوگوں کی دوستی اختیار نہ کرو اور جو کوئی بھی ان کے ساتھ دوستی رکھتا ہے ظالم اور ستمگر ہے۔

۲۔ اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے ساتھ قتال کرو جو نہ خدا پر یقین رکھتے ہیں نہ روز جزا پر، اور نہ وہ خدا و رسولؐ کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے اور نہ ہی دین حق کو قبول کرتے ہیں (یہ حکم قتال اس وقت تک ہے) جب تک وہ برضا و رغبت سر تسلیم خم کر کے اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا نہیں کرتے۔

۳۔ اہل کتاب کے ساتھ سوائے اچھی روش کے مجادلہ نہ کرو مگر ان میں سے وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا ہے اور ان سے کہہ دو کہ ہم ان تمام باتوں پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر اور تم پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اس کے سامنے مکمل طور پر خاضع ہیں اور ہمارا سر تسلیم خم ہے۔

۴۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب آؤ اس بات پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدائے یکتا و واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کا کوئی شریک نہ قرار دیں اور ہم سے بعض دوسرے

بعض لوگوں کو خدا کی حیثیت نہ دیں اور اگر وہ (اس دعوت سے) روگردانی کریں تو کہو کہ گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں (اور خدا کے حضور میں ہماری جبین نیاز خم ہے)۔

۵۔ یقینا یہودیوں اور مشرکوں کو تم اہل ایمان کا سخت ترین دشمن پاؤ گے اور انھیں اہل ایمان کا نزدیک ترین دوست پاؤ گے جو یہ کہتے ہیں کہ "ہم نصاریٰ ہیں" یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں عالم اور تارک دنیا افراد ہیں اور وہ حق کے مقابلے میں تکبر اور بڑے پن کا اظہار نہیں کرتے۔

تشریح:

سابقہ آیات مسلمانوں کو دشمنان خدا کی دوستی سے بچنے کی تلقین، اہل ایمان اور رسول اکرمؐ کے ساتھ ان کی کینہ توزی اور زبان اور ہاتھ سے بے گناہ مسلمانوں کو اذیتیں دینے کے تذکرے پر مشتمل ہیں جبکہ اس پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: خدا تمھیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے اور عدالت کے ساتھ پیش آنے سے منع نہیں کرتا جنھوں نے نہ تو دین کے معاملے میں تمھارے ساتھ جنگ کی ہے اور نہ ہی تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے، کیونکہ خدا عدالت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ

اس کے بعد اللہ تعالی بیشتر تاکید کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: خدا تعالیٰ تمھیں فقط ان لوگوں کی دوستی سے منع کرتا ہے جنھوں نے دین کے معاملے میں تمھارے ساتھ جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے یا گھروں سے باہر کرنے میں مدد فراہم کی ہے ان کے ساتھ دوستی کو اور جو بھی انھیں دوست رکھے ظالم ہے؛

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑨

ان دو آیات اور ان سے قبل سورۂ ممتحنہ کی آیات کے شان نزول اور ان آیات میں موجود قرائن کو دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیات مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ناظر ہیں اور انھیں دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہیں:

وہ گروہ جس کے افراد مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو اذیتیں دیں اور ہر قسم کی عہد شکنی کے مرتکب ہوئے جبکہ دوسرے گروہ کے افراد مسلمانوں کے ساتھ صلح اور مسالمت آمیز زندگی گذارنے پر آمادہ تھے۔ ان آیات میں گروہ اول کے افراد کے ساتھ محبت اور دوستی کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا ہے جبکہ گروہ دوم کی نسبت دوستی کی اجازت دی گی ہے، اور جو لوگ گروہ اول کے ساتھ دوستی قائم کرتے ہیں، انھیں ظالم جبکہ گروہ دوم کے ساتھ دوستانہ مراسم بڑھانے والوں کو صاحب عدالت کہا گیا ہے۔ جب مشرکوں

اور بت پرستوں کے بارے میں حکم خدا ایسا ہو تو یہ حکم اہل کتاب کے کفار کے لئے بطریق اولیٰ ثابت ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں مذکورہ حکم کو منسوخ اور آیت ۵ سورۂ توبہ کو اس کا ناسخ قرار دیا ہے:

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ آیت، سورۂ توبہ کی بقیہ آیات کی شہادت کے باعث ان عہد شکن مشرکوں سے تعلق رکھتی ہے جو مسلمانوں کے خلاف علانیہ دشمنی اور مخالفت پر کمر بستہ تھے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہوئی بلکہ سورۂ توبہ کی آیات کا تعلق پہلے گروہ کے ساتھ ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت سے متعلق یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر کی طلاق یافتہ بیوی مکہ سے اپنی بیٹی ''اسماء'' کے لئے کچھ تحائف لے کر مدینہ آئی اور چونکہ اس وقت اس کی ماں مشرکہ تھی لہٰذا اسماء نے انھیں قبول کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اپنی ماں کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت بھی نہ دی، مذکورہ بالا آیت شریفہ نازل ہوئی اور رسول اکرمؐ نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنی ماں کے ہدیے کو قبول کر لے اور اس کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ پیش آئے۔[1]

بہر حال ان آیات سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے بارے میں ایک عمومی قانون کا پتہ چلتا ہے جو کسی خاص زمان و مکان میں محدود نہیں اور وہ یہ کہ مسلمان' اسلام کے خلاف عدم قیام اور اسلام کے دشمنوں کو مدد فراہم نہ کرنے والے ہر فرد، گروہ، جماعت یا ملک کی نسبت ذمہ دار ہیں کہ ان کے ساتھ صلح وصفائی اور مسالمت کی راہ اختیار کریں چاہے وہ لوگ مشرک ہوں یا اہل کتاب۔ یہاں تک کہ اگر کوئی جماعت یا ملک دشمنوں کی صف میں ہو اور اپنا طرز عمل تبدیل کر لیں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ انھیں بحیثیت دوست قبول کر لیں اور ان کے ساتھ دشمنی کو ترک کر دیں، البتہ اس روش کا معیار ان کا موجودہ رویہ ہے۔

''جزیہ'' کی حقیقت

دوسری آیت میں کہ جو سورۂ توبہ کا حصہ ہے، مشرکوں اور بت پرستوں کی نسبت ضروری احکام کے بیان کے بعد اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے بارے میں گفتگو ہے؛ آیہ شریفہ کہتی ہے: اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو خدا اور روز جزا پر ایمان نہیں رکھتے، خدا اور رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے اور نہ ہی دین حق کو مانتے ہیں، قتال کرو یہاں تک کہ وہ برضا و رغبت اپنے ہاتھوں سے ''جزیہ'' ادا کر دیں۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿٢٩﴾

[1] روح البیان، ج ۹، ص ۴۸۱، یہ روایت بہت ساری کتب تفسیر اور صحیح بخاری میں بھی لفظی اختلافات کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

یقیناً اہل کتاب کے بارے میں آیت شریفہ کا لہجہ سخت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب بالخصوص ''یہود'' کا رویہ اسلام کی نسبت بہت سخت تھا، یہ لوگ جنگ احزاب اور بعض دوسری جنگوں میں دوسرے دشمنوں کے ہم آواز اور ہم فکر بن گئے، اس کے علاوہ بعض جنگوں مثلاً جنگ خیبر میں انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی اور یہی نہیں بلکہ رسول اکرمؐ کے قتل کا منصوبہ بھی بنایا اور مشرکین کے لئے جاسوسی کا کام بھی کرتے تھے۔

اس بات کے پیش نظر کہ مذکورہ بالا آیت سورۂ توبہ کی آیات میں سے ہے اور سورۂ توبہ ہجرت کے نویں سال نازل ہوئی، اس وقت اسلامی غزوات ختم ہو چکی تھیں اور لازم تھا کہ اسلام اپنا لائحہ عمل تمام مخالفین کے سامنے واضح کردے۔

سب سے پہلے مشرکین کو خبردار کیا گیا کہ وہ اپنی حیثیت واضح کریں، عہد شکن افراد کے مقابلے میں اعلان جہاد کیا مگر یہ کہ وہ اپنی شکست تسلیم کرلیں اور جو لوگ اپنے عہد کے پابند تھے ان کی نسبت قرارداد کے اختتام تک عہد کی پابندی اور اس کے ساتھ وفاداری کو قائم رکھا (اس مطلب کی جھلک اس سورہ کی ابتدائی آیات میں نظر آتی ہے)۔ اس کے بعد قرآن مجید، موضوع بحث آیت میں مشرکوں کے ساتھ ہمیشہ تعاون کرنے والے اہل کتاب کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے ان کی تین صفات بیان کرتا ہے:

پہلی صفت ان کی یہ ہے کہ وہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز جزا پر ''لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ'' درست ہے کہ یہود و نصاریٰ بظاہر خدا اور روز آخرت کو قبول کرتے تھے لیکن درحقیقت انھوں نے انھیں خرافات کے ساتھ آلودہ کر دیا تھا، توحید سے منحرف ہو کر تثلیث اور شرک کی راہ اپنائی اور ''معاد'' یعنی دوبارہ زندہ ہونے کو روحانی زندگی سمجھنے لگے اور اہم بات یہ کہ ان کے اعمال میں مبداء (خدا) اور معاد کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی اور وہ طرح طرح کے گناہوں سے آلودہ ہو چکے تھے کہ گویا مبداء و معاد پر ان کا ایمان ہی نہ تھا۔ دوسری صفت ان کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ حرام الٰہی کو حرام نہیں سمجھتے تھے۔ ''وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ''

ان کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ محرمات سے اجتناب نہیں کرتے تھے اور ایسے گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے جو تمام آسمانی شریعتوں میں حرام قرار دیئے گئے تھے اور ان کے ہاں دین خدا بظاہر آداب و رسوم کی صورت اختیار کر چکا تھا (بالکل ایسے ہی جیسے آج کل دین ان کے ہاں ایک ذاتی اور نجی مسئلہ سمجھا جاتا ہے جو فقط ہفتہ وار دعاؤں اور بعض اخلاقی مسائل تک محدود سمجھا جاتا ہے؛ جن کی کوئی جھلک ان کی اجتماعی زندگی میں نظر نہیں آتی مثال کے طور پر صہیونی اپنے فوائد و منافع تک رسائی حاصل کرنے میں ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے)۔ ان کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ دین حق کو بالکل تسلیم نہیں کرتے۔ ''وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ'' کیونکہ انھوں نے دین کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا اور اسے بنیادی اور انسانی مسائل سے بالکل خارج کر کے خرافات کا مجموعہ بنا دیا تھا۔

یہ تین اوصاف درحقیقت ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں اور یہی وہ اوصاف تھے جو انھیں اسلام کے مقابلے اور انواع واقسام کی عہد شکنی کی طرف دعوت دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آیت کے آخر میں ان کے سامنے صلح و آشتی کی ایک راہ کھولتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: ''حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ'' یہاں تک کہ وہ جزیہ (فی کس کے حساب سے ٹیکس) کو خاضعانہ انداز میں ادا کریں۔

راغب ''مفردات'' میں کہتے ہیں: ''جزیہ'' وہ چیز ہے جو ان اہل ذمہ (غیر مسلموں) سے لیا جاتا ہے جو اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کرتے ہیں اور جزیہ کو جزیہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس جزا کی مانند ہے جو اس لئے ادا کی جاتی ہے کہ اس کے بدلے میں ان کی جان و مال محفوظ رہے۔ کتاب التحقیق میں ذکر کیا گیا ہے کہ جزیہ، جزا اور بدلے کے معنی میں ہے اور یہ وہی مال ہے جو غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے۔ بہر حال ''جزیہ'' کی اصل جزاء وہی ہے اس وجہ سے کہ جو رقم وہ جزیہ کے طور پر ادا کرتے ہیں وہ مفت اور بلا عوض ہوتی بلکہ اسلامی حکومت اس کے مقابلے میں ذمہ دار ہوتی ہے کہ ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کا دفاع کرے اور انھیں مکمل امن و امان کا ماحول فراہم کرے۔

بعض کے نزدیک ''جزیہ'' کا مادہ ''جزء'' ہے اس لئے کہ جزیہ عام طور پر مال کی ایک کم مقدار ہوتی ہے جو سالانہ ہر فرد کے حساب سے ادا کی جاتی ہے۔ عَنۡ یَدٍ (یعنی اپنے ہاتھ سے) اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جزیہ کو ہر شخص بذات خود ادا کرے اور ادائیگی کے لئے کسی کو وکیل مقرر نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن بعض حضرات معتقد ہیں کہ یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جزیہ کو نقد صورت میں ادا کیا جانا چاہیے۔ اس بنا پر ادائیگی کے لئے وکیل منتخب کیا جا سکتا ہے لیکن جزیہ کی رقم کو نقد ہونا چاہیے نہ کہ ادھار، یا یہ کہ مراد یہ ہے کہ جزیہ فقط امیر لوگوں سے وصول کیا جائے اور محتاج و نادار افراد پر یہ اسلامی ٹیکس معاف ہے۔ ان تین معانی میں سے جو معنی بھی صحیح ہو اصل مسئلہ میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی اگر چہ تینوں معنوں کو جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

رہی بات ''صَاغِرُون'' کی تو اس کی غیر مناسب تفسیریں کی گئی ہیں؛ یہ لفظ ''صِغَر'' سے مشتق و ماخوذ ہے جس کا مطلب عاجزی اور (بڑائی کے مقابلے میں) خود کو چھوٹا ظاہر کرنا (چھوٹے پن کا اظہار کرنا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ''جزیے'' کی ادائیگی اسلام، مسلمین اور قوانین اسلام کے احترام کو ملحوظ رکھ کر کی جائے، بالفاظ دیگر جزیہ کی ادائیگی اس بات کی علامت ہے کہ ایک سالم اور محترم اقلیت، ایک محترم اکثریت کی حیثیت کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ صلح و مسالمت آمیز فضا میں رہنا چاہتی ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے اس کی تفسیر اصل کتاب کے ساتھ مذاق اور ان کی توہین و تحقیر سے کی یہ چیز کلمہ ''صَاغرین'' کے لغوی مفہوم سے اخذ نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ (تفسیر) اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے اور نہ ان احکام کے ساتھ کوئی مناسبت رکھتی ہے جو اقلیتوں کے ساتھ طرز عمل کے بارے میں ہم تک پہنچے ہیں، درحقیقت اس تفسیر میں اپنی خاص ذہنیت اور طرز فکر کو آیت پر مسلط کیا گیا ہے۔

یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت کے اس جملے کے بارے میں جو نزاع، بعض حضرات نے برپا کیا ہے اور اسے (جزیے کو) انسانی مسائل اور مسالمت آمیز باہمی زندگی کے خلاف قرار دیا ہے، ایک بے بنیاد چیز ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جزیہ عام طور پر مال کی ایک بہت کم مقدار پر مشتمل رہا ہے جو اس ذمہ داری کے بدلے میں ادا کیا جاتا تھا کہ مسلمان اہل ذمہ کی جان و مال کی حفاظت کریں اور بعض روایات کے مطابق بعض اوقات اس کی مقدار تقریباً ایک دینار سالانہ تھی! یہاں تک کہ جو لوگ اس مقدار کی ادائیگی کی بھی استطاعت نہیں رکھتے تھے انھیں معاف کر دیا جاتا تھا (اس سے قبل کہا جا چکا ہے کہ بعض حضرات نے عَنۡ یَدٍ کا یہ مطلب لیا تھا)۔

بحث و گفتگو میں بہترین روش کا انتخاب

تیسری آیت مسلمانوں کی اہل کتاب کے ساتھ گفتگو کے بارے میں ہے جو تاکید کرتی ہے کہ ان کے ساتھ بہترین طرز گفتگو کو اختیار کیا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے: اہل کتاب کے ساتھ سب سے بہتر انداز میں کلام کرو۔"وَلاَ تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلاَّ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" یہ ایک عمومی، جامع اور اساسی مفہوم ہے۔"جدال" دراصل رسی بٹنے اور اسے مضبوط کرنے کے معنی میں ہے اور جب دو افراد آپس میں بحث کرتے ہیں تو ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ دوسرے کو اس کے عقیدے سے پھیر کر رکھ دے اس عمل کو مجادلہ کہا جاتا ہے، یہاں اس سے مراد منطقی اور عقلی بحث و گفتگو ہے۔ جملہ "بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" (اس روش کے مطابق جو بہترین ہو) سے کیا مراد ہے؟

اس بارے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کے ساتھ نرمی، ملائمت اور محبت کا سلوک کیا جائے، یعنی روکھے پن کے مقابلے میں نرم، غیظ و غضب کے مقابلے میں بردباری، شرارت کے مقابلے میں خیر خواہی اور عجلت کے مقابلے میں سکون و اطمینان کا مظاہرہ کیا جائے۔ بہر حال یہ ایک بہت جامع تعبیر ہے جو باہمی بحث مباحثے کے تمام طریقوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے، چاہے وہ (بحث) الفاظ میں ہو یا مضمون کلام میں، چاہے گفتگو کے انداز میں ہو یا دوسری حرکات میں، بنابرایں جملے کا مفہوم کچھ اس طرح ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ مؤدبانہ گفتگو کی جائے، کلام کا لہجہ دوستانہ اور کلام کا مضمون منطقی اور دلیل پر مبنی، آواز میں چیخ اور ہنگامہ خیزی کا عنصر نہ ہو اور ہاتھ، آنکھ اور آبرو کی حرکات جو بیان کو کامل کرتی ہیں، اسی انداز اور اسی روش کے مطابق انجام پانی چاہئیں۔

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ بحث و گفتگو کا مقصد برتری حاصل کرنا اور غالب آنا نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ آپ کو بات، مخاطب کی روح کی گہرائیوں میں جاگزین ہو جائے اور وہ مخاطب اسلام کے متعلق صحیح موقف اختیار کرے اور جان لے کہ روح اسلام روح صلح جوئی ہے، بہر حال آیت شریفہ کا یہ جملہ مسلمانوں کو تاکید کرتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ ان کا سلوک صلح جویانہ اور مسالمت آمیز ہونا چاہیے۔ البتہ یہ سارے امور اس طرح انجام دیئے جائیں کہ ان میں ناتوانی کی آمیزش نہ ہو اور وہ (اہل کتاب) ان سے سوء استفادہ نہ کر سکیں۔ فقط ایک گروہ کو اس حکم سے استثناء کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: مگر وہ لوگ جو ظلم و ستم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

"إِلاَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ" اور یہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو صلح آمیز باہمی زندگی نہیں گذارنا چاہتے تھے اور محبت اور نرمی سے سوء استفادہ کرتے تھے، وہ لوگ جو حق کے ساتھ عناد اور دشمنی رکھتے تھے اور اس کے باوجود کہ انھوں نے رسول اکرمؐ کی نشانیاں اپنی کتابوں میں پڑھ رکھی تھیں، انھیں چھپانے کی کوشش کرتے تھے، ان کی کیفیت یہ تھی کہ نہ حالت جنگ میں تھے نہ حالت صلح میں، نہ دوستی نہ باہمی زندگی جس میں محبت اور احترام ہو، یقیناً ایسے اشخاص اس حکم سے مستثنیٰ ہونے ہی چاہئیں۔

آیت کے تسلسل میں مزید پرکشش جملے بھی ذکر ہوئے ہیں: ان سے کہہ دیں ہم اس سب پر جو خدا کی طرف سے ہم پر یا تم پر نازل ہوا ہے ایمان رکھتے ہیں، ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہماری جبین نیاز اسی کے آگے جھکی ہوئی ہے۔

وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ

مُسْلِمُوْنَ۝۴۶

درحقیقت یہ ''بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ'' کے ساتھ مجادلہ کرنے کا ایک واضح نمونہ ہے یعنی قرآن مجید نے اس بارے میں فقط کلیات اور عمومات کے ذکر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے واضح مصادیق اور روشن مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ضمناً یہ جملہ اس بات کی بھی ترجمانی کرتا ہے کہ صلح جو اور مسالمت آمیز باہمی زندگی کے ستونوں کو مضبوط کرنے کے لئے مشترکہ پہلوؤں پر اعتماد ہونا چاہیے مثلاً خدائے واحد اور تمام کتب آسمانی وغیرہ پر ایمان۔

لیکن مشترکہ پہلوؤں پر زور اور تاکید کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان ان کی بدعات کو قبول کرلیں اور اپنے دین سے دستبردار ہو جائیں اور شاید ''وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ'' اسی مطلب کی طرف ایک لطیف اشارہ ہو۔ امام جعفر صادق ؑ کی ایک حدیث میں آپؑ نے ''مجادلۂ احسن'' کا ایک نمونہ بتاتے ہوئے فرمایا: ''سورۂ یاسین کے آخری حصے کو ملاحظہ کرو، تم دیکھو گے کہ کس طرح مختلف طریقوں سے شیریں مگر محکم اور منطقی دلیل پر مبنی انداز میں منکرین معاد کو جواب دیا گیا ہے۔''[1]

اس آیت کا مضمون ایک دوسری شکل میں سورۂ نحل میں بھی آیا ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ

اپنے پروردگار کی طرف حکمت (علم و منطق) اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ دعوت دو اور ان (مخالفین) کے ساتھ احسن طریقے سے بحث و گفتگو کرو۔[2]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت ان دس اخلاقی احکام میں سے پہلے حکم پر مشتمل ہے جو اس سورہ میں مخالفین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں بیان ہوئے ہیں۔ درحقیقت جملہ اول یعنی ''اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ'' عقلی استدلال کی طرف ناظر ہے یعنی اہل استدلال و فکر و نظر کے ساتھ عقلی استدلال کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اور ''وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ'' کی تعبیر عاطفی اور جذباتی ابحاث کی طرف اشارہ ہے اور یہ طریقہ ان لوگوں کے ساتھ اختیار کیا جانا چاہیے جو کچھ زیادہ اہل استدلال نہیں ہوتے بلکہ جذباتی مسائل سے سروکار رکھتے ہیں۔ خاص طور پر ''حسنہ'' کو ''موعظہ'' کی صفت قرار دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گفتگو سختی، مخاطب کی تحقیر و تذلیل اور اس پر غلبے کے جذبے اور اسے ضد بازی پر اکسانے والے عوامل سے پاک ہونی چاہیے، واضح ہے کہ اس قسم کا موعظہ دلوں پر اثر کرتا ہے۔ اور ''مجادلۂ احسن'' کے ساتھ ایسے لوگوں سے پیش آیا جائے جن کا ذہن غلط غیر درست مسائل کا انبار بنا ہوا ہے اس لئے ضروری ہے کہ صحیح مناظرہ کے ذریعے ان کے ذہن کو صاف کیا جائے تاکہ وہ حق کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوسکیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۴، ص ۱۶۳ (سے اقتباس) ذیل آیت موضوع بحث۔

[2] سورۂ نحل / ۱۲۵

ایک مشترک بنیادی اُصول کی دعوت

چوتھی آیت میں اہل کتاب سے خطاب کرکے قرآن انھیں مشترکہ مسائل یعنی توحیداوراس کے فروع کی طرف دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: کہواے اہل کتاب آؤاس بات کی طرف جو ہمارے اورتمہارے درمیان مشترک ہے اوروہ یہ کہ خدائے واحد کے سواکسی کی عبادت نہ کریں اورکسی کواس کا شریک نہ جانیں اورہم میں سے بعض دوسروں کواللہ کےعلاوہ اپنے ارباب قرارنہ دیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

اورآخر میں مزیداضافہ فرماتا ہے: اگروہ اس دعوت سے روگردانی اورانحراف کریں تو یہ کہیں کہ گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔(اورہم توحیدی راستے پرگامزن ہیں)۔

مشترکہ مسئلہ کی طرف دعوت دینا دومختلف مذاہب کے پیروکارافراد کے لئے مل جل کرزندگی گذارنے کا بہترین طریقہ ہے، کیونکہ عموماً کسی مذہب سے منسلک افرادکو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنے تمام عقائدکوچھوڑکردوسروں کے تابع ہوجاؤ، اگرچہ یہ بات منطقی توہو سکتی ہے لیکن عملی نہیں، پس بہتر یہی ہے کہ اگر دوسرے ادیان کو ماننے والے اسلام کی حقانیت کے دلائل سے آگاہ ہوکربھی اس کی طرف مائل نہیں ہوتے تو انھیں ان کے عقائدسمیت ان کے حال پرچھوڑدیں اورمشترکہ امورمیں تعاون جاری رکھیں اورتمام آسمانی ادیان کے درمیان مشترک امرخداکی ذات وصفات میں اس کی توحید ہی ہے۔

یہاں تک کہ تثلیت کے طرفدارمسئلہ تثلیت کی اس طرح تفسیرکرتے ہیں کہ وہ خداکی وحدانیت کے ساتھ سازگارہوجائے اور اسے "تثلیت میں وحدت" کا نام دیتے ہیں (توجہ رہے کہ تثلیت یعنی خداؤں کاعقیدہ عیسائی علماء کی تصریح کے مطابق حضرت عیسیٰ -اور ان کے بعدکی ایک سوسال تک موجودنہیں تھااورکئی اسباب کے باعث بعدمیں پیداہواہے) اگرچہ "عقیدہ تثلیت" واضح تناقض اورتضاد کا حامل ہےلیکن اسےتوحید کےساتھ سازگارکرنے کی کوشش اس بات کی دلیل ہے کہ وہ (اہل تثلیت) اصل توحید کے وفادارہیں۔

درحقیقت صلح آمیز باہمی زندگی کی دعوت اورمشترکہ پہلوؤں پراعتماد "مجادلہ احسن" کی ایک واضح مثال ہے جوسابقہ آیت میں بیان ہواتھااوریہ اس بات کی ترجمانی بھی کرتا ہے کہ اسلام ہرگزنہیں چاہتا کہ دوسرے مذاہب کی پیروی کرنے والوں کوجبراً دین اسلام میں کھینچ لائے۔دلچسپ یہ ہے کہ ہجرت کے ساتویں سال (صلح حدیبیہ کے بعد) رسول اکرمؐ نے دنیا کی عظیم حکومتوں کے سربراہوں کے نام خطوط لکھے اورانھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی؛ ان سربراہوں میں مصرکا سربراہ "مقوقس"، روم کا بادشاہ "ہرقل" اورایران کا فرمانروا "کسریٰ" شامل تھے، آپؐ نے ان خطوط کے نیچے مذکورہ بالاآیت کی طرف اشارہ فرمایا، مقصد یہ تھا کہ کم ازکم ادیان آسمانی کوایک دوسرے سے ملانے والے حلقۂ زنجیریعنی اصل توحید پرسب کواتفاق ہوناچاہیے تاکہ اس طرح ایک دوسرے کےساتھ تعاون اورمل جل کررہنے کی راہ ہموارہو۔

یہ بات اسلام کی صلح طلبی اور مسالمت آمیز فضا میں دوسرے ادیان آسمانی کے پیروؤں کے ساتھ مل جل کر زندگی گذارنے کی ایک علامت ہے کہ جس کی جڑیں رسول اکرمؐ کے مبارک زمانے تک پہنچی ہیں (یعنی اس قرآنی فرمان کو نافذ کرنے کی داغ بیل آپؐ نے ہی ڈالی تھی)۔

پانچویں اور آخری آیت میں قرآن مجید دوسرے ادیان کی پیروی کرنے والوں کے مختلف موقف کی طرف اشارہ اور ہر ایک کے متعلق اس کے حال کے مطابق گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہود اور مشرکین کو مومنین کا بدترین دشمن، لیکن وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں انھیں اہل ایمان کا نزدیک ترین دوست پاؤ گے؛

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰی ؕ

اس کے بعد نصاریٰ کی دوستی کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کرتا ہے: کیونکہ ان کے درمیان قسیسین (علماء) اور تارک دنیا افراد موجود ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے؛

ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

یہ الفاظ بخوبی ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام ان لوگوں کی نسبت جو دشمنی کی راہ نہیں اپناتے فقط ان کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ انھیں مسلمانوں کے بہترین دوست کی حیثیت سے متعارف کراتا ہے اور ان کے بزرگان کو علم و دانش، ترک دنیا اور عدم تکبر کے باعث قابل تعریف و ستائش قرار دیتا ہے اور اس طرح کھلے دل کے ساتھ ان کا استقبال کرتا ہے جو دوستی کے خواہاں ہیں اور اسلام ان کے بزرگوں کی قدر و قیمت کا قائل ہے، اور اگر یہودیوں کے خلاف رسول اکرمؐ کے دور میں مختلف موقف اور طرز عمل رہا ہے تو یہ یہودیوں کے ساتھ دشمنی کی خاطر نہیں تھا بلکہ اس کا سبب ان کی عہد شکنی، عداوت اور عرب کے وحشیوں کے ساتھ ان کا تعاون تھا، یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں یہود اور مشرکین کو ایک ساتھ اور ایک جیسا قرار دیا گیا ہے لیکن عیسائیوں کے ساتھ غالباً مسلمانوں کے اچھے مراسم تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ عیسائی تین خداؤں یعنی تثلیث کے عقیدے کی وجہ سے مسلمانوں سے یہودیوں کی نسبت کافی دور تھے جو (یہود) صراحت کے ساتھ توحید کو مانتے تھے لیکن چونکہ عمل کے اعتبار سے یہودی، نصاریٰ کے برعکس مسلمانوں سے قلبی عداوت رکھتے تھے، لہٰذا اسلام نے عیسائیوں کے ساتھ صلح آمیز باہمی زندگی کی طرف زیادہ توجہ دی ہے، افسوسناک بات یہ ہے کہ آج بھی وہی حالت ہے یعنی یہود ہر جگہ اسلام اور مسلمین کے خلاف عہد شکنی کرتے اور دشمنی رکھتے ہیں لیکن عیسائیوں میں ایسے افراد یا حکومتیں ہیں جن کے اہل اسلام کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے مجموعی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام وسعت قلبی اور بزرگواری کے ساتھ دوسرے آسمانی مذاہب کے ساتھ حسن سلوک اور باہمی زندگی (بشرطیکہ یہ سب کچھ صلح و صفائی، دوستی اور ایک دوسرے کے احترام کی بنیاد پر قائم ہو) کو قبول کرتا ہے اور مسلمانوں کو ذمہ دار بناتا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ اچھا طرز عمل اختیار کریں اور آپس میں بحث مباحثہ میں بھی ادب، منطق اور انصاف کو ملحوظ رکھیں اور اس طریقے سے دوسروں کی دین اسلام کی طرف راہنمائی کریں اس کے برعکس روکھے پن تلخ و طنز آمیز گفتگو، شدت اور نامناسب سلوک سے اجتناب کریں۔

دیگر اہل مذاہب کے ساتھ باہمی زندگی کے بارے میں احادیث

احادیث وروایات میں بھی اس سلسلے میں بہت سے نکات نظر آتے ہیں:

۱۔حضرت علی -، مالک اشتر کو دیئے گئے فرمان میں فرماتے ہیں:

وَاَشْعِرْ قَلْبَكَ الرَّحْمَةَ لِلرَّعِيَّةِ وَالْمَحَبَّةَ لَهُمْ وَاللُّطْفَ بِهِمْ وَلاتَكُونَنَّ عَلَيْهِمْ سَبُعاً ضارِياً تَغْتَنِمُ اَكْلَهُمْ، فَاِنَّهُمْ صِنْفانِ، اِمّا اَخٌ لَكَ فِي الدِّينِ اَوْنَظيرٌ لَكَ فِي الْخَلْقِ:

(اے مالک!) اپنے دل کو اپنی رعایا کے ساتھ رحمت، محبت اور لطف (کے جذبات) سے سرشار کرو اور ایک درندے کی طرح مت بنو کہ انھیں ہڑپ کر لینے کو غنیمت جانو، اس لئے کہ رعایا دو قسم کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے، بعض افراد تمہارے دینی بھائی ہیں جبکہ بعض دوسرے (غیر مسلم) تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں۔[1]

غیر مسلموں کے ساتھ دوستانہ انداز میں مل جل کر رہنے کے بارے میں اس سے بڑھ کر واضح اور سچے الفاظ نہیں ہیں، امام علیؑ نے اس فرمان میں محبت، نرمی اور لطف ورحمت کو اسلامی حکومت کے سربراہ کی ذمہ داری قرار دی ہے اس سے معاشرے کے افراد کی ایک دوسرے کے مقابلے میں ذمہ داری واضح ہوجاتی ہے۔

۲۔ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؑ ایک دفعہ ایک کافر ذمی کے ہمسفر تھے، ذمی نے آنحضرتؑ سے پوچھا: آپ کہاں جانے کا قصد رکھتے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: کوفہ، جب وہ ذمی شخص ایک دوراہے پر آپؑ سے جدا ہوا؛ آپؑ بھی اسی کے ہمراہ چل پڑے، ذمی نے کہا: کیا آپؑ کوفہ جانے کا قصد نہیں رکھتے؟! آپؑ نے فرمایا: ہاں کیوں نہیں؛ اس نے عرض کیا: پس آپؑ نے راہ کوفہ کو کیوں چھوڑ دیا؟ آپؑ نے فرمایا: میں نے جان بوجھ کر ایسے کیا ہے! اس نے عرض کیا: اگر آپؑ جانتے تھے تو پھر آپؑ نے ایسا کیوں کیا؟ تو جواباً آپؑ نے فرمایا:

هذامِنْ تَمامِ حُسْنِ الصُّحْبَةِ اَنْ يُشَيِّعَ الرَّجُلُ صاحِبَهُ هُنَيْئَةً اِذا فارَقَهُ، وَ كَذلِكَ اَمَرنانَبِيُّنا!:

''حسن صحبت ومعاشرت کا کمال یہ ہے کہ جب انسان سے اس کا ہم سفر جدا ہونے لگے تو اسے رخصت کرنے کے لئے تھوڑا سا اس کے ساتھ چلے، ہمارے رسولؐ نے ہمیں یہی حکم دیا ہے۔'' ذمی نے تعجب کے ساتھ پوچھا: کیا سچ مچ ایسے ہی ہے؟! امامؑ نے فرمایا: ہاں؛ ذمی نے کہا: جو لوگ آپؑ کی پیروی کرتے ہیں یہ انہی کے

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

عظیم اخلاق وافعال کا نتیجہ ہے، پس میں گواہی دیتا ہوں کہ میں آپ لوگوں کے دین پر ہوں![1]

۳۔رسول اکرمؐ نے ایک حدیث میں فرمایا:

مَنْ ظَلَمَ مُعاهَداً وَ كَلَّفَهُ فَوْقَ طاقَتِهِ فَأَنا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيامَةِ

جوکوئی کسی غیر مسلم ذمی شخص پر ظلم کرے یا اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لے تو قیامت کے دن اس کا حساب میں خود چکاؤں گا اور اس کے حق کا مطالبہ کروں گا۔[2]

۴۔ایک اور حدیث جو ابو یوسف کی کتاب خراج میں بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ''حکیم بن حزام'' نے دیکھا کہ ''عیاض بن غنم'' نے اہل ذمہ میں سے بعض افراد کو جزیہ نہ ادا کرنے کی پاداش کے طور پر دھوپ میں کھڑا کر رکھا تھا اور ان پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ ''حکیم'' نے کہا: اے عیاض! یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

''اِنَّ الَّذين يُعَذِّبُونَ النّاسَ فِي الدُّنيا يُعَذّبُونَ فِي الآخِرَةِ''

یعنی: ''جو افراد لوگوں کو دنیا میں عذاب سے دوچار کرتے ہیں خدا تعالیٰ انھیں آخرت کے عذاب میں مبتلا کرے گا۔''[3]

یہ مسئلہ مسلمانوں میں اس قدر معروف تھا کہ ''عمر بن عبدالعزیز'' سے نقل کرتے ہیں کہ اس کے ایک گورنر ''علی بن ارطاۃ'' نامی نے اس کی طرف لکھا: میرے پاس چند ایسے افراد ہیں جنھیں اگر اذیت نہ پہنچاؤں تو وہ خراج ادا نہیں کریں گے، جواب میں عمر بن عبدالعزیز نے اس کی طرف لکھا: یہ بات سچ مچ بہت عجیب ہے کہ تم مجھ سے انسانوں کو عذاب دینے کی اجازت طلب کر رہے ہو؟ گویا میں عذاب الٰہی کے مقابلے میں تمہاری سپر (ڈھال) ہوں، گویا میری رضامندی اور اجازت تمہیں عذاب الٰہی سے بچالے گی (اگر تمہارا یہی خیال ہے تو سخت غلطی کا ارتکاب کر رہے ہو) جب میرا خط تم تک پہنچے تو جو کوئی اپنی مرضی سے خراج ادا کرتا ہے ادا کرے ورنہ وہ قسم کھا کر کہے (کہ میں خراج کی ادائیگی کی طاقت نہیں رکھتا اور اسی قسم پر قناعت کرلو) اس کے بعد مزید کہا: خدا کی قسم میں قیامت کے دن اس حال میں خدا سے ملاقات کروں کہ وہ حق بیت المال کو ادا نہ کر کے جرم کے مرتکب ہوئے ہوں یہ میرے لئے اس کی نسبت زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے کہ میں خدا سے اس حال میں ملوں کہ میں نے انھیں عذاب اور اذیتوں کا نشانہ بنایا ہو![4]

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں اس حدیث میں ''آزار و اذیت'' (عذاب) کی بات کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خراج

---

[1] بحارالانوار، ج ۱۴، ص ۵۳۔
[2] فتوح البلدان بلاذری، ص ۱۶۷۔
[3] الخراج، ص ۱۲۴۔
[4] الخراج، ص ۱۱۹۔

دینے والوں کا تعلق غیر مسلم افراد سے تھا۔ یہی مضمون ایک اور حدیث میں بھی آیا ہے جس میں عنوان ''ناس'' پر تکیہ کیا گیا ہے، ''سعید بن زید'' نے جب دیکھا کہ کچھ لوگ جزیہ ادا نہ کرنے کے باعث اذیت کا نشانہ بنائے جا رہے ہیں تو کہا: میں نے رسول اکرمؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے مَنْ عَذَّابَ النّاسَ عَذَّبَہُ اللہُ: کہ جو شخص لوگوں کو اذیت کرتا اور عذاب میں مبتلا کرتا ہے خدا اسے عذاب میں مبتلا کرے گا۔[۱]

۵۔ نہج البلاغہ کے خطبہ جہاد میں اس بات کو ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ بَلَغَنِی اَنَّ الرَّجُلَ مِنْهُمْ كانَ يَدْخُلُ عَلَى الْمَرْئَةِ الْمُسْلِمَةِ وَالاُخْرى الْمُعاهَدَةِ فَيَنتَزِعَ حِجْلَها وَ قُلْبَها وَ قَلائِدَها وَ رُعُثَها ما تَمْتَنِعُ مِنْهُ اِلاَّ بِالاِسْتِرْجاعِ وَالاِسْتِرْحامِ... فَلَو اَنَّ اِمْرَءً مُسْلِماً ماتَ مِنْ هذا اَسَفاً ما كانَ بِه مَلُوماً، بَلْ كانَ بِهِ عِنْدِی جَدِيراً:

''جب حضرت علیؑ کو یہ خبر ملی کہ معاویہ کے غارت گر لشکر نے سرحدی شہر ''انبار'' پر حملہ کر کے آپؑ کے مقرر کردہ عامل ''حسان بن حسان'' کو قتل کر دیا اور مسلمانوں کا مال و متاع لوٹ لیا ہے تو آپؑ نے لوگوں کو جہاد کی دعوت دی اور جہاد سے متعلق معروف خطبہ پڑھا، خطبے کے دوران آپؑ نے یوں ارشاد فرمایا: مجھے خبر ملی ہے کہ (لشکر معاویہ کے) بعض افراد مسلمان اور غیر مسلم عورتوں کے گھروں پر ٹوٹ پڑے، وہ غیر مسلم عورتیں جو ذمی تھیں (اور جن کی جان و مال اور ناموس مسلمانوں کی پناہ میں تھے) ان کی پازیب، کنگن، گلوبند اور گوشوارے چھین لئے حالانکہ ان کے پاس اپنے دفاع کے لئے سوائے درخواست رحم اور آنسو بہانے کے کوئی اور ذریعہ نہ تھا، اگر اس وحشت ناک حادثے کے بعد کوئی مسلمان شخص غم و اندوہ اور افسوس کے باعث مر جائے تو وہ قابل ملامت نہیں بلکہ میری نظر میں اسے مر ہی جانا چاہیے۔''[۲]

یہاں امامؑ نے دفاع کے لازم ہونے میں ذمی عورتوں کو مسلمان عورتوں کے برابر قرار دیا ہے اور ان کے مال کی لوٹ کھسوٹ سے اس قدر رنجیدہ اور غمگین ہوئے ہیں کہ فرماتے ہیں: اگر کوئی یہ خبر سن کر غم و غصہ اور حزن و ملال کے باعث مر جائے تو وہ کسی سرزنش کے لائق نہیں! اہل ذمہ کی حیثیت جان و مال اور عزت و آبرو کے دفاع کے بارے میں اس سے بہتر اور واضح سلوک کی مثال نہیں ملتی۔

۶۔ ایک حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے دور خلافت میں ایک نابینا شخص کو دیکھا جو گلیوں میں بھیک مانگ رہا تھا اور لوگوں سے مدد کی درخواست کر رہا تھا، آپؑ کو تعجب ہوا کہ اسلامی حکومت میں ایسا منظر کیوں دیکھنے میں آیا ہے۔ جب لوگوں سے اس ماجرا کے بارے میں آپؑ نے پوچھا تو انھوں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین - یہ ایک عیسائی ہے جس کی مدد کرنے سے لوگ گریز کرتے ہیں،

---

[۱] الخراج، ص ۱۲۴ و ۱۲۵۔

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷۔

علیؑ نہایت غمگین ہوئے اور فرمایا:

"اِسۡتَعۡمَلۡتُمُوۡهُ حَتّٰى اِذَا كَبُرَ وَ عَجَزَ مَنَعۡتُمُوۡهُ؟ اَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِ مِنۡ بَيۡتِ الۡمَالِ"

جب یہ شخص مضبوط اور تنومند تھا تو تم لوگوں نے اس کی طاقت سے فائدہ اٹھایا اب جب کہ وہ بوڑھا اور ناتواں ہوگیا ہے اس کو تم نے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے؟! (یہ انسانیت، اخلاق اور مروت کے خلاف ہے!) آپؑ نے مزید فرمایا: مسلمانوں کے بیت المال سے اس پر خرچ کرو (یعنی اس کی تنخواہ مقرر کرو)۔[1]

مسلمانوں کا غیر ذمی افراد کے ساتھ طرز عمل

بسا اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم فقط دو قسموں پر مشتمل ہیں؛ "اہل ذمہ" اور "محاربین" یعنی وہ لوگ جنھوں نے مسلمانوں کے ہمراہ صلح کے ساتھ رہنے کا عہد و پیمان کیا ہے اور وہ لوگ جو مسلمانوں کے خلاف حالت جنگ میں ہیں، اس لحاظ سے جو کوئی اہل ذمہ نہیں اس کا تعلق محاربین کے گروہ سے ہے اور اس کی جان و مال کا کوئی احترام نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلم افراد کے چار گروہ ہیں کیونکہ مذکورہ بالا دو اقسام کے علاوہ "معاھد" اور "مہادن" بھی غیر مسلم ہیں۔ "معاھد" یعنی (وہ غیر مسلم جن کا مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان ہوتا ہے اگر چہ وہ اسلامی حکومت کے حدود سے باہر ہوں اور اقلیت نہ سمجھے جاتے ہوں) اور "مہادن" جو نہ اقلیت ہیں اور نہ معاہد اور جو نہ مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان کی حالت میں ہیں نہ حالت جنگ میں بلکہ جداگانہ طور پر مسلمانوں سے علیحدہ اپنے ملک میں زندگی بسر کرتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے کسی مزاحمت کا باعث نہیں بنتے۔ آج کی دنیا میں ان چار گروہوں کی واضح مثالیں موجود ہیں:

۱۔ وہ اقلیتیں جو اسلامی ممالک کے اندر رہتی اور ان کے قوانین کی پابندی کرتی ہیں حکومت اسلامی ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنے کی پابند ہے اور ان کے حقوق کا دفاع کرتی ہے، وہ حکومت اسلامی کو جو ٹیکس دیتی ہیں انھیں ٹیکس کے بجائے جزیہ قرار دیا جاسکتا ہے جیسے کہا جا چکا ہے کہ جزیہ، جزاء سے اخذ ہوا ہے اور یہ وہ چیز (ٹیکس) ہے جسے اسلامی حکومت ان کے دفاع کے اخراجات کے طور پر ان سے وصول کرتی ہے، یہی لوگ ذمی یا اہل ذمہ ہیں۔

۲۔ بعض ممالک جیسے اسرائیل اور امریکہ جو موجودہ حالات میں مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں اور مسلمانوں کے خلاف کسی عہد شکنی اور ضرر رسانی سے دریغ نہیں کرتے، یہی کافر حربی ہیں جن کی نسبت مسلمان کسی عہد کے پابند نہیں۔

۳۔ کچھ غیر اسلامی ممالک ایسے بھی ہیں جن کے مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں اور ان کے ساتھ اہل اسلام کے سفارتی روابط بھی قائم ہیں اور کبھی ان کے ساتھ تجارتی، اقتصادی اور ثقافتی معاہدے بھی تشکیل دیئے جاتے ہیں یا اقوام متحدہ کے ذریعہ اہل اسلام اور ان کے درمیان بالواسطہ معاہدے ہوتے ہیں یہ سب "معاھد" کی مثالیں ہیں اور ضروری ہے کہ ان کے ساتھ براہ راست یا اقوام متحدہ کی وساطت سے کئے گئے معاہدوں کے مطابق عمل درآمد ہو اور ان معاہدوں کا احترام کیا جائے بہت سارے یورپی اور ایشیائی غیر مسلم ممالک کا

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۴۹ (باب۱۹ از ابواب جہاد العدو)۔

اس ضمن میں نام لیا جاسکتا ہے۔

۴۔ممکن ہے کہ کچھ ایسے غیر اسلامی ممالک بھی ہوں جو اسلامی حکومت کے ساتھ نہ حالت جنگ میں سے ہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ ان کا کوئی معاہدہ ہے، اور نہ ہی سفارتی تعلقات قائم ہیں لیکن نہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی مزاحمت کرتے ہیں اور نہ مسلمان ان کے ساتھ، ایسے ممالک کے لوگوں کے ساتھ بھی اہل اسلام کو انسانی اور اخلاقی اصولوں کے تحت پیش آنا چاہیے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اہل ذمہ فقط وہ اہل کتاب ہیں جو اسلامی ممالک میں زندگی گزارتے ہیں اور احکام جزیہ یا علانیہ طور پر گناہان کبیرہ کے ارتکاب سے اجتناب جیسے احکام کا تعلق ''اہل ذمہ'' سے ہے اور وہ اہل کتاب جو اپنے ممالک میں رہتے ہیں اہل ذمہ نہیں کہلاتے اگرچہ مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی معاہدہ ہی کیوں نہ ہو، یہ لوگ بعض اوقات ''معاہد'' اور کبھی ''محارب'' اور کبھی ''مہادن'' ہوتے ہیں۔(غور فرمائیں)

حکومت اسلامی اور انٹیلی جنس ادارے

اشارہ

بلاشبہ تجسس کرنا اور لوگوں کے پوشیدہ اسرار کی ٹوہ لگانا ایک قابل مذمت اور ناپسندیدہ فعل ہے، خدا تعالیٰ ''ستار العیوب'' یعنی: عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے اور اس کے بندوں کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے مگر وہ لوگ جو پردہ دری کریں، شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ دیں اور علانیہ طور پر گناہوں کا ارتکاب کریں تو ان کا احترام ختم ہو جاتا ہے بلکہ وہ خود اپنے احترام کے خاتمے کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن مجید نے سورۂ حجرات میں واضح طور پر اس موضوع کو بیان کیا ہے اور اس ضمن میں فرمایا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ

اے صاحبان ایمان بہت سی بدگمانیوں سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں اور ہرگز دوسروں کے امور کے بارے میں تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی دوسرے شخص کی غیبت نہ کرے۔ [۱]

اس مقام پر تین عظیم گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے: ''بدگمانی''، ''تجسس'' اور ''غیبت'' اور ان تینوں گناہوں میں سے ہر گناہ درحقیقت کسی دوسرے گناہ کا مقدمہ اور سبب ہے، بعض اشخاص کے بارے میں سوءظن (بدگمانی) کے باعث ان کے بارے میں تجسس بھی کیا جاتا ہے اور تجسس اس بات کا سبب بنتا ہے کہ ان کے عیوب اور خطاؤں کے بارے میں آگاہی حاصل ہو جائے اور لوگوں کے عیوب وخطا سے آگاہی کے باعث ایک دوسرے کی غیبت کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ غیبت جو بہت ہی بڑا گناہ اور کینہ وعداوت اور تفرقے بے اعتمادی کا سرچشمہ ہے۔ اصولی طور پر اسلامی نقطۂ نظر سے ہر شخص کی عزت وآبرو اس کا اہم سرمایہ ہے جو کئی وجوہات کی بنیاد پر اس کے جان مال سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ الدِّرْهَمَ يُصيبَهُ الرَّجُلُ مِنَ الرِّبا اَعْظَمُ عِنْدَ اللهِ فِي الْخَطِيئَةِ مِنْ سِتَّ وَثَلاثِينَ زِنْيَةٍ يَزْنِيها الرَّجُلُ، وَارْبَى الرِّبا عِرضُ الرَّجلِ الْمُسْلِمِ"

''ایک درہم جسے کوئی شخص سود کے ذریعے کماتا ہے اس کا گناہ کسی شخص کے چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بالاتر ہے اور ہر سودی گناہ سے بڑھ کر گناہ کسی مسلمان کی آبرو (کو ضائع کرنا) ہے۔'' [۲]

---

[۱] (سورۂ حجرات ۱۲)

[۲] المحجۃ البیضاء، ج۵، ص ۲۵۳۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرے میں کسی شخص کی عزت وآبرو اُس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اوراس کے مقابلے میں دوسری چیزیں (مال ودولت وغیرہ) ناچیز شمار کی جاتی ہیں؛ بلاشبہ بدگمانی، تجسس اور غیبت اس نہایت قیمتی سرمائے (آبرو) کوخطرے میں ڈال دیتی یا اس کی تباہی اور بربادی کا باعث بنتی ہیں۔لیکن اس صورتحال کے باوجود ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ اگر حسن ظن اور خوش گمانی کی خاطر تجسس نہ کیا جائے اور پوشیدہ رازوں سے پردہ نہ ہٹایا جائے تو اسلامی معاشرے کو کئی خطرات کا سامنا ہوسکتا ہے، چاہے یہ خطرہ داخلی منافقوں کی سازش کا ہو یا بیرونی دشمنوں کا کوئی منحوس سازشی منصوبہ ہو جسے وہ ملک میں موجود اپنے ایجنٹوں کے ذریعے عملی شکل دینا چاہتے ہیں۔

ایسے موقعوں پر حسن ظن کو ایک طرف رکھ کر سوءظن کے ساتھ معاملے کا جائزہ لینا چاہیے اور اہم اور اعلیٰ مقاصد کی حفاظت کی خاطر تجسس اور جاسوسی پر عمل درآمد ہونا چاہیے اور یہی سراغرسانی اور جاسوسی کے نظام اور محکمے کی تشکیل کا فلسفہ اور مقصد ہے، یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جسے عقل اور شرع کی تائید حاصل ہے، اگرچہ دنیا پرست افراد اور خودغرض استکباری حکومتیں اس سے غلط فائدہ اٹھاتی رہی اور اٹھا رہی ہیں، لیکن ان کا یہ غلط فائدہ اٹھانا اس موضوع کی اہمیت کو کم نہیں کرتا اور اس کے ضروری ہونے سے انکار کا باعث نہیں بنتا چونکہ کون سا مقدس قانون ہے کہ جس سے سوءاستفادہ نہیں کیا گیا؟!

مختصر یہ کہ لوگوں کی نجی زندگی اور دیگر امور میں تجسس نہ کرنا ایک اصل (قانون) ہے جس کی حفاظت ہونی چاہیے لیکن خاص مواقع پر تجسس مستثنیٰ ہے جس پر حدود وشرائط کی پابندی کے ساتھ ایک الٰہی ذمہ داری کے عنوان سے عمل ہونا چاہیے۔درحقیقت اس استثناء میں مہم اور اہم کے قانون کی رعایت کی گئی ہے اور اس کی حیثیت ثانوی قانون کی سی ہے۔لوگوں کی عزت وآبرو کی حفاظت بہت اہمیت کی حامل ہے لیکن اسلامی معاشرے، نظام حکومت اور امن وامان کی برقراری اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔یہی وجہ ہے کہ خاص معاملات میں پہلا حکم دوسرے حکم پر فدا ہوجاتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ دوسروں کے معاملات میں تجسس ہمیشہ ایک اطمینان بخش دلیل کی بنا پر جائز ہے اور بغیر دلیل کے لوگوں کے معاملات کی جاسوسی کرنا جائز نہیں۔مذکورہ بیان اسلامی معاشرے کے داخلی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔

اسلامی معاشرے سے باہر یہ مسئلہ زیادہ واضح اور روشن ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ غیر اسلامی معاشروں میں پیش آنے والی صورت احوال سے باخبر ہوں چونکہ ممکن اس کا تعلق مسلمانوں کی تقدیر کے ساتھ بھی ہو، انھیں چاہیے کہ وہ سازشوں سے ابتداء ہی میں باخبر ہوکر ان کا خاتمہ کردیں، اور دیر سے ان کے بارے میں آگاہی کی صورت میں ممکن ہے کہ ان کے خاتمے پر قادر نہ ہوں یا اس کی انھیں بھاری قیمت چکانی پڑے! حکومت اسلامی (اور دنیا کی ساری حکومتوں) میں تجسس (جاسوسی) کی ایک اور قسم بھی رائج ہے اور وہ ہے اسلامی (اور غیر اسلامی) حکومتی عہدیداروں کی کارگردگی پر نگرانی، اور یہ اس لئے ہوتی ہے تاکہ اطمینان حاصل ہوجائے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں بطور احسن انجام دے رہے ہیں اور لوگوں کے حق میں کسی ظلم وستم کے مرتکب تو نہیں ہو رہے اور اپنے عہدے سے سوءاستفادہ تو نہیں کر رہے۔

بہرحال قرآنی آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ تجسس اور جاسوسی کا مسئلہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی موجود تھا اور دشمن اسلام طاقتوں کی جاسوسی کے مقابلے میں رسول اکرمؐ نے بھی جاسوسی کا ایک نظام قائم کیا تھا تاکہ اس کے ذریعے دشمنوں کی جاسوسی پر مبنی

سرگرمیوں کو بے اثر بنایا جا سکے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۴۷ میں قرآن مجید مسلمانوں کو منافقین کی جاسوسی پر مبنی سرگرمیوں کی نگرانی کے بارے میں ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: اگر وہ (منافقین) تمہارے ہمراہ (تبوک کے میدان جنگ کی طرف) چلے جاتے تو تمہیں اضطراب اور پریشانی کے علاوہ کچھ نہ دیتے اور بہت تیزی کے ساتھ تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کرتے اور تمہاری صفوں میں ان کے جاسوس موجود ہیں اور خداوند ظالموں سے آگاہ ہے۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ [1]

ممکن ہے کہ سَمّاع سے مراد جاسوس ہو یا وہ شخص مراد ہو جس کی سماعت بہت تیز ہو، لیکن پہلی صورت آیت کے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ ادھر تنبیہ اور ہوشیاری کی تلقین ہے جب کہ اس سے پہلے والی چند آیات میں رسول اکرمؐ کو منافقین کو پہچاننے کا حکم ملتا ہے، ارشاد الٰہی ہے: خدا تعالیٰ نے تمہیں بخش دیا، تم نے انھیں میدان جہاد میں شرکت سے اجتناب کی اجازت کیوں دی تاکہ سچ کہنے والوں اور جھوٹ بولنے والوں کے درمیان تمیز ہو جائے؟

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ [2]

حاطب اور سارہ کے جاسوسی کا قصہ

فتح مکہ سے قریبی ایام میں پیش آنے والے ''حاطب بن ابی بلتعہ'' کے واقعے سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے جاسوسی کے خلاف ایک مضبوط نظام تشکیل دے رکھا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب رسول اکرمؐ فتح مکہ کے لئے آمادہ ہو چکے اور مدینہ میں اس کی کامیابی کی اسباب فراہم کر لئے تو اب آپؐ کی بھر پور کوشش تھی کہ یہ خبریں مکہ میں نہ پہنچیں، اسی اثناء میں ایک مسلمان ''حاطب بن ابی بلتعہ'' جو جنگ بدر اور بیعت رضوان میں شرکت کر چکا تھا؛ شیطانی وسوسے کا شکار ہو گیا اور اس نے سوچا ممکن ہے مشرکین مکہ، مکہ میں موجود اس کے بے سرپرست خاندان کو مشکلات کا نشانہ بنائیں، لہٰذا اس نے چاہا کہ وہ مشرکین کی مدد کرے تاکہ وہ اس کے اہل خانہ کے لئے کوئی مزاحمت اور مشکل نہ پیدا کریں!

مکہ میں رہنے والی ''سارہ'' نامی ایک عورت مدینہ آئی ہوئی تھی اور اب واپس مکہ جانا چاہتی تھی، حاطب نے اہل مکہ کے نام ایک خط لکھا، اور اسے سارہ کے حوالے کیا اور اسے دس دینار یا دس درہم بھی دیئے تاکہ وہ یہ خط مشرکین مکہ تک پہنچا دے، خط کی عبارت یہ تھی:

''رسول اکرمؐ تمہاری طرف آنا چاہتے ہیں اپنے دفاع کی تیاری کر رکھو!''

---

[1] (توبہ/۴۷) اَوْضَعُوا مادہ ایضاع سے ماخوذ اور سرعت کے ساتھ چلنے کے معنی میں ہے اور یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ منافقین بہت جلد سادہ لوح مسلمانوں کے درمیان فتنہ، تفرقہ اور نفاق پیدا کر دیتے تھے۔

[2] توبہ/۴۳

رسول اکرمؐ اس جاسوسی کے اس خطرناک منصوبے سے آگاہ ہو گئے (کہا جاتا ہے کہ جبرائیل امینؑ نے اس واقعے کی آنحضرتؐ کو اطلاع دی تھی) آپؐ نے فوراً حضرت علیؑ، عمار، زبیر، طلحہ، مقداد اور ابو مرثد کو حکم دیا کہ وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر مکہ کی جانب روانہ ہوں اور فرمایا: راستے میں ایک ''مقام'' پر تم لوگ ایک عورت تک پہنچو گے جس کے پاس حاطب کا مشرکین مکہ کے نام ایک خط ہے جو اس سے لے لینا۔

یہ لوگ روانہ ہو گئے اور رسول اکرمؐ کی بتائی ہوئی جگہ پر انھوں نے اسے جالیا، وہ قسمیں کھانے لگی کہ اس کے پاس کوئی خط نہیں! اس کے سامان کی احتیاط کے ساتھ تلاشی لی گئی لیکن خط نہ ملا، حضرت علیؑ کے سوا سب نے واپسی کا ارادہ کیا، لیکن آپؑ نے فرمایا: نہ رسول اکرمؐ نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے اور نہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں؛ آپؑ نے تلوار کھینچ لی اور اس عورت سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''خط باہر نکالو ورنہ تمہاری گردن ماردوں گا!''

سارہ ڈر گئی اور خط کو جسے اس نے سر کے بالوں میں چھپا رکھا تھا، باہر نکال لیا، خط کو رسول اکرمؐ کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔ حضرتؐ نے وہ خط حاطب کو دکھا کر کہا: جانتے ہو یہ خط کس کا ہے؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں، آپؐ نے فرمایا: تم نے یہ کام کیوں کیا ہے؟ اس نے وہی عذر پیش کیا جو بیان ہو چکا ہے، آنحضرتؐ نے مصلحتاً اس کا عذر قبول کر لیا، لیکن جناب عمر سے نہ رہا گیا اور بول پڑے: اے رسول خدا! اجازت دیجئے کہ اس منافق (جاسوس) کی گردن ماردوں! رسول اکرمؐ نے فرمایا: یہ شخص بدری مجاہد ہے اور مجاہدین بدر کی خدا کی نظر میں ایک خاص اہمیت ہے۔ سورہ ممتحنہ کی ابتدائی آیات میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اس قسم کے کاموں کی تکرار سے سخت پرہیز کریں کیونکہ یہ کام ان کی دنیا وآخرت کی تباہی کا سبب ہے۔ [1]

اس واقعے میں دشمن کے لئے جاسوسی کی گئی تھی لیکن رسول اکرمؐ کی جاسوسی کے خلاف منصوبہ بندی (چاہے وہ جبرائیلؑ یا کسی اور ذریعے سے ہو) نے دشمن کے منصوبے کو ناکام کر دیا، اس طرح لشکر اسلام کی مکہ کی طرف روانگی کی خبر مکہ تک نہ پہنچی اور اہل مکہ لشکر اسلام کے داخلے سے مکمل طور پر غافل اور بے خبر رہے، یہی وجہ تھی کہ مشرکین کا سب سے بڑا مرکز کسی خونریزی اور جنگ کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا اور یہ ایک بے حد اہم کامیابی تھی اس کے برعکس اگر وہ جاسوس عورت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی تو شاید بہت زیادہ خونریزی ہوتی، بہر حال اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جاسوس یا جاسوسی کے خلاف قائم کئے گئے ادارے کسی قوم کی تقدیر اور سرنوشت میں کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔

حذیفہ کی سراغرسانی کا واقعہ

رسول اکرمؐ کے زمانے میں جاسوسی اور سراغرسانی کے واقعات میں سے ایک جنگ احزاب میں حذیفہ کا واقعہ ہے۔ بہت ساری تاریخوں میں ذکر ہوا ہے کہ جنگ احزاب کے دوران ایک رات جب دشمن کے لشکر کے مختلف گروہوں یعنی احزاب میں پھوٹ پڑ گئی ،رسول اکرمؐ نے فرمایا: کیا تم لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو اس تاریکی میں دشمن کے لشکر میں جائے اور کسی خبر کا سراغ لائے، جو کوئی یہ کام

[1] زیادہ تر مفسرین نے اس شان نزول کو سورۂ ممتحنہ کی ابتدائی آیات کے سلسلے میں متعدد مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

انجام دے گا جنت میں میرا ساتھی ہوگا؟! مشہور صحابی رسولؐ جناب حذیفہؓ کہتے ہیں: رسول اکرمؐ کے جواب میں کوئی بھی شخص شدید تھکاوٹ، بھوک اور خوف و وحشت کی وجہ سے نہیں اٹھا، رسول اکرمؐ کی نظر مجھ پر پڑی، آنحضرتؐ نے مجھے پکار کر فرمایا: ''جاؤ اور میرے لئے دشمن کے لشکر کی کوئی خبر لاؤ اور اس کے علاوہ کوئی عمل انجام نہ دینا یہاں تک کہ پلٹ کر یہیں آ جاؤ!'' حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں: میں قریش کے لشکر میں گیا اور صورتحال یہ تھی کہ طوفانی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے اہل لشکر کا سارا ساز و سامان اور خوراک وغیرہ برباد ہو چکے تھے۔

اچانک سردار قریش ابوسفیان کو میں نے دیکھا جو اس تاریکی میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: اے قریش! (میں تم سے مخاطب ہوں) تم میں سے ہر ایک اپنے ساتھ والے شخص کو اچھی طرح پہچان لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی غیر شخص یہاں موجود ہو! حذیفہؓ کہتے ہیں: میں نے پہل کی اور فوراً اپنے ساتھ بیٹھے (یا کھڑے) شخص سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا: میں فلاں شخص ہوں، میں نے کہا: بہت اچھا۔[1]

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا: خدا کی قسم یہ جگہ ٹھہرنے کے قابل نہیں، ہمارے اونٹ اور گھوڑے ہاتھ سے نکل گئے، بنی قریظہ کے یہودیوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا ہے اور اس ہوا اور شدید طوفان نے ہماری کوئی چیز سالم نہیں چھوڑی، اٹھو اور چل پڑو، میں چلنے کے لئے تیار ہوں، پھر وہ عجلت کے ساتھ اپنی سواری کی طرف بڑھا، میں نے سوچا ایک تیر سے اس کا کام تمام کردوں، جونہی میں نے تیر چلانا چاہا مجھے رسول اکرمؐ کا فرمان یاد آ گیا کہ ذرا سی بھی خطا کئے بغیر واپس چلے آنا اور مجھے صرف تمہاری لائی ہوئی خبر کی ضرورت ہے، میں واپس چلا آیا اور سارا ماجرا آنحضرتؐ کو کہہ سنایا۔[2]

قرآن مجید کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ سراغرسانی کا عمل گزشتہ انبیاء کے ادوار میں بھی رائج رہا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اس مقصد کے لئے پرندے بھی استعمال کئے جاتے تھے، جیسا کہ حضرت سلیمانؑ اور ہدہد کی داستان میں ذکر ہوا ہے کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے لئے دور دراز کے علاقوں کی خبریں لاتا تھا۔ اس کے بعد حضرت سلیمان- کا پیغام جو آپؑ کی حکومت کی کسی دوسرے ملک کے ساتھ تعلقات کے عنوان پر مشتمل ہوتا تھا، اس ملک میں پہنچا دیتا۔[3]

احادیث، میں سراغرسانی کی تاکید

اس مسئلہ کی جھلک احادیث اور تاریخ میں بھرپور طریقے سے نظر آتی ہے اور ان کے مطالعے سے اس حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا حکومت اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مسئلے سے غفلت نہ برتے اور دو قسم کے امور کو نہایت احتیاط کے ساتھ عملی جامہ پہنائے: دشمن کی فوج، سیاسی اور اقتصادی کاروائیوں پر نظر رکھے کیونکہ ان کا کسی نہ کسی تعلق طرح سے مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور اس کے علاوہ دشمن کی جاسوسی پر مبنی سرگرمیوں کا بھی مقابلہ کرنا چاہیے جو اپنے مخصوص انداز سے خفیہ ٹھکانوں سے آگاہ ہو کر ان کے بارے

---

[1] شرح مواہب کے حاشیہ پر موجود سیرۂ ابن ہشام میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ حذیفہ کہتے ہیں: میں نے اپنے دائیں طرف بیٹھے شخص سے پوچھا: تو کون ہے؟ تو اس نے کہا: معاویہ بن ابوسفیان ہوں۔ پھر اپنی بائیں طرف بیٹھے شخص سے پوچھا: تو کون ہے؟ تو اس نے کہا: عمرو بن عاص ہوں (اس وقت معاویہ اور عمرو بن عاص مشرکین کے لشکر میں تھے) سیرۂ ابن ہشام، ج ۳، ص ۲۴۳، طبع دار احیاء تراث العربی۔

[2] شرح مواہب، ج ۲، ص ۱۰۸ پر بھی اس کے مشابہ مطلب بیان ہوا ہے۔

[3] سورۂ نحل آیت ۲۰ سے ۲۶ تک (مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ، ج ۱۵، ص ۴۳۹ کا مطالعہ فرمائیں)۔

میں قیمتی اور مخفی اسرار کو چرالے جاتے ہیں۔اس ضمن میں روایات اور تاریخی واقعات کے کچھ نمونے یہاں بیان کئے جاتے ہیں:

۱۔امام علی بن موسیٰ الرضاؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

" کَانَ رَسُولُ اللّٰہِ(ص) اِذا بَعَثَ جَیْشاً فَاتَّھَمَ اَمیراً، بَعَثَ مَعَھُمْ مِنْ ثُقاتِہِ مَنْ یَتَجَسَّسُ خَبَرَہُ"

''رسول خداؐ جب کسی لشکر کو کسی سپہ سالار کی زیر قیادت بھیجتے جو کسی وجہ سے ممکن تھا کسی تہمت کا نشانہ بن جائے آپؐ اس کے ساتھ ہی کسی قابل اعتماد شخص کو بھیجتے تا کہ وہ اس (سپہ سالار) کی کاروائیوں سے آگاہ کرتا رہے۔''[۱]

ممکن ہے کہ وہ امیر کئی لحاظ سے قابل اعتماد ہو لیکن موقعے کی نزاکت کے باعث ضروری ہوتا تھا کہ کوئی ایسا شخص بھی ہو جو اس کی کارکردگی پر نظر رکھ سکے کہ خدانخواستہ وہ کسی ایسے انحراف کا شکار نہ ہو جائے، جس کی تلافی مسلمانوں کے لئے ممکن نہ ہو۔مذکورہ حدیث وسائل اور قرب الاسناد (طبع جدید)[۲] کے موافق ہے، لیکن بعض کتب میں ''فاتّھم'' کی بجائے ''فَاَمَّھُمْ'' ذکر کیا گیا ہے جس کا مطلب لشکر کا میر قرار دینا ہے لیکن اس کے ہمراہ سراغرساں اور جاسوس کو معین کرنا''فاتّھم'' کے ساتھ زیادہ مناسب ہے اور ایسے شخص کا انتخاب ممکن ہے بعض خصوصیات کے لحاظ سے ہو جو کسی اور میں نہ پائی جاتی ہوں۔(غور فرمائیں)

۲۔''سَریّہ'' عبداللہ بن جحش (سریہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں رسول اکرمؐ نے بذاب خود شرکت نہ فرمائی ہو) کے بارے میں رسول اکرمؐ نے ''عبداللہ'' کو مہاجرین کی ایک جماعت (لشکر) کے ساتھ روانہ فرمایا، آپؐ نے ایک خط لکھ کر اسے دیا اور فرمایا: جب تک دو دن کی مسافت طے نہ کرلو خط کو نہ کھولنا، اس کے بعد خط کھول کر اس کے مضمون کے مطابق عمل کرنا'' عبداللہ نے ایسے ہی کیا۔دو دن بعد جب اس نے خط کھولا تو دیکھا کہ اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم میرا خط پڑھو تو اپنا سفر جاری رکھو یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے درمیان واقع نخلستان میں پہنچ جاؤ اور وہاں دشمن کی گھات میں بیٹھ جاؤ اور ان کے بارے میں خبریں حاصل کر کے انھیں میرے پاس بھیجو (یہ ایک طویل واقعہ ہے اور اس کے ذیل میں ذکر ہوا ہے کہ اس جگہ عبداللہ اور قریش کے لشکر کے درمیان جھڑپ ہوئی، قریش کو شکست ہوئی اور بڑی مقدار میں مال غنیمت اور دو قیدیوں کے ہمراہ عبداللہ کا لشکر رسول اکرمؐ کی خدمت میں واپس آیا)۔[۳]

ماجرا کے اس حصے کو بیان کرنے کا مقصد رسول اکرمؐ کے اصحاب کی جاسوسی پر مبنی کارگردگی کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

۳۔جنگ بدر کے واقعے کے بعد جب ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے مکہ واپس جانا چاہا، ابوسفیان نے چیخ کر کہا: آئندہ سال اسی سرزمین بدر پر ہماری اور تمہاری پھر ملاقات ہوگی۔رسول اکرمؐ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا کہ وہ جواب میں کہے: ہاں! ایسا ہی

---

[۱] وسائل الشیعہ، ج۱۱،ص ۴۴۔

[۲] طبع مؤسسہ آل بیتؑ۔

[۳] سیرۂ ابن ہشام، ج۲،ص ۲۵۲ اور کامل ابن اثیر، ج۲،ص ۱۱۳۔

ہے ہماری آئندہ ملاقات کی جگہ یہی ہے! اس کے بعد آپؐ نے اس جگہ سے کوچ کیا؛ رسول اکرمؐ نے علیؑ سے فرمایا: ان (مشرکین) کا تعاقب کرو اور دیکھو کہ وہ کیا کر رہے اور کہاں جانا چاہتے ہیں اگر وہ گھوڑوں کی بجائے اونٹوں پر سوار ہیں تو مکہ کا قصد رکھتے ہیں اور اگر گھوڑوں پر سوار ہیں اور اونٹوں کو ہمراہ لے جا رہے ہیں تو ان کا قصد مدینے کا ہے، خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر ان کا ارادہ مدینے پر حملہ کرنا ہوا تو میں ان کے خلاف ضرور جنگ کروں گا! حضرت علیؑ نے خفیہ انداز میں ان کا تعاقب کیا اور دیکھا کہ وہ گھوڑوں کو چھوڑ کر اونٹوں پر سوار مکہ کی سمت گامزن ہیں۔[1]

حضور اکرمؐ طرف سے جاسوسی کا یہ عمل جو حضرت علیؑ کے توسط سے انجام دیا گیا، ایک بے حد نازک عمل تھا جو مسلمانوں کی سرنوشت اور تقدیر پر بہت اثر انداز ہوا کیونکہ اس کی وجہ سے مسلمان غفلت کا شکار ہونے سے بچ گئے۔

۴۔ جنگ احد میں بھی رسول اکرمؐ نے لشکر قریش کے آنے سے پہلے دو جاسوس بھیجے کہ وہ قریش کے لشکر کی تعداد اور کیفیت کے بارے میں راستے ہی میں آگاہ ہو کر اس کی خبر دیں، اسی طرح جب وہ میدان احد میں داخل ہو کر جاگزین ہو گئے تو آپؐ نے ''حباب بن منذرؓ'' کو خفیہ طور پر ان کے سراغ میں بھیجا اور حکم دیا کہ وہ لشکر قریش میں داخل ہو کر اہل لشکر کی تعداد کا اندازہ لگائیں اور ان کی کیفیت کے بارے میں خبر لائیں اور یہ بھی فرمایا کہ جب تم کوئی میرے لئے خبر لاؤ تو سب لوگوں کے سامنے اسے بیان نہ کرنا! لیکن اگر ان کی تعداد کم ہو تو علانیہ طور پر بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (لیکن چونکہ ان کی تعداد زیادہ تھی) انھوں نے خفیہ انداز میں یہ خبر رسول اکرمؐ کے گوش گذار کی۔[2]

اس حدیث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے جاسوسی پر مامور افراد دشمن کی روانگی سے لے کر میدان جنگ میں داخل ہونے تک ان کے لشکر پر کڑی نظر رکھتے تھے۔

۵۔ نہج البلاغہ کے خطوط سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کے جاسوسی ادارے پوری اسلامی مملکت کے مسائل کی نگرانی کرتے تھے، مالک اشتر کے نام حضرت علیؑ کے فرمان میں خفیہ افراد کی سرکاری عہدیداروں کی نگرانی کی کیفیت کے بارے میں یوں نقل ہوا ہے:

وَابْعَثِ الْعُيُونَ مِنْ اَهْلِ الصِّدْقِ وَالْوَفاءِ عَلَيْهِمْ فَاِنَّ تَعاهُدَكَ فِي السِّرِّ لِاُمُورِهِمْ حَدْوَةٌ لَهُمْ عَلَى الاِسْتِعْمالِ الاَمَانَةِ وَالرِّفْقِ بِالرَّعِيَّةِ:

''راست گو اور باوفا افراد کو حکومتی عہدیداروں کے حال کی تحقیق کے لئے منتخب کرو اور ان کے اعمال کو زیر نظر رکھو، اس لئے کہ دائمی طور پر خفیہ تحقیق اس بات کا سبب بنتی ہے کہ وہ ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام

[1] سیرۂ ابن ہشام، ج۳، ص۱۰۰۔

[2] مغازی واقدی، ج۲، ص۲۰۶ اور ۲۰۷۔

دیں اور اپنے ماتحت لوگوں کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا برتاؤ کریں!'

البتہ جاسوسی پر مامور افراد کی کارروائی کی یہ وہ قسم ہے جسے وہ حکومت کے اندر اور حکومتی عہدیداروں کے بارے میں انجام دیتے ہیں۔

۶۔حضرت علیؑ مکہ کے گورنر ''قثم بن عباس'' عبداللہ بن عباس کے بھائی کے نام ایک خط میں یہ تحریر فرماتے ہیں: "اَمّا بَعۡدُ فَاِنَّ عَيۡنِى بِالۡمَغۡرِبِ[1] كَتَبَ اِلَىَّ يُعۡلِمُنى اَنَّهُ وَجّهَ اِلَى الۡمَوۡسِمِ اُناس مِنۡ اَهۡلِ الشّامِ اَلۡعُمۡىُّ الۡقُلُوبِ الصُّمِّ الاَسۡماعِ الكُمۡهِ الاَبۡصارِ اَلَّذينَ يَلۡبِسُونَ الحَقَّ بِالباطِلِ وَيُطيعُونَ المَخۡلُوقَ فى مَعۡصيَتِهِ الخالِقِ... فَلۡقُمۡ عَلى ما فى يَدَيۡكَ قيامَ الحازِمِ الصَّليبِ" یعنی: ''مغرب (شام) میں موجود میرے خفیہ مامور نے اطلاع دی ہے کہ (معاویہ کی طرف سے) لوگوں کا ایک گروہ حج کے لئے بھیجا گیا ہے، یہ گروہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جو بے بصیرت، اندھے، بہرے اور حق کو باطل کے ساتھ ملانے والے ہیں اور خدا کی نافرمانی اور مخلوق کی اطاعت کرتے ہیں......اس مطلب کے پیش نظر اپنی ذمہ داری کا احساس کرو اور اسے اس طرح پورا کرو جس طرح ایک مضبوط اور دوراندیش انسان پورا کرتا ہے۔''[2]

ایسے نظر آتا ہے کہ معاویہ کی طرف سے امامؑ کے خلاف قثم بن عباس کو خیانت (غداری) کی دعوت دی گئی اور حجاج کے امور کو بے سروسامانی سے دوچار کرنے کی سازش تیار کی گئی جس کی اطلاع معاویہ کی حکومت میں موجود امامؑ کے خفیہ مامور نے سرعت کے ساتھ آپؑ تک پہنچا دیا تھا اور آپؑ نے بھی اس سازش کو ناکارہ بنانے کے لئے فوری اقدام فرمایا۔ اس مقام پر ان خفیہ مامورین (جاسوسوں) کا ذکر کیا ہے جو دشمن کے لشکر کے اندر داخل ہو کر مخفیانہ طور پر اطلاعات حاصل کر کے اس کی خبر دیتے تھے!

۷۔عثمان بن حنیف کو لکھے گئے خط میں جناب امیر المؤمنین۔تحریر فرماتے ہیں:

"اَمّا بَعۡدُ يابۡنَ حُنَيۡفٍ فَقَدۡ بَلَغَنى اَنَّ رَجُلاً مِنۡ فِتۡيَةِ اَهۡلِ الۡبَصۡرِةِ دَعاكَ اِلى مَأۡدُبَةٍ فَاَسۡرَعۡتَ اِلَيۡها تُسۡتَطابُ لَكَ الاَلۡوانُ وَ تُنۡقَلُ اِلَيۡكَ الجِفانُ"

''اے حنیف کے بیٹے! مجھے خبر دی گئی ہے کہ بصرہ کے ایک صاحب ثروت شخص نے تمہیں کھانے کی دعوت دی تو تم نے اس کی طرف جانے میں جلدی کی، جبکہ صورتحال یہ تھی کہ رنگ برنگ کے کھانے بڑے بڑے ظروف میں یکے بعد دیگرے تمہارے سامنے پیش کیئے جارہے تھے......''[3]

اس خط سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ خفیہ مامورین کے ذریعے نہ صرف سیاسی اور عسکری بلکہ ان اخلاقی مسائل کی خبریں بھی حاصل کی جاتی تھیں جو اسلامی تعلیمات خاص طور پر زاہدانہ اصول کے خلاف تھے اور مسائل کی جزئیات بھی خفیہ مامورین کی باریک بین نظروں سے

---

[1] شام اور اس کا پایۂ تخت دمشق، کوفہ، جو حضرت علی -کا مرکز حکومت تھا، کے مغرب میں واقع ہے۔

[2] نہج البلاغہ، مکتوب ۳۳۔

[3] نہج البلاغہ، مکتوب ۴۵۔

اوجھل نہیں رہتی تھیں۔ اسی سے ملتا جلتا مطلب امامؑ کے استخر کے گورنر منذر بن جارود کے نام آپؑ کے ایک خط میں نظر آتا ہے، اس خط میں امام علیؑ یہ تحریر فرماتے ہیں: ''تمہارے باپ کی لیاقت اور صلاحیت تمہاری نسبت میرے اچھے گمان کا سبب بنی، میرا خیال تھا کہ تم بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلو گے اور اسی کی طرح تمہاری روش بھی ہوگی!

"فَإِذا اَنْتَ فيما رُقِّيَ اِلَيَّ عَنْكَ لا تَدَع لِهَواكَ اِنْقِياداً وَلا تُبْقي لآخِرَتِكَ عَتاداً. تَعْمُرُ دُنياكَ بِخَرابِ آخِرَتِكَ وَ تَصِلُ عَشيرَتَكَ بِقَطيعةِ دينِكَ"

''(لیکن) مجھے اچانک خبر دی گئی ہے کہ تم خواہش نفس کی پیروی میں بھول چوک کا شکار ہو جاتے ہو اور آخرت کے زادراہ کے طور پر کسی چیز کو باقی نہیں رکھتے! اپنی آخرت کی ویرانی کے باعث اپنی دنیا کو بھی برباد کر رہے ہو اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تعلق کو دین سے قطع تعلق کی قیمت کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہو!''[1]

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے لئے چار لاکھ درہم بیت المال سے ہتھیا لئے تھے! امامؑ نے اسے اس کے عہدے سے معزول کر دیا اور ایک مدت تک زندان میں قید رکھا۔[2]

یہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ خبر رسانی پر مامور افراد نے ایک گورنر کی خیانت کا انکشاف کر کے اس کی خبر امامؑ تک پہنچائی اور امامؑ نے بھی اس کے مقابلے میں شدید ردعمل ظاہر کیا۔

۸۔ امام حسن مجتبیٰ -کی سیرت میں ہے کہ اپنے والد گرامی حضرت علیؑ کی شہادت اور لوگوں کی طرف سے آپؑ کی بیعت انجام پا جانے کے بعد معاویہ نے دو جاسوس بھیجے: ایک بصرہ اور دوسرا کوفہ میں تاکہ وہ ان دونوں شہروں کے بارے میں خبریں اس کی طرف بھیجیں اور امام حسن -کی خلافت کو ختم کرنے کے لئے منافقین سے استفادہ کریں اور اس ضمن میں کسی بھی کوشش سے مضائقہ نہ کریں، لیکن امام حسن -کے وہ افراد جو جاسوسی کے خلاف اقدام پر مامور تھے، انھوں نے اس مسئلے کا سراغ لگا لیا، کوفہ آنے والے جاسوس کو گرفتار کر لیا گیا اور ایک خط دوسرے جاسوس کی تمام ذاتی صفات کی ساری تفصیل کے ساتھ بصرہ بھیجا، اس طرح دوسرے جاسوس کو بھی گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد آپؑ نے معاویہ کے نام ایک خط تحریر فرمایا جس میں یہ ذکر تھا: تو جاسوس بھیج کر اور فتنہ انگیزی برپا کر کے گویا جنگ کا خواہاں ہے اگر ایسا ہی ہے تو میں بھی تیار ہوں۔[3]

۹۔ جنگ صفین کے بعد قبیلہ ''بنی ناجیہ'' کے کچھ لوگوں نے ''فریث بن راشد'' کی سرکردگی میں امام علیؑ کی مخالفت کا اعلان کر دیا،

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۷۱۔

[2] سفینۃ البحار، مادۂ ''نذر''۔

[3] بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۴۵، حدیث ۵۔

امامؑ نے اس سے فرمایا: میرے پاس آؤ تاکہ میں تمہیں کچھ مسائل کی طرف متوجہ کروں، وہ آپؑ کی خدمت میں نہ آیا اور اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے بھاگ گیا۔ ان لوگوں کو راستے میں امامؑ کا ایک وفادار ساتھی ملا جسے انھوں نے شہید کر دیا جبکہ انھیں لوگوں نے ایک یہودی کو ذمی ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا، امامؑ نے تمام علاقوں پر معین اپنے گورنروں کے نام خط لکھے جن کا مضمون یہ تھا: ''کچھ لوگ جنھوں نے گناہ عظیم کا ارتکاب کیا ہے، بھاگ نکلے ہیں اور میرے خیال میں وہ بصرہ کی طرف گئے ہیں، ان کی جستجو میں رہو اور اپنے علاقوں میں جاسوس پھیلا دو اور ان کے بارے میں جو خبر ملے اس سے مجھے مطلع کرو۔'' (وَاجْعَلْ عَلَيْهِمُ الْعُيُونَ فِي كُلِّ نَاحِيَةٍ مِنْ أَرْضِكَ ثُمَّ اكْتُبْ إِلَيَّ بِمَا يَنْتَهِي إِلَيْكَ عَنْهُمْ)۔ [1]

مذکورہ بالا روایات اور دوسری روایات اور تاریخی واقعات سے جن سب کو ذکر کرنے سے بات بہت طویل ہو جانے کا خوف ہے، بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کے دور میں جاسوسی اور اطلاعاتی نظام بہت فعال تھا، دشمنوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے میں بھی اور دشمن کی جاسوسی کو ناکام بنانے اور سرکاری عہدیداروں کی کارکردگی کی محتاط انداز میں تحقیق کرنے اور ان پر کڑی نظر رکھنے میں بھی نیز اسلامی حکومت کے اندر موجود منافقین کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سراغ لگانے میں بھی یہ نظام بہت مؤثر تھا۔

البتہ ہمارے زمانے میں دوسرے معاملات کی طرح جاسوسی اور جاسوسی کے خلاف کارروائی کے مسائل مکمل طور پر تبدیل، پیچیدہ اور وسیع ہو چکے ہیں اور ترقی یافتہ اور جدید ٹیکنالوجی کے باعث یہ کام بہت زیادہ پھیل چکا ہے۔ بلاشبہ حکومت اسلامی کے لئے جاسوسی اور جاسوسی کے خلاف اقدام کرنے کے لئے زمانہ گزشتہ کے سادہ طریقوں پر عمل کرنا اور انہی پر قناعت کر لینا ممکن نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ نظام جاسوسی کے لئے تمام ضروری اور جدید ترقی یافتہ وسائل سے مستفید ہو تاکہ دشمنوں کی کوئی سازشی کارروائی مخفی نہ رہے اس کے علاوہ سرکاری عہدیداروں کی سرگرمیاں اور مختلف پارٹیوں اور جماعتوں کی کاروائیاں، نظم وضبط اور امن وامان برقرار رکھنے اور مفاسد کا قلع وقمع کرنے کے لئے بھی خبر رسانی کے جدید طریقوں سے استفادہ ضروری ہے۔ پس اسلامی حکومت کے لئے اس سلسلے میں جدید ترین آلات و وسائل کو استعمال کرنا ضروری ہے اور فقط زمانہ سابقہ کے قدیم وسائل پر قناعت کر کے انھیں کو کافی نہیں سمجھنا چاہیے۔

درست ہے کہ اس مقصد کے لئے بے پناہ پیسے کی ضرورت ہے لیکن اس بات کے پیش نظر کہ بعض اوقات اس راہ میں کی گئی کم سرمایہ کاری عسکری، سیاسی اور اقتصادی میدانوں میں کی گئی بڑی سرمایہ کاری سے بھی اہم اور بڑے نقصانات سے بچاؤ کا سبب بن جاتی ہے، اس راستے میں ہونے والی ہر سرمایہ کاری کفایت شعاری اور اعتدال پر مبنی ہونی چاہیے۔ مثلاً اگر ادارۂ جاسوسی دشمن کے کسی جگہ رکھے ہوئے بم کا وقت پر انکشاف کر کے اسے بیکار کر دے تو اس کے اس عمل سے بہت ساری انسانی جانوں اور اقتصادی نقصان کی روک تھام ہو سکتی ہے اور اس سے بھی اہم یہ کہ دشمن کی ناپاک فوجی سازش کو بے نقاب کر کے وسیع اور بہت زیادہ نقصانات سے بچا جا سکتا ہے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۳، ص ۱۳۰۔

چھپ کر گفتگو سننا

بلاشبہ لوگوں کی ٹیلفون پر کی گئی گفتگو کوسننا اور اس کی باتوں کے بارے میں جستجو کرنا تا کہ ان کے اسرار سے آگاہی حاصل کی جائے، تجسس حرام کی ایک واضح مثال ہے اور سورۂ حجرات کی آیہ شریفہ اور روایات کی رو سے ناجائز ہے۔ رسول اکرمؐ نے ایک حدیث میں فرمایا:

"لاتَتَّبِعُوا عَثَراتِ الْمُسْلِمِينَ، فَاِنَّهُ مَنْ تَتَّبَعَ عَثَراتِ الْمُسْلِمِينَ تَتَّبَعَ اللهُ عَثْرَتَهُ وَ مَنْ تَتَّبَعِ اللهُ عَثْرَتَهُ يَفْضَحُهُ"

''مسلمانوں کی لغزشوں کی جستجو نہ کرو چونکہ جو مسلمانوں کی لغزشوں کی جستجو کرتا ہے اور خدا اس کی لغزشوں کی جستجو کرتا ہے خدا تعالیٰ مسلمانوں کی لغزشوں کی جستجو کرنے والوں کو رسوا اور ذلیل کرتا ہے!''

دلچسپ یہ ہے کہ حدیث کے شروع میں مخاطب لوگوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

يَامَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسانِهِ وَلَمْ يُسْلِمْ بِقَلْبِهِ:

''اے وہ لوگو جو زبان سے تو ایمان لا چکے لیکن دل سے اسلام قبول نہیں کیا۔''[1]

اصول کافی باب ''من طلب عثرات المسلمین وعوراتھم'' کہ مذکورہ بالا حدیث اسی باب سے اخذ کی گی ہے، اس باب میں ہلا کر رکھ دینے والی بہت سی احادیث ہیں ٹوہ لگانے اور جاسوسی کرنے (چھپ کر باتیں سننے) کا حرام ہونا مسلمانوں میں بالکل واضح تھا، چنانچہ جب زمانۂ عمر میں حضرت عمر ایک رات مدینے کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے تو اچانک ایک گھر سے ایک مرد کے گانے کی آواز سنائی دی، حضرت عمر دیوار پھلانگ کر اندر تشریف لے گئے اور بلند آواز سے پکار کر کہا: اے دشمن خدا تو نے یہاں خدا کی نافرمانی کی بساط سجا رکھی ہے! کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ خدا تمہاری پردہ پوشی کرے گا؟! اس شخص نے کہا: جناب خلیفہ جلدی نہ کریں! میں نے اگر ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ انجام دیئے ہیں! کیونکہ خدا فرماتا ہے: ''لاتَجَسَّسُوا'' (تجسس نہ کرو) اور آپ نے تجسس کیا ہے! خدا فرماتا ہے: ''وَاْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوابِها'' گھروں میں ہمیشہ دروازوں سے داخل ہو، اور آپ بلا اجازت دیوار پھلانگ کر اندر آئے ہیں! خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"لا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتّى تَسْتَانِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلى اَهْلِها"

اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے گھروں میں مت داخل ہو یہاں تک کہ اہل خانہ سے اجازت لو اور انھیں سلام کرو! (اور آپ نے ان میں سے کوئی عمل انجام نہیں دیا)۔ (حضرت عمر شرمندہ ہو گئے) اور کہا اگر میں تمہیں معاف کر دوں تو کیا اس کام سے دستبردار ہو جاؤ گے؟

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵۵، حدیث ۴۔

اس نے کہا: ہاں، حضرت عمر نے اسے معاف کر دیا اور باہر نکل گئے![1]

بہرحال اس میں شک نہیں کہ چھپ کر لوگوں کی باتیں سننا یعنی ان کی باہمی گفتگو ریکارڈ اور اسے کنٹرول کرنا، چاہے وہ زبانی اور آمنے سامنے کی باتیں ہوں یا ٹیلیفون کے ذریعے یا ان کے پرائیویٹ خطوط ہوں، سب تجسس کے زمرے میں آتے ہیں، جو کہ حرام ہے۔ لیکن بعض اوقات حکومت اسلامی بعض صورتوں میں اس عمل (تجسس) کے ارتکاب پر مجبور ہو جاتی ہے اور یہ صورتحال اس وقت پیش آتی ہے جب اسلام اور مسلمین کے خلاف دشمن کی کسی سازش کا خوف ہو جو انسانوں اور ان کے اموال کے لیے خطرے کا باعث بن رہی ہو تو، اس قسم کے حالات میں تفتیش وتجسس پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح جس طرح منشیات وغیرہ کے سراغ لگانے کے لیے شہروں کے بیرونی راستوں پر لوگوں اور اُن کے سامان وغیرہ کی تلاشی لی جاتی ہے!

درحقیقت اس مسئلے کا تعلق تزاحم واجبات یا واجب وحرام کے تزاحم (ٹکراؤ) کے ساتھ ہے اور ضروری ہے کہ اس مسئلے میں اہم اور غیر اہم اور دیگر ترجیح بخش عوامل کا خیال رکھا جائے اور ان کے مطابق طرز عمل اختیار کیا جائے۔ بہرحال: مسلمانوں کے امور میں تجسس حرام ہے، لیکن ان کے انسانی جانوں اور معاشرۂ اسلامی کی حفاظت اور دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنانا کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس لحاظ سے جہاں کہیں ان چیزوں کا خطرہ ہو ان کی روک تھام کے لئے تجسس وغیرہ جائز ہوتا ہے۔

تفتیش اور جسمانی سزائیں

بلاشبہ کسی کو بلاوجہ اذیت میں مبتلا کرنا جائز نہیں اور اس سے پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ کسی کو اعتراف پر آمادہ کرنے کے لئے اس پر تشدد کرنا جائز نہیں اور ہر وہ اقرار واعتراف جو مار پیٹ کے ذریعے حاصل کیا جائے اس کی کوئی حیثیت نہیں، ایسا اعتراف کسی شرعی اور قانونی قدر وقیمت کا حامل نہیں ہوتا۔ حضرت امام علیؑ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے:

"مَنْ اَقَرَّ عِنْدَ تَجْرِيدٍ اَوْ تَخْوِيفٍ اَوْ حَبْسٍ اَوْ تَهْدِيدٍ فَلَا حَدَّ عَلَيْهِ"

"وہ شخص جو برہنہ کرنے، خوفزدہ ہونے یا قید اور دھمکی کے باعث کسی جرم کا اعتراف کرے، اس پر کوئی حد جاری نہیں ہوگی!"[2]

لیکن اگر ملزم پر جو الزام ہے اگر وہ ثابت نہیں ہو سکا، لیکن وہ کسی ایسے واضح گناہ کا مرتکب ہو چکا ہو تو اس واضح جرم کی خاطر اُسے "تعزیر" کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی چور کو کسی کے گھر میں داخل ہوتے وقت گرفتار کر لیا جائے، جبکہ اس کی چوری ثابت نہ ہوئی ہو، اس صورتحال میں اگر اسے اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں داخل ہونے کی وجہ سے "تعزیر" کی جائے اور اس خیال سے اعتراف کر لے کہ اعتراف نہ کرنے کی صورت میں اسے تشدد کا سامنا کرنا پڑے گا اور قرائن سے بھی اس کے اعتراف کی سچائی ثابت ہوتی ہو (جیسے اس مال

---

[1] کنزالعمال، ج۳ص۸۰۸، حدیث ۸۸۲۷۔

[2] وسائل، ج۱۸، حدیث ۲، باب ۷، از ابواب حد السرقۃ۔

مسروقہ کو برآمد کرلیا جائے جس کی علامات اس نے بتائی ہیں) یہ اعتراف قابل اہمیت اور قدر و قیمت کا حامل ہوسکتا ہے کیونکہ واضح اور قطعی قرائن وشواہد اس کے اعتراف کو واقعیت کے مطابق ثابت کرتے ہیں۔

غیر ملکی جاسوسوں کے بارے میں بھی یہی طریقہ اپنایا جاسکتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی قطعی اور یقینی جرم صادر نہ بھی ہوا ہو، لیکن شرعی حاکم کو یقین یا قوی گمان ہو کہ اس کے پاس ایسی اہم اطلاعات ہیں جو مسلمانوں اور مملکت اسلامی کے امور کے سلسلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، تو ایسی صورتحال میں اس پر سختی کی جاسکتی ہے، لیکن ایسی سختی جو اخلاق انسانی کے خلاف نہ ہو۔

اس سے پہلے ''حاطب بن ابی بلتعہ'' کے واقعے میں بیان کیا جاچکا ہے کہ جب ''سارہ'' نامی جاسوس عورت مشرکین مکہ کے نام خط کو حضرت علیؑ کے حوالے کرنے پر بالکل آمادہ نہ ہوئی تو آپؑ نے اس پر تلوار کھینچ لی اور فرمایا کہ اگر خط نہیں دوگی تو قتل کردی جاؤ گی، اس نے خوف کے مارے خط کو اپنے بالوں میں سے نکالا اور آپؑ کے حوالے کردیا۔ یہ اعتراف روحی سختی کے نتیجے میں کیا گیا اور واقعیت کے عین مطابق تھا۔

معلوم ہے کہ اس قسم کی شدت وسختی ایسے حالات میں عقل وشرع کے خلاف نہیں، چونکہ اس مسئلے کی اہمیت اس حد تک ہے جو اتنی مقدار میں سختی کو جائز قرار دیتی ہے، اگر رسول اکرمؐ کی فتح مکہ کی خبر مشرکین تک پہنچ جاتی تو بے پناہ خونریزی کے بعد جنگ کا نتیجہ حاصل کیا جاتا۔

حضرت علیؑ کے فیصلوں میں بھی کئی واقعات ملتے ہیں جن میں اہم مسائل درپیش ہوتے تھے، اگر مجرم لوگ اعتراف پر آمادہ نہ ہوتے تو حضرتؑ بیان کردہ طریقے کے مطابق مطلب کا انکشاف کرا لیتے مثال کے طور پر ان دو ایسے افراد کا باہمی جھگڑا جس میں ہر ایک کا دعویٰ یہ تھا کہ میں آقا ہوں اور دوسرا میرا غلام ہے، امامؑ نے فرمایا: دیوار میں دو سوراخ کئے جائیں اور پھر وہ دونوں اپنے سر ان میں داخل کریں، پھر آپؑ نے فرمایا: اے قنبر! رسول اکرمؐ کی تلوار لاؤ اور غلام کا سر تن سے جدا کردو! وہ شخص جو واقعی غلام تھا اس نے وحشت کے مارے اپنا سر سوراخ سے باہر نکال لیا، علیؑ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: کیا تو نے نہیں کہا تھا کہ تم غلام نہیں بلکہ آقا ہو! اسے اعتراف حقیقت کے بغیر کوئی چارہ نظر نہ آیا۔[1]

بلاشبہ یہ سختی غلام کی ناراضگی کا باعث بنی، لیکن حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے اس قدر دباؤ ڈالنا جائز ہے، خبر رسانی (وجاسوسی) کے مسائل میں بھی ایسا ہی ہے، بلکہ اس سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ دوسرے الفاظ میں اہم اور اہم تر واجبات ومحرمات کا باہمی تضاد اور ٹکراؤ اس قسم کی شدت اور سختی کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن اس جواز (اجازت) کی آڑ میں اس قانون سے غلط فائدہ اٹھا کر ملزم کو ہرگز تشدد اور روح فرسا اذیتوں کا نشانہ نہیں بنانا چاہئے اسی طرح ذرا سی بدگمانی کی بنیاد پر اس استثنائی حکم کو اپنے لئے مباح قرار دینے سے گریز کیا جائے۔

---

[1] وسائل، ج ۱۸، باب ۲۱، از ابواب کیفیت الحکم، حدیث ۴، ص ۲۰۸۔

اس بات کوفراموش نہیں کرنا چاہیے کہ سختی اور شدت کا استعمال ایک استثنائی حکم ہے اور ضرورت کے وقت اور انسانی حقوق کا پاس کرتے ہوئے، سزا کی مقدار اور کیفیت کو پیش نظر رکھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ یہیں سے ایک اور نکتہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ خبر رسانی پر مامور افراد بعض اوقات ایک اہم اور حساس خبر کو حاصل کرنے کے لئے دشمن کا بھیس بدلنے پر مجبور ہوجاتے ہیں تاکہ اس طرح وہ دشمنوں کے ساتھ آسانی سے گھل مل سکیں، اس قسم کے حالات میں بعض اوقات وہ کئی ایک گناہوں کے مرتکب بھی ہوتے ہیں، مثلاً حرام غذا کھانے اور ظاہراً اسلام اور مقدسات اسلام کے خلاف باتیں کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں تاکہ اس طرح کسی خبر یا کئی ایک خبروں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ یہ مسئلہ بھی واجب اور حرام کے باہمی تزاحم (ٹکراؤ) اور ''اہم وغیر اہم'' کے زمرے میں داخل ہے کیونکہ جب کبھی مقصد اور ہدف ارتکاب شدہ گناہ کی نسبت اہم اور اس سے بالاتر ہو تو اس مقصد کی خاطر ایسا گناہ جائز شمار ہوتا ہے۔

سوال: کیا مقصد وسیلے کو جائز قرار دیتا ہے؟

ممکن ہے کہا جائے: کیا یہ کلام مادی والحادی گروہ کے راہنماؤں کے اس بیان کے ساتھ ہم آہنگ اور متناسب نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ: اَلْغایاتُ تُبَرِّرُ الْوَسائط: مقصد و ہدف وسائل و ذرائع کو، جائز قرار دیتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں فقط ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ وہ (مادہ پرست) لوگ جو اس خود ساختہ قانون کا ورد کرتے اور دم بھرتے ہیں، اس کے لئے کسی قید و شرط کے قائل نہیں یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ ہدف و مقصد خواہ جائز ہو یا ناجائز، اس تک رسائی کے لئے ہر جائز و ناجائز ذریعے اور وسیلے سے فائدہ اٹھانا چاہئے، اس دلیل کی بناء پر اپنے اقتصادی مفادات کی خاطر وہ لوگ خونی جنگیں برپا کرتے ہیں جن میں ہزاروں بے گناہ افراد لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور ان کا مقصد ان سے فقط یہ ہوتا ہے کہ ان کے ناجائز مفادات وفوائد کو ذرا سا نقصان بھی نہ پہنچے۔

لیکن انہی مکتب کے پیروکار اس سلسلے میں اس کے دونوں پہلوؤں کا انکار کرتے ہیں یعنی نہ ہر ہدف کو کافی اور جائز سمجھتے ہیں نہ ہر وسیلے اور ذریعے کو مجاز قرار دیتے ہیں بلکہ نہایت محتاط انداز میں اسے اہم وغیر اہم قانون کے تحت قرار دیتے ہیں، اہمیت بھی ایسی جو عقل وشرع کے مطابق ہو نہ وہ اہمیت جو ذاتی مفاد اور شیطانی خواہشات کے موافق ہو۔ ''اہم ومہم'' یا ''اہم وغیر اہم'' کے قانون کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص نشہ آور چیز استعمال کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں سوجاتا ہے، یہ سونا اس کی موت کا سبب بھی بن سکتا ہے لہٰذا اگر اس کے چہرے پر چانٹے مار کر اسے بیدار کیا جائے تو اس کا بھلا اسی میں ہے نہ کہ نیند میں، اس سے بڑھ کر یہ کہ کسی خطرناک دشمن کے چنگل سے ملک کو نجات دینے کی خاطر ممکن ہے جنگی اخراجات کا کچھ حصہ لوگوں سے زبردستی وصول کیا جائے، یا کسی خطرناک بیماری سے بچاؤ کی غرض سے لوگوں کو ان کے گھروں تک محدود رہنے پر پابند کیا جائے تاکہ سب کو بیماری سے بچاؤ کے حفاظتی ٹیکے لگائے جاسکیں۔

مکتب انبیاء کے پیروؤں کی روش ایسی ہی ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے جبکہ الحادی اور مادی مکتب کے پیروکار اس سلسلے میں کسی شرط وقید کے قائل نہیں اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقے کا استعمال جائز سمجھتے ہیں۔

حکومت اور ولایت سے متعلق پیام قرآن کی جلد دہم یہاں اختتام پذیر ہوتی ہے اور اس طرح قرآنی نقطۂ نظر سے عقائد و

معارف اسلامی پر مشتمل تفسیر موضوعی کا ایک مکمل کورس تکمیل پذیر ہوتا ہے، خدا تعالیٰ نے جو توفیق اپنے کمزور بندوں کے شامل حال فرمائی ہے اس پر ہم اس ذات کا شکر ادا کرتے ہیں۔

خداوندا! اس ناچیز خدمت کو ہماری طرف سے قبول فرما اور اسے روز آخرت کا ذخیرہ قرار دے اور قرآنی نقطۂ نظر سے معارف وعقائد اسلام سے آگاہی کے متمنی حضرات کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرما۔

☆☆☆☆☆